دبستانِ بجنور
دوم
ڈاکٹر شیخ نگینوی
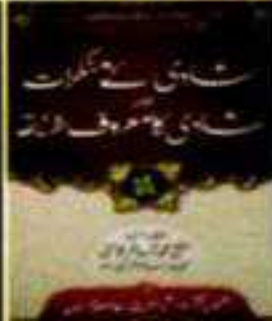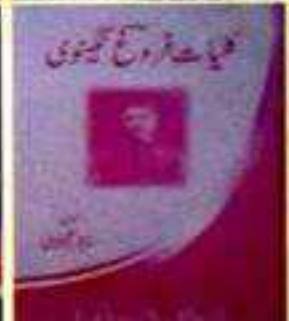
اپنی مٹی پہ اگر ناز نہیں کر سکتے
زندگی ہم ترا آغاز نہیں کر سکتے

علینا عترت

دبستانِ بجنور

(جلد دوم)

مؤلف
ڈاکٹر شیخ نگینوی

بُک کارپوریشن، دھلی۔٦

DABISTAN-E-BIJNOR (PART II)
by:DR. SHAIKH NAGINVI
Year of Edition 2017
ISBN 81-88912-66-2

₹ 400/-

نام کتاب : دبستانِ بجنور (جلد دوم)

مرتب : ڈاکٹر شیخ نگینوی

پتہ : چھنگا والا چوک، نگینہ ضلع بجنور، یوپی 246762

رابطہ : 0941232687 (shaikh.naginvi@gmail.com)

سن اشاعت : ۲۰۱۷ء قیمت ۴۰۰ روپے

کمپوزنگ : القاسم کمپیوٹر، نگینہ 9548533387

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی۔۶

ملنے کے پتے

☆ امرین بک ایجنسی، احمد آباد۔M.08401010786
☆ ہمالیہ بک ورلڈ، حیدرآباد۔ Ph. 040-66822350
☆ حسامی بک ڈپو، حیدرآباد۔Ph.040-66806285
☆ انجمن ترقی اردو، حیدرآباد۔ M.09247841254
☆ ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹرس، حیدرآباد۔Ph.040-24411637
☆ دکن ٹریڈرس، حیدرآباد۔Ph.040-24521777
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ممبئی۔Ph.022-23774857
☆ کتاب دار، بک سیلر، پبلشر، ممبئی Ph.09869321477
☆ بک امپوریم، پٹنہ۔ M.09304888739
☆ عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ۔M.09433050634
☆ دانش محل، لکھنؤ۔Ph.0522-2626724
☆ راعی بک ڈپو، الہ آباد۔M.09889742811
☆ مرزا ورلڈ بک ہاؤس، اورنگ آباد۔M.09325203227
☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ
☆ کشمیر بک ڈپو، سری نگر، M.09419761773
☆ مکتبہ علم وادب، سری نگر M.094419407522
☆ گلوبل بکس، سرینگر، M.09070340905
☆ وطن پبلیکیشنز، سری نگر، M.09419003490
☆ قاسمی کتب خانہ، جموں M.09797352280
☆ نعیم بک سیلرز، مئوناتھ بھنجن، M.09450755820
☆ دفتر میڈیا پوسٹ، A-72 ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی 25
☆ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی

BOOK CORPORATION
3191, Ground Floor, Mirza Ahmad Ali Marg
Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 2321616, 2321446 Fax: 0091-11-23211540
E-mail: ephdelhi@yahoo.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شروع کرتا ہوں

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

یہیں ہے مرکزِ دانش، کے نامِ بجنوری
زمانہ مٹ گیا لیکن نشان باقی ہے
وہی مٹھاس ہے، تہذیب ہے، شرافت ہے
ہمارے لہجے میں اردو زبان باقی ہے

انور کیفی

انتساب

اپنے چھوٹے بھائی

ڈاکٹر محمد احسن (علیگ)

اور

ہر اس اُردو ادیب، شاعر کے نام

جس نے اپنے بچوں کو

اُردو کی بھی تعلیم دی۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی

فہرست

☆☆

دبستانِ بجنور خوش آئند ابتدا

یوں تو اپنی جائے ولادت سے جذباتی لگاؤ تمام ہندوستانیوں کے مزاج کا حصہ ہے۔ اہالیان بجنور اس سلسلے میں شاید سب سے سبقت لے گئے ہیں۔ ہماری تربیت ہی ایسے ماحول میں ہوتی ہے جہاں شہر پرستی وطن پرستی کا ہی حصہ سمجھی جاتی ہے۔ میں نے یہاں بہت سے بزرگوں کی زبانی سنا ہے کہ جو اپنے علاقے سے محبت نہیں کرسکتا وہ وطن سے بھی محبت نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ رستم علی بجنوری اور قائم چاند پوری سے تاجور نجیب آبادی تک ہر اہل قلم نے اپنے ساتھ اپنے وطن کے نام کا لاحقہ بھی ضروری سمجھا۔ اپنے کام کے ساتھ شہر کا نام وابستہ کرنا ایران میں قدیم روایت ہے لیکن ہندوستان میں قائم چاند پوری سے قبل کسی نے اپنے شہر کا نام اپنے نام کا جزو بنانا ضروری نہیں سمجھا۔ قائم چاند پوری کے بعد یہ روایت بڑی مستحکم ہوئی۔

برادرم شیخ نگینوی نے بھی حق وطن پرستی ادا کرنے کا مصمم ارادہ کیا ہے۔ ظاہر ہے جہاں جذباتی تعلق ہوگا وہاں مبالغہ آرائی اور خوش بخشی بھی ہوگی۔ اسی وجہ سے انھوں نے بجنور کو بھی ایک باقاعدہ دبستان کی شکل دے دی ہے۔ ابھی تو دہلی اور لکھنؤ کے دبستانوں کا قضیہ بھی پوری طرح طے نہ ہوا تھا کہ ایک اور دبستاں وجود میں آگیا۔ رام پور کے بعض شعرا کو بھی دبستان رام پور کی موجودگی کا یقین ہے اور اس کام سے دو کتابیں بھی موجود ہیں لیکن فرنچ تذکرہ نگار جارج فانٹوم

سے شکیب رام پوری تک متفق ہیں کہ رام پور میں شعر وسخن کی محفلیں قائم چاند پوری کی بدولت شروع ہوئیں اور قائم ہی دبستان رام پور کے موسس کہے جاسکتے ہیں۔

خواہ تکنیکی اعتبار سے دبستان بجنور کو ایک ادبی اسکول قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن بجنور کی ادبی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ میر وسودا کے زمانے میں قائم، منعم اور خشونت رائے شاداب جیسے قابل ذکر شعرا موجود تھے۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ اردو کی ابتدائی نثر میں رستم علی بجنوری نے بھی اپنا نام درج کرایا تھا۔ رستم علی بجنوری کی تصنیف ''قصہ واحوال روہیلہ'' ایک نیم تاریخی کتاب ہے جو شجاع الدولہ کی وفات پر ختم ہوجاتی ہے۔ رستم علی بجنوری نے دارانگر چھاؤنی کا بھی ذکر کیا ہے، ممکن ہے یہ دارانگر گنج ہو جو آج بھی بعض تاریخی عمارتوں ونشانیوں کو محفوظ کئے ہوئے ہے۔ رستم علی بجنوری چھاؤنی میں انگریزوں کے بچوں کو اردو پڑھاتے تھے۔

غالب کے دو عزیز شاگرد بھی بجنور اور نہٹور کے رہنے والے تھے۔ غالب نے بعض خطوط میں قائم کو بڑے احترام سے لفظ ''استاد'' کے ساتھ یاد کیا ہے اور ان کے اشعار پر تصرف کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ اس وجہ سے غالب کا بھی ایک دور دراز کا تعلق ہم سے قائم ہوتا ہے۔ میر لکھنؤ جاتے ہوئے نجیب آباد سے گزرے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دور درشن بمبئی کے ایک پرانے پروگرام ''سُر بھی'' میں ایک صراحی بنانے والے نے بمبئی میں کہا تھا کہ میں صراحیوں میں تھوڑی سی بجنور کی مٹی شامل کرتا ہوں اس کی وجہ سے صراحیوں میں سے ہمیشہ سوندھی سوندھی خوشبو آتی رہی ہے۔ میں ''قائم چاند پوری'' اور ''عبدالرحمن بجنوری'' پر تصانیف شائع کراکے تھوڑا بہت حق ادا کرچکا ہوں۔ لیکن یہ بھی مانتا ہوں کہ مٹی کا ابھی بہت قرض باقی ہے۔

بجنور کے بعض اہل قلم یقیناً اس قابل ہیں کہ ان پر تفصیلی تصانیف شائع کی جائیں۔ برادرم شیخ نگینوی نے ایک خوش آئند ابتدا کی ہے مجھے قوی امید ہے کہ اس کارواں میں مزید اہل قلم شامل ہوں گے۔

ڈاکٹر خالد علوی
ذاکر حسین کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی
09868181236

دبستانِ بجنور تحقیقی کارنامہ

دبستانِ بجنور مولف ڈاکٹر شیخ نگینوی خوبصورت اور معنیٰ خیز گرد پوش عمدہ کاغذ اور روشن صفحات کے ساتھ نظر نواز ہوئی۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اس قبیل کی تصنیف کے مرتب اپنی تحریروں میں خود کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیخ نگینوی کا طریق کار اس کے برعکس ہے انہوں نے خود نمائی سے بڑی حد تک پرہیز کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں کام کی باتیں اختصار اور باوقار انداز میں جھلکتی ہیں۔ اس بات کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ ''دبستان بجنور'' ایک غیر معمولی، تحقیقی، تنقیدی اور ادبی کارنامہ ہے اور اس کتاب کی دستاویزی حیثیت سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ڈاکٹر خالد علوی کا مختصر مگر جامع مضمون ''خوش آئند ابتداء''، مختصر ہوتے ہوئے بھی وقیع اور اہم ہے اور کئی گم گشتہ شخصیتوں کی نشاندہی بھی ''دبستان بجنور'' بے جا طوالت سے پاک ہے ضلع بجنور کی معروف اور کم معروف (بہ استثنائے چند) سبھی ادبی شخصیتوں کا ذکر شیخ نگینوی نے بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ کتاب اپنی زمین سے محبت کی آئینہ دار ہے۔ اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا ثبوت بھی اس کتاب میں ادبی شخصیتوں کے ساتھ ضلع کے ان اکابرین کا تذکرہ بھی ہے، جنھوں نے تعمیر وترقی، تعلیم اور دیگر میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

تقریباً 270 صفحات میں ضلع بجنور کی معروف اور کم معروف نیز ایسی اہم ادبی شخصیت جن کو ہم بھول چکے ہیں یا جن کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہیں، سبھی کو اس کتاب کے قلم کاروں نے منظر عام پر لانے کی کامیاب کوشش کی ہے، کئی مضامین جو ایک ہی

موضوع پر لکھے گئے ہیں مصنفین کی مہارت اور انداز بیان کے سبب یکسانیت کا شکار ہونے سے قطعی محفوظ ہیں، مؤلف اگر بے جا طوالت سے احتیاط نہ برتتے تو 276 صفحات کی یہ کتاب کئی جلدوں میں بھی نہ سما پاتی۔

آخر میں بس اتنا کہ دبستانِ بجنور ایک ایسا تحقیقی کارنامہ ہے جس کی حیثیت سنگِ میل کی ہے۔

جلیس نجیب آبادی
محلہ پٹھان پورہ، نجیب آباد
9837401782

گرانقدر اضافہ

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر مذہب کو اپنے مشن اور پیغام کی ترسیل کے لیے زبان کی ضرورت ہوتی ہے زبانوں کی یہ سب سے بڑی خصوصیت اُردو زبان سے بھی جدا نہیں؛ یوں تو اس ہند آرائی زبان کی آبیاری مختلف مذاہب اور مکاتب فکر کے لوگوں نے کی ہے؛ لیکن عربی اور فارسی زبانوں سے قربت کی بنا پر اس زبان سے مسلمانوں کا تعلق نسبتاً زیادہ رہا ہے؛ اسی لیے بعض لوگوں کو یہ کہنے کا موقع خوب ملا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اُردو زبان کا یہ خاصہ ہے کہ ہر عمل میں اس زبان نے اس غلط پروپیگنڈہ اور مذہبی رجحان کی تردید کی ہے اسی لیے آج اُردو زبان کا دامن مختلف پھولوں کا گلدستہ ہے۔ جس کی خوش بو سے محبت، امن اور اتحاد کا پورا چمن مہکتا ہے۔

آزادی کے بعد سے اُردو تعلیم کا رجحان کم ہوتا گیا بالخصوص شمالی ہند میں اس رجحان کا سب سے زیادہ اثر دیکھا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو چند حلقوں تک محدود ہو کر رہ گئی ان میں اُردو زبان بولی اور سمجھی تو جاتی ہے؛ لیکن پڑھنے اور لکھنے کا رجحان اُردو تعلیم کا بہتر نظم نہ ہونے کے باعث اور بھی کم ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود مسلمان بھی اس زبان سے دور ہوتے چلے گئے، ریاست اتر پردیش اس تشویشناک رجحان کی سب سے بڑی مثال ہے ان حالات میں کبھی ہندی اور انگریزی تعلیم یافتہ قلم کار کی اُردو زبان میں تخلیق نہ صرف قابلِ ستائش ہے؛ بل کہ یہ تخلیق ایک مثالی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ ڈاکٹر شیخ نگینوی اسی سلسلہ کی اک کڑی ہیں جنھوں نے ''بجنور'' کی ادبی، تہذیبی

فضا اس کی اہمیت اور اس کے تاریخی ورثہ کو سمونے کی ایک کامیاب کوشش اپنی اس کتاب بعنوان "دبستانِ بجنور" میں کی ہے۔ اس سے قبل فیضانِ راقم کے عنوان سے ایک کتاب تخلیق کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی کامرس کے طالب علم ہیں اور ان دنوں محکمہ برقیات سے وابستہ ہیں اپنے موضوع مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے یہ کتاب انتہائی اہم ہے امید ہے کہ یہ کتاب اُردو قارئین و محققین کو بے حد پسند آئے گی اور ان کے علم میں اضافہ کریگی۔ فیضانِ راقم کی طرح اس کتاب کی بھی پذیرائی ہوگی اور زبان وادب میں ایک گرانقدر اضافے کے طور پر تسلیم کی جائے گی۔

ڈاکٹر قاسم انصاری

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اُردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

qasim.ansari09@gmail.com

میڈیا کے لیے نمونۂ عمل

ڈاکٹر شیخ نگینوی ہمارے ان قلمکاروں میں سے ایک ہیں جن کی تحریریں لگ بھگ ربع صدی سے اردو ادب میں اضافہ کا سبب بنی ہیں وہ ایک کامیاب ناظم، خوش فکر صحافی اور خوب صورت نثر نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین انسان ہیں۔ ڈاکٹر شیخ نگینوی کا شمار کامیاب خاکہ نگاروں میں ہوتا ہے اور انہی ''نام نیک رفتگاں ضائع مکن کی فکر'' ان سے بہتر تخلیقات پیش کرنے میں مددگار ہوتی ہیں۔ یہی قلندرانہ مزاج اور بزرگوں سے ان کی محبت کے سبب فیضانِ راقم اور دبستانِ بجنور جیسی تصنیفات معرضِ وجود میں آئیں۔ ان کی تصنیفات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روہیل کھنڈ کی علمی وراثت کو بچانے میں جنون کی حد تک کوشاں ہیں اور دبستانِ بجنور کے نگینوں کی بازیافت میں وہ اردو ادب کا قیمتی نگینہ بن گئے ہیں۔ نگینہ بجنور سے تعلق رکھنے والے شیخ نگینوی سے میرا تعلق اس وقت سے ہے جب وہ ہفتہ وار جدید مرکز سے وابستہ ہوئے اور راقم الحروف بحیثیت نیوز ایڈیٹر خدمت انجام دے رہا تھا۔ بحیثیت صحافی وہ کامیاب صحافی ہیں؛ لیکن ان کی ادبی وابستگی مجھے ان سے قریب سے قریب تر کرتی رہی اور ایم جی ایم کالج سنبھل میں بحیثیت صدر شعبہ اور پرنسپل بننے تک ان تعلقات میں اضافہ ہوتا رہا۔ ان کی مختلف الجہات شخصیت کا ہر پہلو منور و تاباں ہے۔

ڈاکٹر شیخ نگینوی اردو کے سنجیدہ اسکالر ہیں انھوں نے اپنی تصنیفات میں موضع کے ساتھ نہ صرف انصاف کیا ہے؛ بلکہ مسلسل خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں ان کی تلاش انھیں اردو ادب کے افق پر ان کی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر شیخ نگینوی کی تازہ

ترین تصنیف دبستانِ بجنور جلد دوم نہ صرف یہ کہ اردو قارئین بلکہ میڈیا کے لوگوں کے لیے نمونہ عمل ہے۔ میری دعا ہے کہ ڈاکٹر شیخ نگینوی کی یہ کتاب ادبی حلقوں میں اعتبار و استناد کے ساتھ ساتھ قبولیت بھی حاصل کرے گی۔

ڈاکٹر عابد حسین حیدری
پرنسپل
ایم جی ایم کالج، سنبھل
9411097150

پیشِ لفظ

زبان اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور اس کائنات کا وجود جب سے ہے تب سے زبان موجود ہے اور فکر و خیال یا جذبے کے اظہار و ابلاغ کا ذریعہ ہے خواہ وہ بول چال کی زبان ہو یا کتابوں کی زبان، زبان ایک ایسا سماجی عطیہ ہے جو زمانے کے ساتھ ساتھ ایک نسل سے دوسری نسل کو ملتا رہتا ہے زبان ایک ایسے لباس کی طرح نہیں ہے کہ جسے اتار کر پھینکا جا سکے بلکہ زبان تو انسان کے دل کی گہرائیوں میں اتری ہوئی ہوتی ہے یہ خیالات کی حامل اور آئینہ دار ہی نہیں ہوتی بلکہ زبان کے بغیر خیالات کا وجود ممکن نہیں زبان انسانی زندگی کا اہم جز ہے اسی لئے مولوی عبدالحق مرحوم کہا کرتے تھے کہ ''زبان پر جو چوٹ پڑتی ہے وہ زبان پر نہیں پڑتی دلوں پر پڑتی ہے'' اگر کسی قوم کو مٹانا ہو تو اس کی زبان مٹا دو تو قوم کی روایات، اس کی تہذیب، اس کی تاریخ، اور اس کی قومیت، گویا سب کچھ مٹ جائے گا اور جس قوم کو اپنی زبان اچھی نہ لگے اور دوسروں کی زبان پر فریفتہ ہو وہ کیا زندہ رہ سکتی ہے؟ اس وقت کرہ ارض پر چھ ہزار سے زائد زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہر زبان کی اپنی اپنی تاریخ اور اہمیت ہے جیسے جیسے انسان دور جہالت سے ترقی یافتہ دور میں داخل ہوتا گیا اس نے زائد زبانیں سیکھنے کو ترجیح دی اور اس کی قابلیت کی کسوٹی ہمہ لسانی صلاحیت بن گئی، اور فصیح زبانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو قبول کرنے کے لئے اپنے تمام در اور دریچے کھلے رکھتی ہیں ایسی زبانیں نہ صرف دوسری زبانوں سے الفاظ قبول کرتی ہیں بلکہ انہیں اپنے اندر اس طرح سموتی ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ الفاظ ان زبانوں کا جز بن جاتے ہیں۔

اردو زبان نے دو بڑی زبانوں (عربی اور فارسی) کا اثر قبول کیا اور بعد میں بلا تامل

فارسی اور ہندی سے الفاظ وتراکیب قبول کیں بس یہی وہ وصف ہے جس نے اس زبان کو دنیا کی بڑی زبانوں کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا بعد میں اس زبان نے انگریزی سے بھی استفادہ کیا اور اپنی لغت میں مزید وسعت پیدا کی ۔ اردو آج ہندوستان کی 23 سرکاری زبانوں میں سے ایک اور سب سے زیادہ بولی، لکھی، پڑھی اور سمجھی جانے والی زبان ہے اردو زبان کو یہ شرف حاصل رہا کہ وہ کسی بھی عہد میں جمود کا شکار نہیں ہوئی دیگر ثقافتوں کے زیر اثر ہر عہد میں اس زبان میں نئے الفاظ شامل ہوتے رہے۔

مادری زبان کی اہمیت مسلمہ اور ناقابل تردید حقیقت ہے بچہ ماں کی گود سے جو زبان سیکھتا ہے وہی مادری زبان ہے۔ ریسرچ سے بھی یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بچہ کی صلاحیتیں مادری زبان ہی میں پروان چڑھتی ہیں کیونکہ اس زبان کو وہ سمجھتا ہے اسی میں سوچتا ہے، اور اسی میں اپنے جذبات، خیالات، اور احساسات کا اظہار کرتا ہے ترقی یافتہ ممالک کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ انہوں نے مادری زبان کی حفاظت کی اور اسی میں انہیں آراستہ کیا ہے۔ بیشتر ممالک اپنی ہی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم دیتے ہیں تب بھی وہ دنیا میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے اگر قومی ملکی اور سیاسی تناظر میں دیکھا جائے تو دنیا میں کہیں ایک ملک کی مثال دینے سے آپ قاصر رہیں گے جس نے اپنی زبان چھوڑ کر غیر ملکی زبان استعمال کر کے ترقی کی ہو؟

زبان اور تہذیب کا رشتہ بہت ہی مضبوط ہوتا ہے جو اپنی مادری زبان سے دور ہو جاتے ہیں وہ اپنی تہذیب سے بھی نا آشنا ہونے لگتے ہیں کیونکہ تخلیقی صلاحیتیں مادری زبان میں ہی جنم لیتی ہیں جو بچیں اپنی مادری زبان میں عبور رکھتے ہیں وہ آسانی کے ساتھ دوسری زبانیں بھی سیکھ لیتے ہیں مادری زبان بچے کی شخصیت کو ابارنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اس کا کامیاب تجربہ ترقی یافتہ ممالک میں ہو رہا ہے۔ اپنی مادری بولی کو حقیر سمجھنے والے اپنے آپ کو اور اپنی تہذیب کو بھی کمتر اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور جن کو اپنی تہذیب حقیر معلوم ہو وہ زمانے میں معتبر نہیں ہو سکتے۔

ہر زبان اپنے ساتھ زندہ تہذیب رکھتی ہے۔ دنیا کی جتنی بھی بڑی زبانیں ہیں سب کا ماضی تابناک، حال محفوظ اور مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ ہماری پیاری زبان اردو کا ماضی نہایت

تابناک رہا ہے۔اس کو دنیا کے عظیم ملک بھارت میں پیدا ہونے، پھلنے، پھولنے اور مستحکم ہونے کا شرف حاصل ہے۔اس کی بنیادیں اتنی مضبوط اور پختہ ہیں کہ بدخواہوں کے تعصب اور تنگ نظری کے ساتھ ساتھ، بہی خواہوں کی نادانیوں اور بے اعتنائیوں کے باوجود، اس کی خوبصورتی، دیدہ زیبی اور رعنائیاں چمک دمک رہی ہیں۔ ماضی کے ادیبوں نے جو ابواب قائم کیے ہیں موجودہ نسل ان میں اضافے کر رہی ہے اور آئندہ نسلوں کے لیے وہ نقوش ثبت کر رہی ہے جن کی اتباع یقیناً مشعلِ راہ ہوگی۔

آج کے دور میں ہر شخص اپنی الگ شناخت قائم کرنا چاہتا ہے۔موجودہ نسل اپنے آپ سے ایک سوال پوچھتی ہے who are we (ہم کون ہیں) ہر فرد اس سوال کا اپنے انداز سے جواب فراہم کرتا ہے۔ کچھ لوگ فلسفوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر رہ جاتے ہیں اور کچھ اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ادب میں اس سوال اور تلاش جواب نے علاقہ نگاری کی نئی جہت قائم کی۔ انگریزی ادب میں تھامس ہارڈی نے بیسویں صدی کے آغاز میں علاقہ نگاری کی شروعات کی۔اس نے انگلینڈ کے wessex کو چنا۔اس کے زیادہ تر ناول اسی علاقہ کے گرد و نواح سے متعلق رہے۔یہ تجربہ ساری دنیا کو جلد ہی متاثر کر گیا اور باقاعدہ علاقہ نگاری ایک مستقل صنفِ ادب بن گئی۔زیادہ تر اہلِ قلم حضرات نے اپنے رہائشی پسندیدہ علاقے چنے۔ہم نے موجودہ تالیف کے لیے اپنے علاقہ ضلع بجنور کا انتخاب اسی جذبہ سے متاثر ہو کر کیا۔یوں بھی ہندوستان جیسے عظیم ملک میں اگر علاقوں کی نشاندہی نہ کی جائے تو ہم گمنامی کے اندھیروں میں گم ہونے کا Risk نہیں لے سکتے۔ہاں! یہ علاقہ نگاری علاقائیت اور علاقی حد بندی یا تعصب کی نہج پر نہیں کی جانی چاہیے۔

اپنی مٹی پر اگر ناز نہیں کر سکتے
زندگی ہم ترا آغاز نہیں کر سکتے

ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش کی مرادآباد کمشنری کے ضلع بجنور کی جانب مشرق میں مرادآباد، نینی تال (اتراکھنڈ)، مغرب میں ہری دوار، میرٹھ، مظفر نگر، شمال کی جانب اتراکھنڈ کا

گڑھوال اور ہری دوار جنوب کی جانب ضلع امروہہ ہیں۔ سمندری سطح سے 284 میٹر اونچائی والے ضلع بجنور 30.29 زاویہ اور 29.2 ڈگری مشرق زاویہ کے وسط میں واقع ہے۔ گنگا، رام گنگا، مالن اور کھوہ ندیاں اسی ضلع بجنور میں بہتی ہیں اور سرزمین کو سرسبز وشاداب بنائے ہوئے ہیں۔ انتہائی قدیم یہ ضلع مہابھارت عہد سے بھی قبل آباد ہے۔ حکومت دہلی کے قیام کے بعد اس کا بیشتر حصہ ریاست سنبھل کی قلم رو میں آگیا۔ دورِ اکبری [1605.1555] میں ضلع بجنور سرکار (ضلع) سنبھل کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا۔ دورِ شاہجہانی [1657.1626] میں ''کٹھیرین'' سردار، راجہ رام سنگھ نے بغاوت کی جس کا 1636 میں قلع قمع سنبھل کے صوبیدار، رستم خاں فیروز جنگ نے کیا اور مراد آباد شہر وجود میں آیا۔ ضلع بجنور جس علاقے میں واقع ہے اس کا آٹھویں صدی عیسوی سے کٹھیر [''کٹھیرین راجپوتوں'' کی نسبت سے] نام ہونے کا پتہ چلتا ہے جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط سے روہیل کھنڈ [''روہیلہ پٹھانوں'' کی نسبت سے] کہلانے لگا۔ برٹش دورِ حکومت میں روہیل کھنڈ کو یونائیٹیڈ پرونسیز آف آگرہ اینڈ اودھ میں ضم کردیا گیا۔ 1817ء میں ضلع مراد آباد کا ایک حصہ کاٹ کر نیا ضلع شمال ڈویژن کے نام پر بنایا گیا۔ جس کا صدر مقام نگینہ رکھا گیا۔ جو 1824ء میں منتقل ہوکر بجنور چلا گیا اور ضلع بجنور کہلایا۔ 1901ء میں ضلع بجنور کی آبادی 7,80,105 تھی جو 2011ء میں 36 لاکھ 83 ہزار ہوگئی۔ جن میں 59.56 فیصد ہندو، 37.45 فیصد مسلمان، 2.16 فیصد سکھ باقی دیگر مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ اردو یہاں کے 32.98 فیصد عوام کی زبان ہے۔ بجنور ضلع میں بجنور، چاند پور، دھام پور، نگینہ، نجیب آباد پانچ تحصیلیں ہیں۔ جبکہ بجنور، نگینہ، مراد آباد تین پارلیمانی حلقہ اس ضلع سے منسلک ہیں۔ آٹھ اسمبلی حلقوں، بجنور، نگینہ، نجیب آباد، نہٹور، دھامپور، بڑھاپور، نور پور، چاند پور بارہ بلاک: محمد پور دیول، کوتوالی دیہات، آلہ پور، بڑھاپور، افضل گڑھ، ہلدور، جلیل پور، آنکو، نور پور، کرتپور، نجیب آباد، بڑھن پور، بارہ میونسپل بورڈ بجنور، نگینہ، نجیب آباد، کرتپور، ہلدور، دھامپور نہٹور، شیرکوٹ، افضل گڑھ، سیوہارہ، نور پور، چاند پور۔ 6 شہر پنچایت ساہن پور، جلال آباد، بڑھاپور جھالو، سہنسپور، منڈاور، 956 گرام پنچائت پر مشتمل ضلع بجنور کی زبان کو کھڑی بولی کہا جاتا ہے۔

ضلع بجنور شمالی ہندوستان کا ایک زرخیز علاقہ ہے۔ گنے کی میٹھی پیداوار کے لیے پورے ملک میں مشہور ہے۔ اسی طرح دنیا کی سب سے شیریں زبان یعنی اردو کی آبیاری کے لیے بھی اس کا اپنا الگ مقام ہے۔ بجنور میں علاقہ نگاری کی شروعات فرقان احمد صدیقی نے کی ان کی کتاب ''ضلع بجنور کے جواہر'' کو اس سلسلے میں اولیت حاصل ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف ادبیات بلکہ کسی بھی میدان میں سرگرمِ عمل اشخاص کو تلاش کیا گیا۔ اور ان کے تذکرے کو زندہ جاوید کر دیا گیا۔ انھوں نے ایک فردِ واحد ہوتے ہوئے مستقل ادارے کا کام کیا۔ ہم بھی اپنے نحیف کاندھوں پر یہ ذمہ داری اٹھاتے ہوئے ''دبستان بجنور'' کی تالیف میں اپنی معلومات کی حد تک منہمک ہیں اور ظاہر ہے کہ اپنی کوشش کمال حد تک کرنے کے باوجود بھی عنوان کا کما حقہ حق ادا کرنا بیحد مشکل ہے۔

ضلع بجنور سے متعلق سرکردہ ادبی شخصیات کو تلاش کرنا اور ان کی خدمات کا اعتراف سپردِ قلم کرنا نہایت دشوار گذار کام ہے۔ ہم نے اسی سلسلے میں خود بھی کچھ سمینار منعقد کیے اور مختلف سمیناروں میں حصہ لیا۔ دوسرے یہ کہ ضلع بجنور کے جو قلم کار عہدِ حاضر میں ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں اس مہم میں ان کو بھی شامل کیا گیا اور انھوں نے اپنے قیمتی اور معلوماتی مضامین سے دبستانِ بجنور کو رونق بخشی۔ جستجو یہی رہی کہ اس تعلق سے زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچے۔

اس مردم خیز علاقے پر کام کرنے کے بعد ہمیں حیرت ہوئی کہ مرحومین کے بعد معاصرین بھی بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ یوں تو یہ ایک ضلع ہے مگر ہم نے اسے دبستان کا نام دیا ہے۔ ہمارے جمع کردہ مواد سے ثابت ہو جائے گا کہ ضلع بجنور اپنا ایک الگ اور منفرد لب ولہجہ رکھتا ہے۔ اسی دبستان کے گل بوٹے ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تلاش معاش اور مجبوری یہ دو ایسے عوامل ہیں، جنھوں نے دنیا میں ہزار ہا نئی تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔ بجنور کے لوگ جہاں بھی ہیں، ان کے لب ولہجہ کو الگ ہی پہچانا جا سکتا ہے۔ ضلع بجنور کی بولی، زبان، لہجہ، الفاظ کا انداز گفتگو، تحریر کا اسلوبِ نگارش اپنی جگہ ممتاز مقام رکھتا ہے۔ اسی لیے اسے ''دبستان بجنور'' کا نام دیا ہے۔

یہ اور کوئی تیرے سوا ہو نہیں سکتا
وہ دور سے لہجے کی کھنک بول رہی ہے

محمد عرفان نگینوی

شمالی ہندوستان میں کوہ ہمالیہ کی شوالک پہاڑیوں کے دامن میں بسا ضلع بجنور ایک تاریخی اور مردم خیز خطہ ہے۔ یہ علاقہ ادبی سرگرمیوں اور تحریکوں کا گہوارہ تو نہیں رہا لیکن یہاں کی قابلِ فخر شخصیتوں نے ادبی ارتقا کی تاریخ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اردو زبان وادب سے بجنور کا قریبی اور گہرا تعلق ہے۔ ضلع بجنور کی سرزمین جتنی گنے اور آم کی کاشت کے لئے زرخیز ہے، اس سے زیادہ رسیلی اور میٹھی زبان اردو کے لئے بھی زرخیز ہے۔ اردو زبان کی بنیاد جس بولی پر رکھی گئی اس کے علاقے میں اس ضلع کا بھی بڑا حصہ شامل ہے۔ گویا اردو کا تعلق بجنور سے کافی گہرا ہے۔ ضلع بجنور لسانی سروے کے مطابق ان اضلاع میں سرِ فہرست ہے، جہاں ساٹھ فی صد لوگ اُردو بولتے ہیں۔ ''والگا سے گنگا تک'' نامی شہرۂ آفاق کتاب کے خالق اور ماہرِ لسانیات راہل سنکرتاین نے لکھا تھا کہ ''اردو اس علاقے کی زبان ہے جس کو ضلع بجنور کہتے ہیں۔

پنجاب اور ہریانہ قریبی صوبے ہونے کی وجہ یہاں کی عوامی زبان خاص کر دیہات میں سپاہیانہ وتحکمانہ ہے جبکہ قصبوں اور شہروں میں لکھنو، رام پور، مراد آباد اضلاع کا اثر ہے شہری عوام کے لب ولہجے نیز الفاظ میں توابی نزاکت وتکلف کی چاشنی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ الفاظ میں تشدید کا استعمال ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ منفرد لب ولہجہ، الفاظ اور اندازِ گفتگو یہاں زبان کو الگ پہچان بناتی ہے جو دنیا بھر میں پہچانی جاتی ہے۔ کچھ الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو بجنوریوں کی پہچان بن چکے ہیں مثلاً یوں (اس طرح) کاں (کہاں) اُرے (ادھر) پرے (اُدھر) کررا (کررہا) ہووے (ہوئے) وے (وہ) آوے (آئے) آریا (آرہا) جاریا (جارہا)، کن نے (کس نے) اُوبے، اَبے وغیرہ۔

سیاسی اعتبار سے بجنور چونکہ شاہانِ دہلی اور حکمرانِ اودھ دونوں سے متعلق رہا، اس لئے یہاں کی ادبی محفلوں میں دبستانِ دلی اور لکھنو دونوں کا تتبع کیا گیا اور آج تک یہاں کی زبان و

بول چال پر اس کا اثر موجود ہے۔ بیسویں صدی میں رام پور اسکول کی ادبی روایات سے بھی یہاں کے شعرائے نے اکتساب سے گریز نہیں کیا۔ اردو ادب کے دو بڑے مرکز حیدر آباد اور بھوپال نے بھی اس ضلع کی ادبی شخصیتوں کو نواز کر یہاں کی ادبی زندگی میں روح پھونکی۔

شعرائے متقدمین قائم چاند پوری کا نام سرِ فہرست ہے۔ تذکرہ نگاروں نے قائم، غالب، ذوق اور خصوصاً داغ کے ان شاگردوں کا ذکر کیا ہے جن کا تعلق ضلع بجنور سے ہے۔ دورِ متوسط اور دورِ آخر میں بھی نامور اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے والے شعرائے بجنور کی ایک اچھی خاصی فہرست ہے۔ جن کا ذکر تذکرہ نگاروں نے نہیں کیا لیکن اس زمانے کے مشہور گلدستوں اور رسائل میں ان کا کلام اور بعض بعض کے حالاتِ زندگی محفوظ ہیں۔ شعروشاعری میں جہاں یہاں کے اہلِ علم دادِ سخن لیتے رہے، وہیں دوسری اصناف نظم ونثر میں بھی بجنوریوں نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ مولوی نذیر احمد کا نام اردو ناول نگاری اور افسانہ نویسی کی تاریخ میں ہمیشہ اولین ادیبوں کی فہرست میں آتا رہے گا۔ جنھوں نے تعزیرات ہند کا اردو میں ترجمہ کیا جو ہندوستان کی تمام عدالتوں میں رائج ہوا۔ اردو زبان کے مورخین کا تذکرہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کے نام کے بغیر نامکمل رہے گا۔ اردو ادب کے پہلے نثر نگار رستم علی بجنوری کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے والوں کی فہرست جب بھی مرتب کی جائے گی سید سجاد حیدر یلدرم کا نام ترکی زبان سے ترجمہ کرنے والوں کی ابتدائی فہرست میں ہمیشہ جگہ پائے گا۔ اردو تخلیق وتنقید نگاری کی تاریخ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو فراموش نہیں کرسکتی۔ غالب شناسی کا دور صحیح معنوں میں ''محاسن کلامِ غالب'' کی تخلیق کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کو تمام دنیا سے متعارف کرایا اور غالبیات کا افتتاح کیا، ان کے ریسرچ ورک ''محاسن کلام غالب'' نے غالب کو غالب بنایا اور اسے انگریزی، جرمن اور فرنچ ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اردو زبان وادب سے متعلق تحریروں میں علامہ تاجور نجیب آبادی اور سر تیج بہادر سپرو کا نام بھی آتا رہے گا۔

صحافت کے میدان میں بھی بجنور کی خدمات قابلِ ذکر ہیں یہاں کی صحافتی زندگی کا قلب مدینہ اخبار رہا ہے۔ صحافت کی نامور شخصیتیں قاضی عدیل عباسی، ابوسعید بزمی، نیاز فتحپوری،

شوکت تھانوی، محمد عثمان فارقلیط، نصر اللہ خاں عزیز، حامد الانصاری غازی اور ضیاالحسن فاروقی وغیرہ سب مدینہ سے متعلق رہے۔ یہ اشخاص ایسے ہیں جن پر بجنور جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ یوں تو ہر ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ ہم نے یہاں مثال کے طور پر یہ نام اس لیے پیش کیے ہیں کہ ہماری تالیف اور ہمارا جمع کردہ مواد اپنا تعارف بہتر انداز میں دنیا سے کرا سکے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ چھوٹی سی کوشش آنے والی نسل کو وہ ورثہ دے گی، جس کی بنیاد پر ضلع بجنور کے علاوہ شمالی ہندوستان بلکہ پورے برصغیر کے گم شدہ افراد کی حیات وخدمات کی تدوین کا کام زور پکڑے گا۔

دبستان بجنور کے منشی کنول نین سرکش، پروفیسر عبدالصمد صارم، ڈاکٹر عثمان اطہر پرویز، ماہر لسانیات گیان چند جین، مجاہد ملت حفظ الرحمٰن سیوہاروی، صحافی مولانا مجید حسن (مدینہ)، نشتر خانقاہی، رفعت سروش، پروفیسر خورشید الاسلام، نہال سیوہاروی، شمس کنول، ظفر احمد نظامی، کوثر چاند پوری، دشینت کمار، امام الشعراء اختر الایمان، چندر پرکاش جوہر بجنوری، ہلال سیوہاروی، رام اوتار مضطر نجیب آبادی، رام کمار و رما غم بجنوری، ڈاکٹر ذکاء الرب رباب ، پرکاش مونس، پروفیسر ریاض الاسلام، شمبھو سنگھ دانش، مولوی عبدالبصیر عتیقی آزاد، علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی عزیز الرحمٰن، شوق بجنوری، نور بجنوری، شیون بجنوری، افسر جمشید، جاوید ندیم، جیراج سنگھ بشنوئی، ڈاکٹر شرافت حسین مرزا، حافظ محمد رحمت اللہ فرحت نگینوی، سید مصطفی حسین قادری فرخ نگینوی، حفیظ میرٹھی، عشرت کرتپوری، قاضی ظہور الحسن ناظم، اظہار اثر، پروفیسر عبد الغفار انور نگینوی (راول پنڈی)، حکیم نیر واسطی، ڈپٹی نثار حیدر نہٹوری، راز چاند پوری، حافظ عبدالسمیع سیمابی، مختار زنجانی، ظفر بجنوری، عبدالقیوم ارشق شیر کوٹی، قیام بجنوری، منظور علی تمنا بجنوری، پیر زادہ قاسم، مولوی محی الدین ذکا، گوہر نور پوری، مخفی کریمی، محمد عرفان رومانی، منصور بجنوری، شکیل رحمانی، قیصر زیدی، قاضی سجاد حسین کرتپوری، پروفیسر عابد ملک، خواتین میں نذر سجاد، صدیقہ بیگم، قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر عابدہ سمیع، پنہاں انصاری، پروفیسر ثریا حسین، ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ڈاکٹر مینا نقوی، نصرت مہدی، پروفیسر خورشید حمرا، علینا عترت رضوی، ڈاکٹر فرزانہ خلیل، ریحانہ بجنوری، عمرانہ خاتون، سبطین سیدہ، شہناز کنول، صائمہ فہیم، عظیمہ نشاط، نئی نسل میں اسد رضا، نعیم کوثر، حسیب سوز، بینا بجنوری، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر وسیم اقبال، جاوید دانش، معین شاداب، اطہر شکیل، ابرار کرتپوری،

شکیل جمالی، سرور عالم راز (امریکہ) سالک دھامپوری، عبد الغفار دانش نور پوری، سراج الدین ندوی، ڈاکٹر شیخ نگینوی، جاوید اقبال، قاسم صدیقی، عشرت جاوید، محمد احمد دانش، مسرت شیزی، انور بجنوری، شفق بجنوری، فاخر ادیب، شناور کرتپوری، مرزا طالب بیگ، شمیم احمد صدیقی، نظام ہاتف، غیاث دھامپوری، سرور نگینوی، اقبال احمد صدیقی، احتشام نعمانی، مرغوب احمد، اسلم صدیقی، آفتاب نعمانی، ایم اے کنول جعفری، شجاع الدین قمر، عزیز نہٹوری، شمشاد فلاحی، مہندر سنگھ اشک، داؤد نور، ارشد ندیم، تہذیب ابرار، پرویز عادل، شکیل بجنوری، جلیس نجیب آبادی، انجینئر سمیع الدین، یوسف بہزاد، مولانا ریاست علی، ڈاکٹر محمد یعقوب عامر سیوہاروی، ڈاکٹر زین العابدین، طیب آزاد شیرکوٹی، وغیرہ وہ نام ہیں جو تاریخ ادب اردو میں سنہرے الفاظ میں درج ہیں۔ ان ادیبوں اور شاعروں نے بڑی تعداد میں تصانیف تخلیق کر کے اردو کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

ہے ضلع بجنور بھی تاریخ اردو میں مگر
لگ گئیں صدیاں کہ اردو کے سنورنے کے لیے

یوسف بہزاد

اردو ادب کی ایسی کوئی صنف نہیں ہے جسے ضلع بجنور کے ادیبوں نے اپنے قلم کے ذریعے سجا سنوار کر مضبوطی نہ دی ہو۔ گیت، غزل، نظم، قصیدہ، نعت، مرثیہ، ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشاء پردازی، سوانح نگاری، تذکرہ نگاری، مکالمہ نگاری، خودنوشت، ترجمہ نگاری، اوپیرا، طنز و مزاح، صحافت، تنقید و تبصرہ وغیرہ۔ وغیرہ غرضیکہ سبھی اصناف میں ضلع بجنور کے اردو ادیبوں نے طبع آزمائی کی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ''اردو شعر و ادب ضلع بجنور کے ادیبوں کے بغیر نامکمل ہے۔'' اس بات کا ثبوت اور حقائق ہم دبستانِ بجنور کی جلد اول میں پیش کر چکے ہیں اور اب جلد دوم بھی قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔ باقی مضامین ان شاء اللہ دبستان بجنور کی تیسری جلد میں منظرِ عام پر آئیں گے۔ انسان ہوں اور غلطی ہونا انسانی فطرت ہے اس کتاب میں اگر کوئی غلطی ہو تو برائے کرم اس کو نظر انداز نہ کریں بل کہ اس سے آگاہ فرمائیں جس کا ازالہ تیسری جلد میں کیا جا سکے۔

شیخ نگینوی

❖❖❖

منظوم تاثرات

دبستانِ بجنور ہے وہ کتاب
جو معروف شعراء کا ہے انتخاب
شیخ نگینوی ہیں نگینہ کے آب وتاب
بجنور کے ہیں اہلِ نظر میں وہ انتخاب
ہے آسمانِ شعروادب پر وہ ضوفشاں
بجنور کے دبستاں پہ ہے ان کی جو کتاب
مشاہیرِ بجنور کا تذکرہ
ہے اس میں نمایاں بصد آب وتاب
عیاں ہے مؤلف کا ذوقِ سلیم
ادب کی یہ خدمت ہے ایک لاجواب
وہ قائم ہوں یا ہوں وہ رفعت سروش
سپہرِ ادب کے تھے جو ماہتاب
اس سرزمین کے تھے روشن چراغ
جو اقصائے عالم ہیں میں انتخاب
یہاں کے مشاہیر شعرو ادب
ہیں تاریخ ضوفشاں ایک باب
ہے دو جلد پر تذکرہ یہ محیط
یہ تالیف ہے ایک کارِ ثواب
ہے بجنور کا کیا ادب میں مقام
توقع ہے ہوں گے سبھی فیضیاب
ہے بہتر اگر راز کا بھی ہو ذکر
ہے طرزِ بیاں جن کا مثلِ گلاب
ہے برقیؔ ادب کی یہ خدمت عظیم
دعا گو ہوں مقبول ہو یہ کتاب

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی

اسد رضا۔ صحافی، ادیب اور شاعر

ڈاکٹر شیخ نگینوی

ضلع بجنور برسوں سے تاریخی وادبی نقطۂ نظر سے ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سرزمین ضلع بجنور میں شروع سے ہی علم وادب کے پرچم کو لہرانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ جب ہم تاریخی اعتبار سے اس پر روشنی ڈالتے ہیں تو ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کی تحریکات میں اس سرزمین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خواہ اس کا تعلق ادب سے ہو یا ملت سے۔ سیاست سے ہو یا سماج سے۔ ہر قسم کی تحریکات میں ہمیشہ اس کا بھرپور تعاون رہا۔ 1857 کے غدر، خلافت اور عدم تعاون، نمک ستیہ گرہ، کرو یا مرو 1942 جیسی متعدد تحریکوں میں بھی بجنور کے حضرات کا پورا پورا ساتھ رہا۔ اس کی خاک سے ہی پیدا ہوئے مولوی مجید الحسن کے ہاتھوں ''مدینہ'' جیسا اعلیٰ پائے کا اخبار نکلا۔ جس نے ہندوستان کی آزادی میں ایک مشعل راہ کا کام انجام دیا۔ جس کی روشنی میں نہ صرف آزاد ہندوستان کے سپنے تعبیر ہوئے بلکہ سرزمین بجنور اردو صحافت اور اردو ادب کو بھی ایک نیا راستہ دکھائی دیا۔ ''مدینہ'' اخبار بیسویں صدی کے اعلیٰ ترین اخباروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس میں اکبرالہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، حسرت موہانی اور ظفر علی جیسے بڑے بڑے فن کاروں نے اپنے قلم کے جوہر دکھلائے۔

بجنور کی ایک اور اہم شخصیت کے مالک مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کا

نام نہ صرف بجنور کے لیے بلکہ پورے ہندوستان کے لیے لائق فخر ہے جو پوری طرح ملک وقوم کے محبت کے جذبے سے رطب اللسان تھے۔انہوں نے بہت سی شہرۂ آفاق تصانیف تحریر کیں اور جنگ آزادی میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔ان کے علاوہ بجنور کی متعدد ہستیوں کے نام حافظ محمد ابراہیم نگینوی، (سابق گورنر،صوبہ پنجاب ومرکزی وزیر حکومت ہند) ،بیرسٹر آصف علی، عبدالطیف گاندھی، گووند سہائے،ملکھن سنگھ تیاگی اور چندن سنگھ وغیرہ آزادی جنگ میں سرمایہ فخر ہیں۔اسی فہرست میں ایک ادبی نام اسد رضا کا بھی ہے۔

سید اسد رضا نقوی اپنے والد سید ظفر علی نقوی کی تیسری بیوی سیدہ قمر بانو کے بطن سے 2 رجنوری 1952 کو بیدی سادات ضلع بجنور یو پی میں صبح سویرے پیدا ہوئے۔جب آپ نے لکھنے کا آغاز کیا تو شروع شروع میں آپ نے اپنا تخلص اسد بجنوری استعمال کیا۔مگر بعد میں وقت کے ساتھ جب آپ ترقی پسندی اور جدت پرستی سے متاثر ہوئے تو آپ نے اپنا تخلص اسد بجنوری سے اسد رضا اختیار کرلیا۔شاعری آپ کو والد سید ظفر علی نقوی اور ماموں سید رئیس حیدر رضوی رئیس بجنوری سے وراثت ملی۔علم عروض کے ماہر،معروف شاعر اور ادیب پروفیسر عنوان چشتیؒ کے سامنے آپ نے زانوئے ادب طے کیا۔

اسد رضا کی تعلیم بجنور، سہارنپور، میرٹھ،پیلی بھیت اور بریلی شہروں میں ہوئی۔آپ نے ایم۔اے۔(انگریزی وارد و ادبیات)بی۔ایڈ۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا تقریباً چھ سال تک مظفر نگر ضلع کے ایک کالج میں انگریزی لکچرار کے طور پر کام کیا اس کے بعد آپ نے صحافت کے میدان میں قسمت آزمائی اور سوویت یونین کے شعبۂ اطلاعات نئی دہلی میں بطور ایڈیٹر متعد برسوں تک کام کیا اور تقریباً نصف درجن کتب کا ترجمہ انگریزی سے اردو اور ہندی میں کیا۔آپ نے ''امنگ''،''ہمارا قدم'' میں صحافتی خدمات انجام دیں۔آپ نے تہران، شیراز، برمنگھم،لندن،ایران امریکہ، برطانیہ، ونیپال وغیرہ ممالک میں ادبی سفر کیے۔

اسد رضا کو اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔جس کی وجہ سے تینوں ہی زبانوں کے اخبارات ورسائل میں آپ کی تحریریں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اردو اخبار

راشٹریہ سہارا میں تین دن ''تلخیاں'' عنوان سے طنزیہ کالم لکھ رہے تھے جو آپ نے حال ہی میں لکھنا چھوڑا ہے۔ ایک ویکلی کالم ہندی راشٹریہ سہارا اخبار میں اور انگریزی اخبار ویکلی ''سہارا ٹائمز'' میں بھی آپ مضامین لکھتے رہے ہیں۔ سہارا کے ٹی وی پروگرام میں بھی آپ حصہ لینے سے گریز نہیں کرتے اور سہارا پریوار کے تمام رسائل واخبارات میں آپ کی تخلیقات موجود ہوتی ہیں۔ سہارا سے سبکدوشی کے بعد آپ کے مضامین مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہورہے ہیں۔

اب تک اسؔد رضا کی گیارہ کتابیں شائع ہوکر مقبول عام کا درجہ حاصل کرچکی ہیں۔ جن میں تین بچوں کے لیے دلچسپ اور کھٹی میٹھی کہانیوں کے مجموعے ''چاند نگر کے سیر''، ''ننھے منو کی سرکار'' اور ''کرکٹی مشاعرہ'' ہیں۔ آپ کی تحریر کردہ چٹ پٹی کہانی ''چاند نگر کی سیر'' مغربی بنگال میں نصابی کتاب ''سلیس اردو'' کے اندر شامل ہے۔ شاعری کے دو مجموعے ''آئینے احساس کے''، ''شہر احساس'' اور طنزیہ ومزاحیہ مضامین کے مجموعے ''شوخیِ قلم''، ''ادبی اسپتال'' اور ''شوشے'' ہیں جن میں ''ادبی اسپتال'' کے اب تک دو ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اس کے علاوہ ''نمائش خانہ''، ''اردو صحافت 1901 تا 1947''، ''یوپی میں اردو میڈیا کتابیں 2016 میں آئی ہیں''، ''ننھے منوں کی سرکار'' اور ''کرکٹی مشاعرہ'' کو چھوڑ کر آپ کی تمام کتابوں کو یوپی، بہار مدھیہ پردیش اور دہلی اردو اکادمی کے علاوہ ملکی سطح کی کئی تنظیموں کی جانب سے انعامات واعزاز سے نوازا گیا ہے۔ اسؔد رضا صاحب نے اب تک دو ہزار سے بھی زائد کالم ومضامین لکھے ہیں جو اردو، ہندی اور انگریزی کے اہم روزناموں اور رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

معروف صحافی، ذہین، طنز ومزاح نگار اور مخلص انسان اسؔد رضا کی نثر نگاری پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو نظم کے مقابلے ان کی نثر کا دامن زیادہ وسیع اور کشادہ نظر آتا ہے۔ جس میں ان کے فن طنز ومزاح کے معیاری نمونے اپنے عروج پر جلوہ گر نظر آتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ طنز ومزاح کی راہ ایک دشوار راہ ہے۔ کیونکہ ایک اعلیٰ اور معیاری طنز ومزاح ہر طرح کے پھکڑپن، ابتذال، ہرزہ سرائی اور سوقیانہ پن سے پاک ہوتا ہے اور اسے ادبیت کا بھی پورا لحاظ ہوتا ہے۔ ان کے طنز میں ہمدردی اور مزاح میں شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اسد رضا نے نثر میں ہزارہا مضامین

سفرنامے، خاکے اور کالم کے ذریعہ طنزیہ ومزاحیہ ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ خصوصاً کالم نگاری کی روایت کو قائم رکھنے میں ان کا قلم بہت معاون ومددگار ثابت ہوا۔

اسد رضا صرف غزل کے شاعر نہیں ہیں۔ بکھراؤ کے اس دور میں جب غیر مربوط اور جزوی مربوط کلام زیادہ دیکھنے میں آتا ہے اسے ایک وصف ہی کہنا چاہے کہ اسد رضا اس بات کا خاص اہتمام کرتے ہیں کہ ان کے خیال کی پوری ترسیل ہو۔ ان کی غزل کے اشعار بھی واضح ہوتے ہیں۔ ان کی نظمیں بھی ان کے شعروں کی طرح براہِ راست قاری یا سامع کی سمجھ میں آتی ہیں اور نظموں کے مضامین کا کینواس بھی وہی ہے، جو ان کی غزلوں کے اشعار کا ہے اور اسلوب وہی ہے۔ اسد رضا کی شاعری سماجی حقیقتوں سے جڑی ہوئی ہے۔ بقول پروفیسر عنوان چشتی ''اسد رضا ایک تعلیم یافتہ اور خوش اطوار انسان ہیں ان کی شاعری میں بھی وہی سادگی بے تکلفی، دردمندی اور اخلاص ہے جو ان کی شخصیت کا جوہر ہے۔ ان کی شاعری میں ایک حساس اور بے دار ذہن اور انسان کو سوچتے ہوئے جذبوں کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔'' ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں!

بیچ کر اس نے خودی ،دولت وشہرت پالی
تم نے کیا پایا اسد تم تو انا رکھتے تھے

صاف بچتے رہے دنیا کے حوادث سے وہی
اپنے ماں باپ کی جو ساتھ دعا رکھتے تھے

نفرت بھرا زمانے کا گرچہ چلن رہا
لیکن خلوص بانٹنا اپنا مشن رہا

❖❖❖

میں بجنور ہوں، ادب کا طور ہوں

ڈاکٹر اسد رضا

میں ضلع بجنور ہوں، تاریخ علم وادب کا زرّیں دور ہوں۔ میرا باپ ہمالہ اور ماں ہے گنگا۔ اگر چہ مہابھارت سے ہزاروں سال قبل بھی میں موجود تھا، لیکن انگریزی سرکار نے مجھے 1824 میں باقاعدہ ضلع بنانے کا اعلان کیا۔ میرے مغرب میں میرٹھ اور مظفر نگر اضلاع واقع ہیں تو مشرق میں مرادآباد اور نینی تال جبکہ شمال میں گڑھوال اور پوڑ نگری ہری دوار، نیز جنوب میں جیوتی باپھولے نگر (امروہہ) ہے۔ یہ افتخار بھی مجھے ہی حاصل ہے کہ 15/اگست 1947 کو آزادی ملنے پر وطن عزیز کو جس بھرت کے نام پر بھارت کے نام سے موسوم کیا گیا، اُس کی پیدائش بھی میری ہی سرزمین پر واقع ایک آشرم میں شکنتلا نامی تاریخی خاتون کے بطن سے ہوئی تھی۔ یہ شکنتلا ہستنا پور کے راجہ دشینت کی پتنی تھیں اور سنسکرت کے عظیم ڈرامہ نگار کالی داس کے معروف عالم ڈرامہ ''ابھگیان شاکنتلم'' کی ہیروئن۔ میں شمالی بھارت کی شیوالک پہاڑیوں کے وسیع و عریض دامن میں اپنے علمی، تہذیبی، تاریخی، جغرافیائی، ثقافتی، سائنسی، لسانی اور ادبی گلوں کی خوشبوئیں پھیلا رہا ہوں۔ چونکہ میں سطح سمندر سے 284 میٹر کی اونچائی پر واقع ہوں، اسی لئے میں نے دنیا کو رستم بجنوری، قائم چاند پوری، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حفظ الرحمٰن، حافظ محمد ابراہیم، سجاد حیدر یلدرم، عبدالرحمٰن بجنوری، قرۃ العین حیدر، اختر الایمان، رفعت سروش، پروفیسر

خورشید الاسلام، علامہ تاجور نجیب آبادی، پروفیسر ظفر احمد نظامی، کوثر چاند پوری، شمس کنول، ہلال سیوہاروی، مولانا مجید حسن، پروفیسر گیان چند جین، دشینت تیاگی، بابو سنگھ چوہان، مسٹر خانقاہی اور شوق بجنوری جیسی بلند قامت شخصیات دیں۔

میں مغربی اتر پردیش کا ایک زرخیز علاقہ ہوں، جسے گنگا، رام گنگا، مالن اور کھوہ ندیاں سیراب کرتی ہیں، لیکن میری زرخیزی صرف گیہوں، گنا، دھان کے کھیتوں اور آم وامرود کے باغات تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ میں نے اُردو زبان کے ہی نہیں، ہندی کے بھی بڑے ادیب اور شاعر پیدا کیے اور اس حد تک کیے کہ ''دبستان بجنور'' اسی طرح عالم وجود میں آ گیا جس طرح ''دبستان دہلی''، ''دبستان لکھنؤ''، دبستان رامپور''، ''دبستان عظیم آباد''، ''دبستان بھوپال''، ''دبستان لاہور'' اور ''دبستان حیدرآباد'' وغیرہ آئے۔ ممکن ہے اردو کے بعض محترم ناقدین، محققین اور دانشوروں کو اس بات پر اعتراض ہو کہ ''دبستانِ بجنور'' کے ساتھ یہ اتنے سارے دبستان کہاں سے نکل آئے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اب اُردو والوں کو ''دبستانِ کراچی'' اور ''دبستان ممبئی'' نیز ''دبستان کلکتہ'' کے وجود کو بھی تسلیم کر لینا چاہئے، کیونکہ ہر دبستان پر علاقائی زبانوں کا بھی اثر پڑتا ہے۔ مثلاً اگر ''دبستان دہلی'' پر پنجابی، ہریانوی اور برج بھاشا کا اثر پڑا تو دبستان لکھنؤ نے اودھی بھاشا کے اثرات قبول کیے۔ ''دبستان عظیم آباد'' نے بھوجپوری اور میتھلی زبانوں کے الفاظ قبول کیے۔ میں مغربی ہند کے اُن اضلاع میں سے ہوں جہاں سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش سے کھڑی بولی نکلی اور پھر کھڑی بولی کو ہی ملک کی دو عظیم زبانوں اُردو اور ہندی نے اپنی بنیاد بنایا۔ سنسکرت آمیز ناگری لپی میں لکھی جانے والی کھڑی بولی ہندی کہلائی اور عربی فارسی الفاظ کی حامل اور فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی کھڑی بولی اُردو کہلائی۔ لیکن میرے باسیوں کی کھڑی بولی میں بجنوریت کی خوشبو ہے۔ مثال کے طور پر اکثر بجنوری بالخصوص دیہات کے بجنوری تشدید لگا کر لفظ بولتے ہیں، جیسے روٹی کو روٹّی یا یہی تو کی جگہ ''یوئی تو''۔ اسی طرح میرے چھوٹے بڑے ادیبوں نے میری علاقائی ندیوں، پہاڑوں اور قصبوں کا ذکر اپنی شاہکار تخلیقات میں کیا ہے۔ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ میری بیٹی قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں میری علاقائی ندی مالن کا ذکر کیا

ہے۔ میں نے اُردو و ہندی زبان میں ہزار ہا نامور شعراء، افسانہ نگار، ناقد، محقق، ادیب اور صحافی پیدا کیے جن کا تاریخ زبان وادب میں اہم مقام ہے۔ اب میں اگر صرف اُن کے نام ہی لکھنے لگوں تو کئی جلدوں پر مشتمل کتابوں کی ضرورت پڑے گی۔

مختصراً یہ بتلا دوں کہ میں 38 لاکھ سے زائد آبادی پر مشتمل ہوں۔ ملک کا سب سے بڑا ڈبل لائن، الیکٹری فائڈ ریلوے ٹریک جو امرتسر تا ہاوڑہ روٹ کا احاطہ کرتا ہے، میری سرزمین سے گزرتا ہے۔ کئی نیشنل ہائی ویز اور اسٹیٹ ہائی ویز (قومی و ریاستی شاہ راہیں) میری اہمیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ چونکہ آمد و رفت کے ان ذرائع کی بدولت میرے باشندے پہلے بھی اور اب بھی ملک کے تمام صوبوں، ریاستوں اور چھوٹے بڑے شہروں میں آتے جاتے اور بستے بھی رہتے ہیں۔ لہٰذا ماضی میں قائم چاند پوری، ڈپٹی نذیر احمد، سجاد حیدر یلدرم، تاجور نجیب آبادی، نشترِ خانقاہی، کوثر چاند پوری، اختر الایمان عشرت کرتپوری، رفعت سروش جیسے میرے باشندے ''دبستان دہلی'' سے وابستہ رہے تو عبدالرحمٰن بجنوری نے دبستان بھوپال میں اپنی علمیت اور تحقیق وتنقید کی خوشبو پھیلائی۔ بعد میں وہ میری ہی آغوش میں آگئے۔ پروفیسر گیان چند جین اور دیگر بجنوری ادیب وشاعر ریاست حیدرآباد میں شعر وادب کے غنچے کھلاتے رہے۔ نوابین اودھ اور رامپور کے درباروں میں بھی میرے ادیب وشعرا شعر وادب کی شمعیں روشن کرنے گئے۔ آج بھی میرے سپوت مثلاً شکیل بجنوری، پروفیسر خالد علوی، ابرار کرتپوری، اسد رضا، معین شاداب، شکیل جمالی، ڈاکٹر وسیم اقبال، ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی، شناور کرتپوری، ڈاکٹر شیخ نگینوی، پرویز عادل، جلیس نجیب آبادی، انجینئر سمیع الدین، مرزا طالب بیگ، یوسف بہزاد، ڈاکٹر زین العابدین، طیب آزاد شیرکوٹی، ارشد ندیم، عشرت جاوید، اطہر شکیل، مسرت شیزی، سراج الدین ندوی وغیرہ میری گود میں رہ کر یا ملک کے دیگر شہروں میں شعر وادب، صحافت، تنقید و تحقیق اور تعلیم و تربیت کے میدان میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اور ''دبستان بجنور'' کا نام روشن کر رہے ہیں۔

میرے سپوتوں نے صرف علم وادب کو ہی فروغ نہیں دیا بلکہ وطن عزیز کی پہلی اور دوسری جنگ آزادی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور عظیم قربانیاں مادر وطن کے قدموں میں پیش

کیں 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں میرے بہادروں نے انگریزوں کو مار بھگایا۔ نجیب آباد کے نواب محمود خاں کو ضلع کے ہندو مسلم رؤسا نے جنگ آزادی کا سپہ سالار بنادیا۔ 20 مئی 1857 کو دوپہر ایک بجے میرے ایک بہادر سپوت جمعدار رام سروپ نے جیل کا دروازہ کھول دیا اور قیدیوں کو رہا کردیا۔ ضلع کلکٹر الیگزینڈر شیکسپیر نے جیل کے باہر فائرنگ کرائی جس میں کئی لوگ شہید ہوگئے۔ نواب محمود خاں کی حکومت کو دہلی کے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے بھی تسلیم کرلیا تھا، لیکن بدقسمتی سے یہ پہلی جنگ آزادی ناکامی سے دوچار ہوئی اور میں پھر انگریزوں کی غلامی میں چلا گیا۔ لیکن دیگر ہندوستانی باشندوں کی طرح میرے بجنوری سپوت بھی وطن عزیز کو آزاد کرانے کے لئے کوشاں رہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، حافظ ابراہیم، عتیق الرحمٰن وغیرہ 1942 کی ہندوستان چھوڑو تحریک میں شامل ہوئے۔ 12/اگست 1942 کو میرے باشندوں نے انگریزوں کے خلاف جلوس نکالا جس کو روکنے کی برٹش سرکار کی کوششیں ناکام رہیں تو عتیق الرحمٰن جیسے میرے بیٹوں کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔

میرے کامیاب کاروباری جین بیٹوں نے مشہور عالم انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا نکالا جو اب بھی شائع ہوتا ہے۔ ساہو شانتی پرساد جین اور اُن کے برادر خورد شری یانس پرساد جین (نجیب آباد) نے ہی ہندوستان میں ادب کا سب سے بڑا اور پروقار اعزاز گیان پیٹھ ایوارڈ شروع کیا جو اب بھی ہندی، اُردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے بڑے ادیبوں کو دیا جاتا ہے۔

میدان صحافت میں بھی میرے باسیوں نے خوب نام کمایا۔ معروف و مقبول اخبار مدینہ میری ہی سرزمین سے شائع ہوتا تھا، جس میں اُردو کے بڑے بڑے صحافی اور قلمکار لکھنا باعث فخر خیال کرتے تھے۔ مولوی مجید حسن نے ''مدینہ'' اخبار کے علاوہ اخبار یثرب، ماہ نامہ فاران اور بچوں کا رسالہ ''غنچہ'' بھی میری ہی سرزمین سے شائع کیے۔ ویسے میری دھرتی سے اردو کا اخبار 1884 میں ''انجمن زراعت'' کے نام سے نکلا۔ ''مہر نیم روز'' 1893 میں حافظ عبدالکریم نے نکالا۔ 1898 میں ''صحیفہ'' اخبار نکلا۔ ''صحن چمن'' نگینہ سے شائع ہوتا تھا۔ ''فخر الحسن'' 1909 میں میری سرزمین سے شائع ہوا۔ ''معین الاسلام'' اور ''الخلیل' ہفت روزہ اخبار بھی میرے

بیٹوں نے نکالے۔ ہندی میں روزنامہ ''بجنور ٹائمس'' اور ''چنگاری'' بابو سنگھ چوہان نے نکالے اور اب اُن کے فرزند یہ اخبار شائع کر رہے ہیں۔ رفعت سروش، نشتر خانقاہی، افسر جمشید کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ میرے صحافی سپوت آج بھی پرنٹ والیکٹرانک میڈیا سے منسلک ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر شمع افروز زیدی، ماہنامہ ''بیسویں صدی'' کی مدیرہ ہیں۔ اسد رضا روزنامہ راشٹریہ سہارا، ویکلی ''عالمی سہارا'' اور ماہ نامہ ''بزم سہارا'' کے مدیر رہے۔ معین شاداب، ڈاکٹر شیخ نگینوی، یوسف انصاری، شمشاد فلاحی، پرویز عادل اور متعدد نوجوان صحافت میں میرا نام روشن کر رہے ہیں۔

بہر حال مجھے وِدُر جی کی کٹی اور شکنتلا وبھرت پر جتنا ناز ہے، اُتنا ہی فخر تاریخی مساجد، مقابر، قائم چاندپوری، ڈپٹی نذیر احمد، عبدالرحمٰن بجنوری، اختر الایمان، کوثر چاندپوری، تاجور نجیب آبادی، حافظ ابراہیم، مولانا حفظ الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر پر ہے۔ میں تا قیامت رہوں گا اور تب تک میرے ہونہار سپوت زندگی کے مختلف میدانوں میں اپنے کارہائے نمایاں کے ذریعے میرا سر فخر سے اونچا کرتے رہیں گے۔

میں بجنور ہوں، ادب کا طور ہوں...... جے ہند۔

اسد رضا

سابق مدیر روزنامہ راشٹریہ سہارا

F-97، سیکٹر-7، جسولہ وہار، نئی دہلی-25

موبائل: 9873687378

ڈاکٹر خالد علوی

صاحب علم وبصیرت، نقاد وادیب

ڈاکٹر شیخ نگینوی

ڈاکٹر خالد علوی چاند پور ضلع بجنور کے ایک علمی وسیاسی خانوادے میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم یہیں سے حاصل کی۔ ''ٹروتھ اینڈ اسلام'' کے مصنف پروفیسر شبیر الحسن خالد علوی کے فارسی اور انگریزی کے اولین استاد تھے جو ابتدائی طالب علمی کے زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ہم سبق بھی تھے۔ خالد علوی کا گھرانہ اس لحاظ سے ممتاز رہا ہے کہ علمی، ادبی اور مذہبی خصوصیات کے ساتھ حب الوطنی اس گھرانے کا طرۂ امتیاز ہے۔ سرسید احمد خاں نے جب چاند پور میں مولوی صادق کے قیام گاہ پر پناہ لی تھی تب ایک شب باغیوں نے مولوی صادق کے گھر کا محاصرہ کرلیا تو سرسید کو ایک شب کے لیے مولوی کلیم اللہ کے گھر رہنا پڑا بعد میں مولوی کلیم اللہ نے سرسید کو محفوظ وماموں موضع چچیلہ تک پہنچایا۔ یہ گاؤں اس وقت مولوی کلیم اللہ کی زمینداری میں تھا اس واقعہ کی تفصیل ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع ہوئی تھی یہ مولوی کلیم اللہ ڈاکٹر خالد علوی کے پردادا تھے دلچسپ بات یہ ہے کہ سرسید کے نظریات سے اس خانوادے کا کوئی فرد اتفاق نا کرتا تھا اور یہ گھرانہ انگریزوں سے کسی طرح کے ربط وضبط کو حرام اور مداخلت فی الدین سمجھتا تھا۔ خالد علوی کے دادا مولوی سلیم اللہ علوی نے نا صرف سرسید کے نظریات کو رد کرتے ہوئے مضامین لکھے بلکہ بہت سے

خطوط میں مناظراتی بحث بھی کی۔ سرسید کی عظمت یہ تھی کہ انھوں نے تمام خط وکتابت ''تہذیب الاخلاق'' میں شائع کی۔ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر تنویر احمد نے اس خط وکتابت پر مفصل مضمون لکھا۔

سلیم اللہ علوی بہت زمانے تک نواب رامپور کے اتالیق رہے لیکن بعد میں کسی وجہ سے برگشتہ ہوکر اپنے وطن واپس آگئے اور تادمِ مرگ اپنے وطن میں ہی علم کا دریا بہاتے رہے۔ اس علاقے میں جتنے اردو فارسی کے عالم پیدا ہوئے ان میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو مولوی سلیم اللہ علوی کا شاگرد نہ رہا ہو۔ مشہور افسانہ نگار کوثر چاند پوری بھی ان کے شاگرد تھے۔ کوثر صاحب نے ایک طویل مضمون اپنے استاد مولوی سلیم اللہ علوی پر ماہنامہ ''آج کل'' دہلی میں شائع کیا تھا۔ مشہور سائنس داں ڈاکٹر آتما رام نے بھی اپنے استاذ سلیم اللہ علوی کا ایک طویل مضمون ''ہندوستان ٹائمس'' میں لکھا جس کا عنوان تھا Great Human Being & Unique Teacher.

خالد علوی کے والد ملک عرفان علوی عنفوانِ شباب میں ہی جے پور میں تحصیل دار ہوگئے تھے لیکن اس خاندان کو برٹش سرکار کی نوکری راس نہ آئی سو وہ بھی استعفیٰ دے کر جنگِ آزادی میں شامل ہوگئے۔ تحریکِ ترکِ موالات میں وہ کئی سالوں تک انگریزوں کی جیل میں رہے حالانکہ انگریزوں کی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو کی'' پالیسی کے دوران کسی مسلمان کو گرفتار نہیں کیا جارہا تھا لیکن ملک عرفان علوی کی شعلہ بار تقریر نے برٹش سرکار کو ان کی گرفتاری پر مجبور کردیا۔ 1942 سے 1946 تک بریلی اور نینی وغیرہ جیلوں میں رہے جہاں انھیں حسرت موہانی اور ونوبا بھاوے کی صحبت حاصل ہوئی۔ ونوبا نے ان سے قرآن سمجھا اور عرفان کو گیتا پڑھائی۔ نور پور میں جنگِ آزادی کے ایک مشن کے دوران ملک عرفان علوی پر انگریزی سرکار کے کی پولس نے گولی بھی چلائی جس میں ان کے دو ساتھی ہوری سنگھ اور رکھی سنگھ شہید ہوگئے لیکن ملک عرفان علوی معمولی زخمی ہوئے ہر سال 17 جولائی کو ملک عرفان علوی کے یومِ پیدائش پر ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ خالد علوی کے بڑے بھائی راشد علوی ایڈوکیٹ ملک کے نامور سیاست داں اور رکن راجیہ سبھا

ہیں۔ان کے چھوٹے بھائی اسد علوی سپریم کورٹ کے وکیل ہیں۔

خالد علوی نے ابتدائی تعلیم چاند پور میں حاصل کی اور بجنور وردھمان کالج سے گریجویٹ کیا۔خالد علوی نے ایم اے میں آگرہ یونیورسٹی ٹاپ کی اوران کا ریکارڈ آج تک قائم ہے۔اس کے بعد دہلی یونیورسٹی میں ایم فل میں ٹاپ کیا اور آرٹس کے تمام مضامین میں اول آئے۔انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں ہی سجاد ظہیر کی مرتبہ کتاب ''انگارے'' کو مرتب کر کے شائع کیا جو تحقیقی مقالوں میں ایک سنگِ میل ثابت ہوئی۔اردو تحقیق میں اس سے قبل کسی کتاب کا مسودہ برطانیہ سے حاصل نہیں کیا گیا تھا۔''انگارے'' سے متعلق اردو ہندی میں جو کچھ بھی شائع کیا گیا تھا خالد علوی نے اس کو حاصل کر کے تحقیق کی نئی طرح ڈالی۔1932 کے نایاب اخبارات،رسائل وروزناموں کی تلاش ان کا بڑا کانامہ ثابت ہوئی۔خالد علوی کا پی ایچ ڈی مقالہ ''غزل کے جدید رجحانات'' اور ''انگارے'' متعدد جامعیات کے نصاب میں شامل ہیں۔جن میں کراچی یونیورسٹی اور کیمبرج یونیورسٹی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

خالد علوی کو تمام دنیا کے اردو حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔وہ جرمنی (چار بار) تاشکند،ازبکستان (بارہ بار) کناڈا (دو بار) ہالینڈ ،قطر، پاکستان،مکاؤ،ہانگ کانگ،اور چین کی ادبی تنظیموں کے زیرِ اہتمام منعقد جلسوں، سیمناروں میں ادبی تقریر کر چکے ہیں۔وہ نا صرف شاعر، ادیب اور نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں بلکہ ان کی ادبی تقریریں سامعین میں بے حد پسند کی جاتی ہیں اور شاعری کی طرح داد وصول کرتی ہیں۔وہ اگر چہ جذباتی طور سے خود تشہیری کے سخت مخالف ہیں انھوں نے اپنی کسی کتاب پر بھی اپنا فوٹو شائع نہیں کیا۔ان کو برلن کی اردو انجمن جو سرکار سے ملحق ہے نے دو بار ''غالب ایوارڈ'' اور ''اردو ایوارڈ'' سے نوازا ہے کناڈہ میں بھی خالد علوی کو ''فیض ایوارڈ'' اور ''مجاز ایوارڈ'' دیے جا چکے ہیں۔دہلی اردو اکادمی نے 2016 میں ''ایوارڈ برائے تحقیق وتنقید'' مبلغ پچاس ہزار روپے عطا کیے ہیں۔خالد علوی کی بنیادی شناخت ایک تنقید نگار کی ہے۔وہ ڈاکٹر محمد حسن اور پروفیسر قمر رئیس کے بعد کی نسل کے اہم نقاد سمجھے جاتے ہیں۔ادب برائے زندگی کے قائل ہوتے ہوئے بھی وہ ادب میں مسرت وانبساط کے

ابلاغ پر زور دیتے ہیں۔ادب میں کسی طرح کے پروپگنڈے کو وہ بڑی شدت سے رد کرتے ہیں۔
تنقید کے ساتھ ہی وہ شاعری سے بھی با قاعدہ وابستہ رہے ہیں ۔عرصہ دُراز تک مشاعروں میں
شرکت کرنے کے بعد آج کل مشاعروں سے مکمل طور پر گریزاں ہیں۔لیکن کیلگری (کناڈا)،
برلن (جرمنی)اور تاشقند (ازبکستان) کے مشاعروں میں سالانہ شرکت کرتے ہیں۔ان کے شعری
مجموعے ''مشک'' اور ''وحی'' بہت جلد منظرِ عام پر آنے والے ہیں خالد علوی ہندوستان کے مقابلے
بیرونی ممالک کے مشاعروں میں زیادہ شرکت کرتے ہیں۔

صاحب علم وبصیرت اور نقادوادیب ڈاکٹر خالد علوی کی انگلش کتاب ''انگارے'' پر روزنامہ ''
ہندو'' جیسے وقیع اخبار میں مضامین شائع ہوے۔ان کی دوسری انگریزی کتاب .On Manto ہے
جو منٹو پر ایک حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ہندوستانی سیمیناروں میں خالد علوی نے 200 سے
زیادہ مقالے پڑھے اور اردو مجلّوں کے علاوہ ایک انگریزی پندرہ روزہ Furtherance کی
ادارت بھی کی اور لاتعداد مضامین بھی مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

آج کل ڈاکٹر خالد علوی دہلی یونیورسٹی کے ذاکر حسین کالج دہلی میں درس وتدریس کے
فرائض انجام دے رہے ہیں اور دہلی کے ساؤتھ ایونیو علاقے میں رہائش پذیر ہیں۔

قائم اور ان کی غزل

ڈاکٹر خالد علوی

اٹھارہویں صدی کا کوئی اہم شاعر یا تذکرہ نگار ایسا نہیں ہے جس نے قائم کی پذیرائی نہ کی ہو یا قائم کی عظمت کے اعتراف میں بخل سے کام لیا ہو۔ قدرت اللہ قاسم، شیفتہ اور مولوی عبدالحق مستثنیات میں ہیں جو قائم کے کمال اور کلام کا اعتراف نہیں کرتے اور قائم کو میر و مرزا کے ہم رتبہ قرار دینے کو دیوانگی ٹھہراتے ہیں۔ شیفتہ ناپسندیدگی کے باوجود تمام اصناف شاعری پر ان کی قدرت کے معترف ہیں اور مانتے ہیں کہ قطعات ورباعیات ان کی شوخی فکر پر دلالت کرتی ہیں۔ قدرت اللہ قاسم نے 'مجموعہ نغز' میں قائم کی زبان کو قصباتیوں کی زبان اور ان کی طبیعت کو خباثت سے بھرا ہوا کہا ہے۔ اس عصبیت کے باوجود وہ فصیح بیان، شیریں بیان، فصاحت آئین، بلاغت آگیں، صاحب گفتار استوار، مالک اشعار آبدار، بلبل خوش نوا اور عندلیب داستان سرا قرار دیتے ہیں۔

میر تقی میر نے قائم کے کلام کو خصوصی کیفیت کا حامل ٹھہرایا ہے۔ میر حسن نے قائم کو نخل حدیقہ فصاحت، غنچہ بوستان بلاغت، شمع بزم سخن دانی، چراغ نکتہ دانی کہا ہے۔ میر حسن نے ہی پہلی بار یہ اطلاع بھی دی کہ قائم اپنا کلام بڑی پرسوز آواز میں پڑھتے ہیں۔ مصحفی نے 'تذکرہ ہندی' میں قائم کو ان کے استاد سودا سے آگے قرار دیا ہے۔ احد علی یکتا نے قائم کا دیوان سراسر انتخاب اور موتیوں کی طرح آبدار ٹھہرایا۔ یکتا کے مطابق قائم کا طرز ادا اور بندش الفاظ مرزا سودا کے قدم بہ قدم ہے اور اس کی برجستگی اور شگفتگی بے شبہ میر سے ملتی جلتی ہے۔ اور اس کے کلام میں عجب طرز

لطیف ہے جس میں دونوں استادوں کے کلام کا لطف و کیفیت ہے۔ بلکہ کہیں کہیں ان سے بھی آگے ہے۔ محولہ بالا تذکرہ نگاروں کے علاوہ شاہ کمال نے 'مجمع الانتخاب' میں قدرت اللہ شوق نے 'طبقات الشعرا' میں، کریم الدین نے 'طبقات الشعرائے ہند'، عنبر شاہ آشفتہ نے اپنے دیباچے میں، شوق رام پوری نے 'طبقات الشعرا' میں، غلام حسین شورش نے 'تذکرہ شورش' میں، شیخ وجیہہ الدین عشقی نے 'تذکرہ عشقی' میں، لچھمی نرائن شفیق نے 'چمنستان شعرا' میں، مرزا علی لطف نے 'تذکرہ گلشن ہند' میں، سعادت علی خاں ناصر نے 'خوش معرکہ زیبا' میں، ابوالحسن امیر الدین امراالہ آبادی نے 'تذکرہ مسرت افزا' میں قائم اوران کے کلام کی مناسب تحسین اور پذیرائی کی۔ آزاد نے 'آب حیات' میں قائم کا باقاعدہ ترجمہ شامل نہیں کیا۔ صرف حاشیے پر قائم کے کلام کے میر و مرزا سے نیچے نہ رکھنے کا مشورہ دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی ظاہر کر دیا کہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی کیونکہ قبول عام کچھ اور شے ہے۔

ایسے عہد ساز اور مقبول شاعر کی زندگی اور ابتدائی حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ اس عہد کے اکثر تذکرہ نگاروں نے سنین سے اغماز برتا ہے۔ اسی لیے اکثر شعرا کے سال پیدائش اور سال وفات معلوم نہ ہو سکے۔ قائم کا سن وفات قلندر بخش جرأت کے تحریر کردہ قطعہ تاریخ وفات سے مولوی عبدالحق نے 1793 برآمد کیا ہے۔ سال پیدائش کا تعین بعض استخراجی شہادتوں کی مدد سے 1719/1720 کیا گیا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کریں: قائم چاند پوری۔ اردو اکادمی، دہلی)

قائم کا تذکرہ 'مخزن نکات' 1744 میں شروع ہو کر 1755 میں مکمل ہوا۔ عرشی صاحب کے مطابق قائم نے تذکرے کا دیباچہ آغاز میں ہی تحریر کر لیا تھا۔ جس میں اپنے تذکرے کو اردو کا اولین تذکرہ قرار دیا ہے۔ قائم کے تذکرے سے مترشح قائم کی علمیت اور ریاضت کے مدنظر قائم کی عمر کا اندازہ پچیس سال لگایا گیا ہے۔ ظاہر ہے تذکرہ نگاری کی کوئی عمر طے نہیں کی جا سکتی۔ لیکن تذکرہ نگاری وسیع علم اور ریاضت کا مطالبہ کرتی ہے۔ حالانکہ یہ بھی مشہور ہے کہ لچھمی نرائن شفیق نے اپنا تذکرہ سترہ سال کی عمر میں مکمل کر لیا تھا۔ اول تو یہ دعویٰ خود شفیق کا ہے اور ان

کے تذکرے 'چمنستان شعرا' کے بعض تراجم ان کے دعوے کی توثیق نہیں کرتے۔ دوم شفیق کے والد منسارائے کو علم وادب سے گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے بھی کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ وہ نظام اول آصف جاہ کے دربار سے وابستہ تھے اس لیے شفیق کو مناسب ماحول اور وسائل دستیاب تھے۔ اس کے برعکس قائم ایک دیہی اور زراعتی علاقے کے باشندے تھے۔ ان کے ابتدائی افکار میں ناپختگی رہی ہوگی جس کی طرف ہلکا سا اشارہ قدرت اللہ قاسم نے بھی کیا ہے لیکن تذکرہ 'مخزن نکات' ایسی کسی خامی سے آلودہ نہیں ہے۔ اس لیے گمان غالب ہے کہ 'مخزن نکات' کے آغاز کے وقت قام کی عمر کم از کم پچیس سال ہونی چاہیے۔ اقتدا حسین کا بھی یہی خیال ہے۔ ان شواہد کی روشنی میں تعین کیا جاسکتا ہے کہ قائم کا سال پیدائش 1720 یا 1719 ہونا چاہیے۔ اگر قائم کا سال ولادت 1720 تسلیم کیا جائے تو ٹانڈہ میں مصحفی سے ملاقات کے وقت قائم کی عمر پچاس سال اور انتقال کے وقت تہتر (73) سال ہوتی ہے جو اکثر تذکرہ نگاروں کی اطلاع کے عین مطابق ہے۔

قائم کے اسلاف کے متعلق کسی تذکرے سے کوئی معلومات حاصل نہیں ہوتی۔ تمام تذکرے بشمول 'مخزن نکات' اس ضمن میں ہماری کوئی رہنمائی نہیں کرتے۔ قائم کے پرپوتے مولوی شاہد حسین مرحوم نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ قائم کے دادا سبزوار سے ہندوستان آئے تھے اور شیعہ تھے۔ قائم بھی کافی عرصے تک اجداد کے مسلک پر قائم رہے۔ قائم کے والد کا نام محمد ہاشم اور برادر بزرگ کا نام محمد منعم تھا۔ قائم کے نام کے سلسلے میں بھی کافی غلط فہمی رہی ہے۔ امتیاز علی عرشی کے مطابق قائم کا نام محمد قائم تھا اور ان کا لقب قیام الدین اور جو کوئی انھیں قیام الدین علی لکھتا ہے غالباً ان کے خاندانی ناموں سے بے خبر ہے (دیباچہ دستور الفصاحت: مرتبہ امتیاز علی عرشی)۔ قائم نے اپنے تذکرے میں اپنا نام قیام الدین قائم لکھا ہے۔ قائم سے دوستی کے بعد لکھے گئے تذکرے 'تذکرہ ہندی' میں وہ انھیں قیام الدین عرف محمد قائم کہتے ہیں۔ نبیرۂ قائم مولوی شاہد حسین نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ والد نے ان کا نام محمد قائم اور نانا نے قیام الدین رکھا تھا۔ 'مخزن نکات' میں قائم نے اپنا قیام الدین قائم لکھا ہے۔ اس کے بعد کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ ان کا نام قیام الدین قائم تھا۔

قائم کم سنی میں ہی اپنے برادر بزرگ محمد منعم کے پاس دہلی چلے آئے۔ جہاں نہ صرف اکتساب علم کیا بلکہ شاہی توپ خانے میں ملازم بھی ہو گئے۔ قائم نے دو شادیاں کیں۔ پہلی شادی چاند بی بی سے ہوئی جو امروہہ کی ساکن تھیں اور ان کی اولاد آج تک چاند پور میں موجود ہے۔ دوسری شادی دہلی میں ہوئی ان سے دو بیٹے تھے جو بچپن میں ہی جمنا میں ڈوب کر مر گئے۔

دہلی میں ملازمت کے دوران قائم نے عالمگیر ثانی کی ہجو لکھی اور عالمگیر ثانی کے عتاب سے گھبرا کر چاند پور چلے گئے اور چاند پور کے نزدیک موضع محدود میں اہل سنت کی مسجد میں پیش امام ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد قائم بھی اہل سنت کے مسلک میں شامل ہو گئے۔ موضع محدود میں آج تک قائم کا تعمیر شدہ کنواں موجود ہے۔ قریب ہی ایک بزرگ کا مزار بھی ہے۔ خاندانی روایت یہ ہے کہ ان بزرگ کی قربت ہی عقیدے میں تبدیلی کا باعث ہوئی تھی۔

قائم کے برادر بزرگ محمد منعم اچھے خاصے شاعر تھے۔ میر حسن اور دوسرے کئی تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر احترام کے ساتھ کیا ہے۔ قائم کے مطابق محمد منعم کی شاکر ناجی سے بھی دوستی تھی۔ ممکن ہے محمد منعم کی معرفت ہی قائم کی رسائی سودا اور درد جیسے برگزیدہ شعرا تک ہوئی ہو۔

قدرت اللہ قاسم نے مجموعہ نغز میں (ص 82) اور خوب چند ذکا نے 'عیار الشعرا' میں (ص 300) میں اشارہ دیا ہے کہ قائم دہلی آنے کے بعد سب سے پہلے ہدایت کے شاگرد ہوئے لیکن کسی بات پر ناراض ہو گئے اور شاہ ہدایت کی ہجو میں یہ قطعہ لکھا:

حضرت درد کی خدمت میں جب آ قائم نے
عرض کی یہ کہ اے استاد زماں سنتے ہو
امر ہووے تو ہدایت کو کروں میں سیدھا
واں سے ارشاد ہوا یہ کہ میاں سنتے ہو
راست ہوتے ہیں کسی سے بھی کبھی کج طینت
تیر بنتے بھی شاخ کماں سنتے ہو

ہدایت نے بھی جواب لکھا:

چشم انصاف سے دیکھو تو میاں قائم تم
چاہیے یوں کہ ہدایت کو اب استاد کرو
اور جو کچھ شاعری کا دل میں تمھارے ہے گھمنڈ
کہہ چکے ہم تو غزل بارے تم ارشاد کرو

دونوں قطعات سے ظاہر ہے کہ قائم اور ہدایت کے مابین شکر رنجی ضرور ہوئی تھی لیکن استادی اور شاگردی جیسا کوئی رشتہ معلوم نہیں ہوتا۔ ہدایت نے بھی ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ خوب چندذکا اور قاسم کے تذکروں کے درمیان صرف تین برسوں کا فاصلہ ہے۔ ان تذکروں کے علاوہ کہیں بھی ہدایت کو قائم کا استاد نہیں بتایا گیا۔ آزاد نے بھی یہ کہانی وہیں سے اڑائی اور حسب عادت ایک بے بنیاد کہانی کو وحی بنا کر پیش کیا۔ دراصل قدرت اللہ قاسم کو ہدایت سے بے پناہ عقیدت تھی اس کا اظہار انھوں نے اپنے تذکرے میں ہدایت کے ترجمے میں خوب کیا ہے۔ (مجموعہ نغز، ص 317)۔ انھیں قائم کی گستاخی بری لگی اور ایک کہانی بنادی۔

مصحفی نے قائم کو درد کا معتقد بتایا ہے۔ ممکن ہے ابتدا میں کچھ کلام بھی درد کو دکھایا ہو اور باقاعدہ شاگرد نہ ہوں۔ اقتدا احسن نے خیال ظاہر کیا ہے۔ ''کچھ عجب نہیں کہ اس نوجوان شاعر کی افتادِ طبع کو درد نے بھانپ لیا ہو اور خود انھیں سودا کی شاگردی اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہو (کلیات قائم۔ حصہ اول، ص 13)۔ بہرحال سودا کی صحبت اور استادی قائم کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی۔ سودا کی مقبولیت، علمیت اور اعلیٰ طبقے تک سودا کی رسائی نے قائم کے ذہن و ذوق کو وسعت اور زندگی کو طمانیت بخشی۔ قائم اور سودا کے ذہن میں ایسی مماثلت اور ہم آہنگی تھی جس کی مثال مشکل ہے۔ دونوں اعلیٰ درجے کی غزلیہ شاعری کے علاوہ ہجویہ اور فحش شاعری سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔

دلی کی سیاسی افراتفری کے باوجود دلی کا قیام قائم کی زندگی کا زرخیز دور ہے لیکن یہ عیش وعشرت کی زندگی زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکی۔ اور قائم کو طوعاً وکرہاً دلی کو خیر آباد کہنا پڑا۔ کچھ مشاہیر کا خیال ہے کہ ہجویہ شہر آشوب کی وجہ سے شاہ عالم کی بدظنی ترک دلی کی وجہ بنی۔ قائم کے اپنے بیان

کے مطابق ان کو چاروناچار دلی سے مراجعت کرنا پڑی اور باقی تمام عمر کس مپرسی میں گذارنی پڑی۔ اس عرصے میں قائم نے دوبار لکھنؤ کا سفر کیا۔ امروہہ میں قاضی شہر کے عہدے پر تقرر ہوا لیکن سابق قاضی نے ذمہ داری قبول نہ کرنے دی۔ قائم نے اس قاضی کی بھی ہجو لکھی:

اے قاضی بے مہر ترے طور یہ لعنت
اس ظلم پہ صد توف اس جور یہ لعنت
ہر وقت کہ پیروئی فی الفور یہ لعنت
لعنت نہ تجھے بلکہ ترے اور یہ لعنت
جس دور میں تو قاضی ہو اس دور میں لعنت

اس کے بعد بسولی، ٹانڈہ اور رام پور کے سفر کیے۔ ٹانڈہ میں محمد یار خاں کی سرکار میں سو روپیہ مہینہ تنخواہ پر استاد مقرر ہوئے۔ (واضح رہے کہ تقریباً ایک صدی بعد جب ذوق، بہادر شاہ ظفر کے استاد مقرر ہوئے تو ان کی تنخواہ صرف چار روپیہ مہینہ طے ہوئی)

نواب امیر محمد یار خاں سے قائم کے تعلقات اس درجہ دوستانہ تھے کہ مصحفی کی ہی اطلاع کے مطابق نواب کی سرکار میں مصحفی کی قصیدہ خوانی اور ملازمت کا سبب بھی قائم ہی بنے۔ (تذکرہ ہندی، ص180) لیکن شکر تال کی جنگ کے بعد 1772 میں قائم کو پھر دربدری اختیار کرنی پڑی۔ یہ محفل اجڑنے کے بعد قائم نے چند سال لکھنؤ میں قیام کیا اور رام پور آ گئے۔ رام پور کے قیام کے دوران بھی قائم نے ایک بار لکھنؤ کا سفر کیا جہاں سلیمان شکوہ کی سفارش اور راجہ ٹکیت رائے کے دستخط سے اپنا روزینہ اور جائداد بحال کرا کے واپس رام پور آئے جہاں موت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ مصحفی کے مطابق قائم کی موت کی خبر سے شہر شہر میں انتشار پھیل گیا۔ جرأت نے تاریخ وفات کہی:

جب سیل فنا ملک حوادث میں بہی آ کر ناگاہ
قائم کے جوتن کی تھی عمارت سوڈھی لی زیست نے راہ
جرات نے کہی رو کے یہ تاریخ وفات یکتائی کے ساتھ
''قائم بنیاد شعر ہندی نہ رہی کیا کہیے اب آہ''

مولوی عبدالحق نے آخری مصرعے کے اعداد (1707) میں یکتائی کا ایک (1) اضافہ کر کے 1708ھ بمطابق 1793 برآمد کیے۔

قائم کو فن کے اعتبار سے بھی بہت سے امتیازات اور اولیتیں حاصل ہیں۔ قائم نہ صرف غزل کے میدان میں میر اور سودا کے ہمسر ہیں بلکہ ان کے شاگردوں کا سلسلہ اردو شعرا کے ممتاز اور اہم شعرا کا سلسلہ ہے۔ قائم کے شاگرد شاہ محمدی مائل، مائل کے شاگرد شاہ نصیر، شاہ نصیر کے شاگرد ذوق اور مومن کے سلسلے سے یہ شجرہ داغ، آزاد اور اقبال تک پہنچتا ہے۔ اردو شعرا کی تاریخ میں دوسرا کوئی ایسا نام موجود نہیں ہے جس کے شاگردوں کی ایسی کہکشاں موجود ہو۔

قائم کا امتیاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے اردو شعرا کے تذکروں کی ابتدا کی اور تذکرہ نگاری کی داغ بیل ڈالی۔ قائم نے بجا طور پر دعویٰ کیا ہے کہ وہ اردو شعرا کا پہلا تذکرہ لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے تذکرے کے دیباچے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابھی تک اردو شعرا کے متعلق ایک سطر نہیں لکھی گئی۔ امتیاز علی عرشی کا خیال ہے کہ قائم نے اپنا تذکرہ بیاض کی صورت میں مرتب کیا تھا۔ اس بیاض کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلی تاریخ 1157ھ بمطابق 1744 ملتی ہے اس وقت ریختہ گو شعرا کا کوئی تذکرہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ 1167ھ بمطابق 1754 میں احمد شاہ کے معزول ہو جانے اور عالمگیر ثانی کے تخت نشیں ہونے کے بعد اس بیاض نے تذکرے کی شکل اختیار کر لی اور مصنف نے اس کا تاریخی نام 'مخزن نکات' رکھا۔ (بحوالہ دستور الفصاحت، ص 59)

اس لحاظ سے قائم کا دعویٰ درست ہے۔ ورنہ تکمیل کے لحاظ سے اس تذکرے کے مکمل ہونے سے قبل 1752 دکن میں دو تذکرے ''تحفۃ الشعرا'' اور 'گلشن گفتار' اور شمالی ہند میں 'نکات الشعرا' مرتب کیے جا چکے تھے۔ اولیت کا دعویٰ میر نے بھی 'نکات الشعرا' میں کیا ہے لیکن خاکسار کے ترجمے میں میر کا بیان ہی ان کے دعوے کی تردید کرتا ہے جہاں وہ تذکرہ 'معشوق چہل سالہ' کا پتہ دیتے ہیں۔ اس لیے قائم کے تذکرے کی اولیت کے دعوے کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ قائم کے تذکرہ 'مخزن نکات' کی اولیت کے سلسلے میں مندرجہ ذیل نکات پیش کیے جا سکتے ہیں:

1 قائم نے ولی اللہ اشتیاق کے متعلق لکھا ہے کہ سات سال قبل ان کا انتقال ہو گیا ہے۔

امتیاز علی عرشی نے 'نشترِ عشق' اور صبح گلشن کے حوالے سے اشتیاق کی رحلت 1737 متعین کی ہے۔ لہٰذا قائم نے اشتیاق کا ترجمہ 1744 میں لکھا۔

2 قائم نے آفتاب رائے رسوا کے متعلق اطلاع دی ہے کہ چند ماہ قبل ان کا انتقال ہو گیا۔ عرشی صاحب نے بعض شہادتوں کی مدد سے رسوا کا سال وفات 1748 طے کیا ہے۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ رسوا کا ترجمہ مارچ/اپریل 1748 میں درج کیا گیا ہے۔

3 'نکات الشعرا' میں اور 'تذکرہ ریختہ گویاں' میں دلاور خاں بیرنگ کا ذکر کیا گیا ہے۔ میر نے یہ بھی صراحت کر دی ہے کہ یہ پہلے ہم رنگ تخلص کرتے تھے فی الحال 'ہم رنگ' کو ترک کر کے بے رنگ اختیار کیا ہے۔ قائم نے دلاور خاں کا تخلص 'ہم رنگ' لکھا ہے ظاہر قائم نے دلاور خاں کا ترجمہ میر سے قبل لکھا ہے۔

4 قائم نے حشمت کے متعلق لکھا ہے کہ دو سال قبل محمد علی حشمت، مراد آباد کی جنگ میں قطب الدین خاں کے ہمراہ مارا گیا۔ یہ جنگ نومبر 1749 کا واقعہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ قائم نے حشمت کا ترجمہ 1751 میں تحریر کیا۔

اولیت کا دعویٰ ان شواہد کی بنا پر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے لیکن تذکرے میں مزید اضافے اور تبدیلیاں جاری رہیں۔ آبرو کے ترجمے میں معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو حیات ہیں لیکن میر کے ترجمے میں اطلاع ملتی ہے کہ خان آرزو کی رحلت ہو چکی ہے۔ خان آرزو کا انتقال 26/جنوری 1756 کو ہوا۔ ظاہر ہے میر کا احوال 1756 کے بعد لکھا گیا ہے۔ 'مخزن نکات' میں خواجہ میر درد کی تصنیف 'صحیفہ واردات' کا ذکر ملتا ہے جو 1759 میں شائع ہوئی۔

قائم کا تذکرہ اپنی معنویت اور اہمیت کے لحاظ سے بھی منفرد ہے۔ پہلی بار قائم نے اپنے تذکرے میں طبقات قائم کیے ہیں۔ گردیزی نے حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی ہے لیکن میر نے کسی طرح کی کوئی ترتیب مد نظر نہیں رکھی اسی لیے ان کے تذکرے میں افراتفری کا انداز ہے۔ قائم نے 'مخزن نکات' میں مندرجہ ذیل تین طبقات قائم کیے ہیں:

1 طبقہ اول— دربیان اشعار شعرائے متقدمین۔

2 طبقہ دوم— درذکرکلام سخنوران متوسطین۔

3 طبقہ سوم— دربیان اشعارواحوال سخن طرازانِ متاخرین۔

طبقہ اول میں سعدی، خسرو، ولی اور افضل سمیت اٹھائیس شعرا کا ذکر ہے اور جعفر زٹلی کے ذکر پر اختتام ہوتا ہے۔ طبقہ دوم میں مبارک آبرو، خان آرزو، ٹیک چند بہار اور آنند رام مخلص کے ساتھ کمترین کا بھی ذکر ہے۔ اس طبقے میں بتیس (32) شعرا کا ذکر ہے۔ طبقہ سوم میں ساٹھ شعرا کا ذکر شمس الدین فقیر سے شروع ہو کر قائم کے اپنے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔ ہر طبقے کی ابتدا میں قائم کے تنقید نظریات بھی شامل ہیں جن کی صرف تاریخی اہمیت ہے۔ لیکن تذکرے کی طبقہ بندی قائم کے تاریخی شعور کی غماز ہے۔ اشپرنگر نے اس طبقہ سازی کو بہت اہمیت دی ہے اور ہندوستانی ادبی تاریخ کا اہم ترین واقعہ بتایا ہے۔ سید عبداللہ کا خیال ہے کہ:

''تذکرہ نگاری میں یہ تاریخی احساس لٹریری ہسٹری کی طرف اس رجحان کا پہلا قدم ہے جو آگے چل کر 'آب حیات' کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔'' (شعرائے اردو کے تذکرے، ص 43)

محمد حسین آزاد نے ادوار متعین کرنا قائم کے تذکرے سے ہی سیکھا ہے یہ اور بات ہے کہ اپنے اکثر ماخذوں کی طرح 'مخزن نکات' کا بھی حوالہ نہیں دیا۔

قائم نے نہ صرف طبقات متعین کیے ہیں بلکہ میر کی طرح دشنام طرازی نہیں کی اور عمداً کردار کشی سے گریز کیا ہے۔ قائم نے نہ میر کی طرح کسی کو اوباش لکھا ہے نہ آزاد کی طرح یہ اطلاع دی ہے کہ مرزا مظہر جان جاں نے گھر میں دھوبن ڈال رکھی تھی۔

'مخزن نکات' میں بعض فاش غلطیاں بھی موجود ہیں۔ قائم نے ریختہ کو سعدی شیرازی سے منسوب کیا ہے۔ میر نے اپنے تذکرے میں اصلاح کی کوشش کی اور بتایا کہ یہ سعدی دکنی ہیں (حالاں کہ تحقیق یہ ہے کہ سعدی باشندہ دکن بھی نہیں ہے اور بلکہ کاکوری کے ساکن تھے۔ حافظ محمد حیدر کاکوروی نے ان کی وفات کاکوری میں 10 راگست 1594 بتائی ہے۔ (تذکرہ مشاہیر کاکوروی، ص 189، بحوالہ حنیف نقوی)

حنیف نقوی کا خیال ہے کہ قائم کی تحریر اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ وقیع ہے۔

قطع نظر اس سے بحیثیت مجموعی دکنی شاعروں کے متعلق جس قدر معلومات 'مخزن نکات' میں بہم پہنچائی گئی ہیں 'نکات الشعرا' اور تذکرہ گردیزی ان کی فراہمی سے قاصر ہیں۔

'مخزن نکات' کی دوسری نمایاں اور قابل ذکر خصوصیت اختصار الفاظ و وسعت معانی کا امتزاج ہے اور طرز بیان کی متانت اور سادگی ہے.... ان مثالوں کو سامنے رکھ کر سیرت نگار کی حیثیت سے قائم کے مرتبے کا تعین زیادہ دشوار نہیں ہے۔ انھوں نے جس خوبی کے ساتھ شعرا کے محاسن سیرت اور معائب اخلاق کا احاطہ کیا ہے اس سے ان کی غیر معمولی قوت مشاہدہ اور ژرف نگاہی کے پہلو بہ پہلو ان کی فراخدلی اور صاف گوئی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہی خصوصیت ان کے یہاں فن کے حسن و قبح سے متعلق بحثوں میں بھی کارفرما رہی ہے۔ (شعرائے اردو کے تذکرے، ص 263)

بعض تراجم کی بنیاد پر بھی 'مخزن نکات' اولیت اور اہمیت حاصل ہے۔ مثلاً 'مخزن نکات' سے ہی پہلی بار ولی دکنی کی دلی میں آمد کی اطلاع ملتی ہے۔ قائم کے مطابق جلوس عالمگیری کے چوالیسویں (44) سال 1200 ہجری میں ولی دکنی نے سید ابوالمعانی کے ہمراہ دلی کا سفر کیا اور شاہ سعداللہ گلشن سے ملاقات کی جنھوں نے ولی کو زبان ریختہ میں شعر کہنے کا مشورہ دیا اور تعلیماً یہ مطلع موزوں کر کے ولی کے حوالے کیا:

خوبی اعجاز حسن یار گر افشا کروں
بے تکلف صفحہ کاغذ ید بیضا کروں

قائم نے پہلی بار اپنے تذکرے میں دکنی شاعری کو بھی اہمیت دی اور دکنی زبان کے نامانوس الفاظ کو زبان دکن کے مطابق درست بتایا۔ (میر اپنے تذکرے میں دکنی شاعری کو بے رتبہ اور غیر مربوط کہتے ہیں۔) 'مخزن نکات' میں ہی قائم پہلی بار اپنے استاد سودا کو ملک الشعرا کے خطاب سے نوازتے ہیں اور بعد میں یہ روایت یہاں تک پہنچتی ہے کہ عبدالغفور نساخ نے 'سخن شعرا' میں لکھ دیا کہ سودا کو ملک الشعرا کا خطاب آصف الدولہ نے عطا کیا تھا۔ قائم کے ہی تذکرے سے پہلی بار سودا کے صاحب زادے 'مجذوب' کے وجود سے آگاہی ہوتی ہے اور میر درد کی تصنیف 'صحیفہ درد' کی اشاعت کی اطلاع بھی 'مخزن نکات' سے ہی ملتی ہے۔ باقی تمام تذکرہ نگاروں نے

وہیں سے نقل کی ہے۔

قائم نے اپنے تذکرے میں زیادہ وسعت قلبی اور بلند کرداری کا ثبوت اس معنی میں دیا ہے کہ نہ اپنے گروہ کی جانب داری کی ہے نہ مخالفوں کی پگڑی اچھالی ہے۔ ہدایت سے قائم کی شکر رنجی کا ذکر پہلے آچکا ہے لیکن قائم نے تذکرے میں ہدایت کے استغنا اور بلند کرداری کی تحسین کی ہے جب کہ یہ اچھا موقعہ تھا جب وہ ہدایت سے انتقام لے سکتے تھے جیسا کہ ان کے انتقال کے گیارہ سال بعد قدرت اللہ قاسم نے 'مجموعہ نغز' میں کیا۔

قائم کی وسعت نظری کی ایک اور مثال اس وقت ملتی ہے جب ہمیں ان کے تذکرے میں کئی بیاضوں اور اشخاص کی مدد کا اعتراف کرتے ہیں۔ جب کہ ان کے ہم عصر تذکرہ نگار میر تقی میر اور گردیزی اخلاقی جرأت کی کمی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکے۔ قائم نے دکنی شاعر 'محقق' کے ترجمے میں بیاض طالب کا حوالہ دیا ہے۔ بھید کے ذیل میں بیاض عزلت کا حوالہ دیا ہے۔ شرف الدین علی پیام کے ترجمے میں خان آرزو کے فارسی تذکرے 'مجمع النفائس' کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان بیاضوں کے علاوہ عاقل کی معاونت کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

تذکرے سے قطع نظر قائم نے تقریباً تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصائد، مراثی، مثنویات، رباعیات اور غزل لیکن قائم کی شناخت ان کی غزلیں اور مثنویات ہیں۔ قائم کی مثنویوں کی داد میر حسن نے بھی اپنے تذکرے میں دی ہے۔ قائم کی موجودہ مثنویات کی تعداد چھبیس (26) ہے۔ مولوی شاہد حسن نبیرۂ قائم نے غیر مطبوعہ مثنوی 'جاہ وجلال' کا ایک قلمی نسخہ بھی راقم الحروف کو دکھایا تھا۔ اس طرح مثنویات کی تعداد ستائیس (27) ہوجاتی ہے۔ (مثنوی 'جاہ وجلال' کوثر چاند پوری اپنے مقدمے کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے لیکن عمر نے وفا نہ کی)۔ اب یہ مثنوی کسی طرح دستیاب نہیں ہے۔ مثنوی 'جذب الفت' یا 'عشق درویش'، 'مثنوی رمز الصلوٰۃ' اور مثنوی 'حیرت افزا' قائم کی طویل مثنویات ہیں۔ مثنویات کئی سو اشعار پر مشتمل ہیں۔ قائم کی قادر الکلامی اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ مثنوی 'حیرت افزا' صرف ایک شب میں مکمل کر دی تھی اس مثنوی میں چار سو ستاسی (487) اشعار ہیں۔ باقی تمام مثنویات مختصر ہیں۔ دو مثنویات 'ہجو شیخ' اور

'زن اوباش' صرف چار چار اشعار پر مشتمل ہیں۔ کچھ مثنویاں محض دشنام طرازی ہیں۔ کچھ میں فحش الفاظ کی بھرمار ہے۔ مثنوی ہجو خارش، ہجو گوزی، ہجو حجام اور ہجو پتنگ باز بے حد فحش ہیں اور ان پر گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ ایک مختصر سی مثنوی 'زن واوباش' دلچسپ ہے:

حکایت ہے اک زن سے یوں یادگار
کہ تھی سخت اوباش اور ہرزہ کار
کیا اپنی آچا سے ان نے سوال
کہ ہیں مرد پر چار عورت حلال
ہے کیا قہر چار عورت اور ایک مرد
کہا ان نے سن اس کو بھر آہ سرد
خدا اور پیمبر جو تھا مرد تھا
ہمارا وہاں کون ہمدرد تھا

پچھتر (75) اشعار پر مشتمل 'مثنوی در صفت بندوق' میں قائم نے اپنی قوت تخیل کے جوہر دکھائے ہیں۔ یہ ان کی شاہ کار مثنوی ہے:

خصوصاً وضع کی ہے جن نے بندوق
بنایا ہے عجب صورت کا معشوق
کہ جب چھاتی سے کوئی اس کو لگاوے
غم اعدا سے جی تسکین پاوے
مٹھاس اس کے لبوں میں یہ ہے رکھی
اڑے پھر بیٹھ کر جس پر نہ مکھی
بہ ظاہر گرچہ وہ محبوب وش ہے
پہ عاشق کی طرح نت نالہ کش ہے

اس کے علاوہ مثنوی 'قضا وقدر' اور مثنوی 'شدت سرما' قائم کی بہترین مثنویاں ہیں۔

مثنوی 'شدت سرما' 58 اشعار پر مشتمل لاجواب مثنوی ہے۔ عرصہ دراز تک یہ مثنوی سودا سے منسوب رہی ہے۔ قائم نے اس مثنوی میں خوب مبالغہ آرائی کی ہے:

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
جتنا عالم تھا کا شمیر ہوا
بلکہ کہیے کہ زمہریر ہوا
ان دنوں چرخ پر نہیں ہے مہر
گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر

سردی اتنی شدید ہے کہ آگ بھی ٹھٹھرتی ہے۔ تمام لوگ آتش پرست (پارسی) ہوگئے ہیں۔ شیخ جی بھی مہ وشوں سے آنکھیں سینکتے ہیں۔ سقہ کہتا ہے کہ اگر پانی درکار ہے تو مشک کو چیر کو نکال لیجیے۔ حلوائی نے قند بنائی تھی لیکن اولے بن گئے ہیں جو کوئی مرتا ہے ٹھنڈ سے مرتا ہے۔ مقطع میں فرماتے ہیں:

قائم آخر ہے سردی کا مذکور
شعر بھی گر خنک رہے معذور
آگے جاتا نہیں ہے اب بولا
ہوگئی ہے زبان بھی اولا

قائم کی دو مثنویات 'شدت سرما' اور 'ہجو حجام' کی بازگشت مصحفی کی دو مثنویوں میں سنائی دیتی ہے۔ دونوں مثنویات کے عنوان بھی یہی ہیں اور اکثر مصرعے ٹکراتے ہیں۔

قائم کی رباعیات کی بھی کافی پذیرائی ہوئی ہے۔ مبتلا میرٹھی نے بڑے شاعرانہ انداز میں طبقات سخن میں رباعیات کی تحسین کی ہے۔ 'ان کی رباعیوں کے چاروں مصرعے چہار عناصر کی طرح مخلوط اور گیسوئے یار کی طرح مرتبط ہیں۔ (طبقات سخن، ص 382)۔ مبتلا میرٹھی کا قول کسی حد تک صحیح ہے۔ جہاں قائم پھکڑ پن پر نہیں اترتے اور رباعی کو ہتھیار نہیں بناتے وہ کامیاب ہیں:

شیطان نہ تھا شیخ کی خو سے آگاہ
آیا وہ دغا دینے انھوں کو آگاہ
بالعکس انھیں دیکھ وہ یہ کہتا بھاگا
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

گو عمر میر گزری ہے لوہو پیتے
پر کیا کٹی ایک دن تھے سو کیوں ہیں جیتے
تسکین ہے اب تو ہر طرح سے لیکن
ہوتی نہ اگر موت تو کیوں کر جیتے

قائم امروہہ میں قاضی شہر مقرر ہوئے تھے لیکن سابق قاضی نے عہدہ سنبھالنے نہ دیا۔ قائم نے ایک طویل مخمس بھی قاضی کی ہجو میں لکھا ہے۔ چند رباعیاں بھی اسی حادثے کی یادگار ہیں:

قاضی شیخی ہے یاں تو گاڑھی تیری
تدبیر پہ اور ہم نے کاڑھی تیری
گر حشر میں دامن کو نہ پہنچے گا ہاتھ
واللہ کہ میں ہوں اور ڈاڑھی تیری

بعض ہجویہ رباعیوں میں قائم گالیوں پر اتر آتے ہیں لیکن جہاں وہ سنجیدگی اختیار کرتے ہیں ان کی رباعیاں اعلیٰ درجے کی معلوم ہوتی ہیں:

اے وہ کہ ہے بزم کی لطافت تجھ سے
صحبت میں ہے آئین ظرافت تجھ سے
تکلیف ضیافت کی کرے ہے تو عبث
ہر لحظہ ہے طبع کی ضیافت تجھ سے
بس قبلہ نہ پیچ وتاب دیجیے مجھ کو
دینا ہے جو کچھ جواب دیجیے مجھ کو

کچھ اور نہیں جو پاس دینے کو مرے
ہے منھ میں زبان، جواب دیجیے مجھ کو

یوں تو قائم کو تمام اصناف شعری پر قدرت حاصل ہے لیکن ان کی اصلی شناخت غزل ہے۔ احد علی یکتا نے پہلی بار قائم کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اپنے عصروں کے برعکس قائم کی غزل غزل رہتی ہے اور قصیدہ قصیدہ۔ (دستور الفصاحت، ص 44)۔ یکتا کی مراد یہ ہے کہ قائم نے تمام اصناف کے فنی تقاضوں کی پاسداری کی ہے۔ مصحفی نے قائم کی غزل کو مرزا سودا کے دوش بدوش اور بعض مقامات پر بہتر پایا۔ تقریباً تمام قدیم تذکروں میں قائم کی غزل کی تحسین کی گئی ہے لیکن ان کے کلام میں ایک خصوصیت ایسی ہے جس کی طرف کم توجہ کی گئی ہے یعنی قائم کے اکثر اشعار میں ازبر ہو جانے اور ضرب المثل بن جانے کی قوت وصلاحیت موجود ہے۔ قائم کے ایسے اشعار اکثر دوسرے شعرا سے منسوب کر دیے گئے۔ تقریباً تمام ضرب المثل اشعار اور مثنویات سودا کے کلام میں شامل کر دی گئیں۔ کچھ ضرب المثل اشعار:

یونہی جو یہ چشم تر ہیں گے
عالم کو خراب کر رہیں گے

حال دل صبح وشام کیا کہیے
ایک قصہ مدام کیا کہیے

کر دیا اک جہاں تہہ وبالا
عشق کی دھوم دھام کیا کہیے

کر بھروسہ مرا نہ تو قائم
صبح کے وقت کا چراغ ہوں میں

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

چپ سی کچھ لگ گئی اسے جو کوئی
تجھ سے اک بار ہم کلام ہوا

آپ جو کچھ قرار کرتے ہیں
کہیے ہم اعتبار کرتے ہیں

چلیے قائم کہ رفتگاں اپنا
دیر سے انتظار کرتے ہیں

یار اگر چاہتا ہے دے قائم
جان کچھ دل سے تو زیاد نہیں

قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

مندرجہ بالا اشعار میں سے اکثر سہل ممتنع کی لازوال مثالیں ہیں اس طرح کی دوسری کوئی مثال غالب کے علاوہ اردو شاعری میں موجود نہیں ہے۔ جمیل جالبی نے میر وسودا کے مقابلے میں ایک مصرعے کا شاعر کہا ہے (تاریخ ادب اردو، ص780) اور قائم کے کمال وکلام کے زیادہ قائل نہیں معلوم ہوئے لیکن وہ بھی قائم کی غزل کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''ایک بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ احساس اور معنی آفرینی دونوں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اس دور میں قائم وہ اکیلا شاعر ہے جس کے ہاں میر وسودا کے مشترک امکان اور دونوں استادان فن کا لطف کلام ایک ساتھ شامل ہے۔ یہ وہی رنگ کلام ہے جسے مصحفی نے ملا کر ایک کرنے کی کوشش میں اپنے مخصوص رنگ سخن کو جنم دیا۔ اسی لیے قائم نہ صرف اپنے دور میں ایک ممتاز شاعر رہے بلکہ آئندہ دور میں بھی ان کی اہمیت قائم رہیں۔ میر وسودا کی طرح قائم کا اثر بھی غالب، مومن، حالی اور ہمارے دوسرے شعرا نے قبول کیا۔ قائم کے عشقیہ تجربات اور تخلیقی صلاحیت معمولی درجے کی نہیں تھی.......... میر سے قائم مات ضرور کھاتے ہیں لیکن ان کے اثرات کے بادل اردو شاعری کی روایت پر مصحفی سے لے کر آج تک برستے رہے ہیں۔'' (تاریخ ادب اردو، ص782)

قائم نے غزل میں پہلی بار ایسے مضامین کو جگہ دی جو قائم سے قبل اردو غزل میں نہیں پائے جاتے تھے مثلاً بے دماغی اور کج کلاہی کا مضمون جس طرح قائم نے برتا ہے باید وشاید:

بے دماغی سے نہ اس تک دل رنجور گیا
مرتبہ عشق کا یاں حسن کب دور گیا

دوں ہم سری میں بیٹھ کے کس ناسزا کے ساتھ
یاں بحث کا دماغ نہیں ہے خدا کے ساتھ

نالوں سے عندلیب کے آیا ہے جی تنگ
کن نے میرے مزار پر لاکر چڑھائے گل

وہ دن گئے کہ اٹھاتا تھا بار نکہت گل
ہے بے دماغی دل ان دنوں گراں مجھ کو

یہ نازک مزاجی کے مضامین برائے بہت نہیں ہیں کئی تذکرہ نگاروں نے قائم کی بے دماغی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ روایتی مضامین بھی قائم کی غزل میں کافی مل جاتے ہیں۔ امرد پرستی اس عہد کا عام موضوع تھی۔ اٹھارہویں صدی کے ہر شاعر کے کلام میں کم وبیش اس طرح کے اشعار مل جاتے ہیں۔ قائم کے کلام میں اس طرح کے اشعار کی تعداد کم ہے لیکن فرسودہ موضوع پر بھی قائم نیا شعر کہہ جاتے ہیں:

خوش ہوں میں اتنا امارد سے کہ اب رب کریم
دیجیو حور کے بدلے میں بھی غلماں مجھ کو

اس موضوع پر کچھ روایتی اشعار بھی قائم کے کلام میں مل جاتے ہیں:

کسی سپاہی پسر کو نہ دیجو دل قائم
کہ اہل فن کا ہے عالم میں مغتنم جینا

ان خوش چھبوں کی ہائے رے یہ تنگ پوشیاں
ذرہ نہ کسمسائے کہ چولی مسک گئی

قائم کے ہم عصروں نے قائم کی حسن پرستی کا بہت ذکر کیا ہے۔ میر بھی ان خیرہ وطیرگی اور حسن پرستی کے گواہ ہیں۔ بعض اشعار بھی قائم کی حسن پرستی کے شاہد ہیں:

پھر صبح سے آشوب قیامت ہے جہاں میں
چہرے پہ ترے کن نے بنایا ہے یہ تل آج

تجھ پہ شب جاگے سے کیفیت جو کچھ آتی ہے صبح
حسن نورِ شمع کب اس طرح دکھلاتی ہے صبح

رشک کا ایک عجیب وغریب مضمون بھی قائم نے نظم کیا ہے:

تیں کی ہے کیوں یہ سیہ زلف سر گستاخ
کہ پاؤں پر ترے رکھتی ہے زلف سر گستاخ

بعض عشقیہ مضامین کے باوجود قائم کی غزل عشقیہ نہیں ہے:

سیکھے ہو کس سے سچ کہو پیارے یہ چال ڈھال
تم اک طرف چلو ہو تو تلوار اک طرف

آج آپ مرے حال پہ کرتے ہیں تاسّف
اشفاق، عنایات، کرم، مہر، تلطف

وہ باعث زیست شاید آجائے
اے جان تو جائیو ٹھہر کر

قائم کی غزل کا خاص موضوع تصوف، سماجی بے ثباتی اور شان وشوکت کی بے مائیگی ہیں۔ان موضوعات کے ڈانڈے تصوف سے ملتے ہیں۔قائم کی پسندیدگی کی وجہ بھی یہی ہے:

بناوے کوئی عمارت تو کس توقع پر
پڑا ہے قصر فریدوں بن آدمی سونا

بے ثباتی دنیا کے بعض مضامین سے قائم کی غزل بری طرح مجروح بھی ہوئی ہے:

کی وفا کس سے بھلا فاحشہ دنیا نے
ہے تجھے شوق جو اس قحبہ کی دامادی کا

کھائیو مت لولی دنیا کی جوشش پر فریب
ایک دن ایسی ہی ہم سے گرم یہ بد ذات تھی

آج ناداں حسن پر جس تن کے تو مغرور ہے
کل وہ طعمہ کرم کا ہے اور غذائے مور ہے

قائم کی غزل کا تابناک پہلو یہ ہے کہ غالب نے کئی مقام پر قائم کی غزل سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔غالب کے اردو اور فارسی کے کلام میں سو سے زیادہ اشعار ایسے ہیں جن کا مرکزی خیال قائم کے اشعار سے ماخوذ ہے یا غالب نے تصرف کیا ہے یا غالب کو تحریک ملی ہے۔المیہ یہ ہے کہ غالب نے اعتراف صرف ایک مقام پر کیا ہے اور وہ بھی قائم کا نام لیے بغیر:

7 مارچ 1864 کے مکتوب بنام غلام غوث بے خبر میں لکھتے ہیں:

''جناب عالی!

ایک شعر کسی استاد کا مدت سے تحویل حافظہ میں چلا آتا ہے

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کھا
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ من گیا

میں نے از رہ تصرف اس شعر کی صورت بدل ڈالی:

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

تم اخوان الصفا میں سے ہو تمھاری آزردگی اوروں کی مہربانی سے خوش تر ہے۔''

(غالب کے خطوط: مرتبہ: خلیق انجم، دوسری جلد، ص 658)

ایک دوسرے خط بنام چودھری عبدالغفور (جولائی 1863) میں قائم کے مندرجہ ذیل شعر کا حوالہ میر اور سودا کے ساتھ دیتے ہیں:

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں
ہے تو ناداں مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

دونوں خطوط مختلف موضوعات پر ہیں۔ پہلے خط میں ضمناً قائم کا ذکر آگیا ہے۔ دوسرے خط میں اہل ہند شعرا کی ستائش مقصود ہے۔ اور قائم کے شعر کا حوالہ میر اور مرزا کے ساتھ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے غالب نے قائم کا شمار سودا اور میر کے ساتھ کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے قائم کے جتنے اشعار پر تصرف کیا ہے اتنے اشعار تو بیدل کے بھی غالب کے تصرف ہی نہیں رہے۔ سب سے پہلے قائم کا ایک فارسی شعر جس کی شکل بدل کر غالب نے اس شعر کے شہرت آسمان پر پہنچا دی ہے:

قائم امروز اگر قدر سخن نیست چہ شد
آخر ایں جنس بیک روز گراں می گردد

غالب کا شعر سب کے ذہنوں میں محفوظ ہے:

شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن

ایں مے از قحط خریدارے کہن خواہد شدن

اب قائم اور غالب کے کچھ قریب المضمونی اشعار بغیر کسی تمہید کے پیش کرتا ہوں:

غالب نے قائم کے بہترین اشعار سے ہی فیض نہیں اٹھایا بلکہ بعض بے نمک اشعار پر بھی تصرف کیا:

غالب کے ایک بہت مشہور قطعے کے دو اشعار ہو بہو قائم کے اشعار سے ٹکرا گئے ہیں:

(محولہ بالا اشعار میں سے بعض متداول دیوان غالب میں موجود نہیں ہیں اور نسخہ حمیدیہ سے لیے گئے ہیں۔) جمیل جالبی کا یہ خیال صحیح ہے کہ قائم کے فیض کے بادل آج تک برس رہا ہے۔ غالب ہی نہیں مومن سے فیض تک لاتعداد شعرا کے کلام میں قائم کا فیضان نظر آتا ہے۔ مثلاً مومن کا یہ شعر:

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی

آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

قائم کے اس مطلع کا پرتو معلوم ہوتا ہے:

کیجیے گا پھر صلح دل بے مدعا کے ساتھ

آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

ہمارے عہد کے دو بڑے شعرا فراق گورکھپوری اور فیض کے کلام پر بھی قائم کا بہت واضح عکس نظر آتا ہے۔ شمیم حنفی صاحب سے روایت ہے کہ فراق گورکھپوری ہمیشہ قائم کا دیوان سرہانے رکھتے تھے۔ مجنوں گورکھپوری نے بھی ایک مضمون میں قائم کے شعر پر فراق کے سر دھننے کی بات کہی ہے۔ قائم کی ایک خصوصیت ان کی ترکیب سازی بھی ہے۔ ان کی وضع کردہ لاتعداد تراکیب بعض جدید شعرا کے یہاں بھی نظر آجاتی ہیں۔ دو تراکیب چادر مہتاب اور گنبد دستار حفیظ جونپوری اور جدید شاعر محسن احسان نے بھی استعمال کی ہیں:

دن کو اک نور برستا ہے مری تربت پر

رات کو چادر مہتاب تنی ہوتی ہے

حفیظ جونپوری

دراز قامتی دوستاں سے جلنے لگا
وہ سر پہ گنبدِ دستار رکھ کے چلنے لگا

محسن احسان

اردو غزل پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اردو غزل نے تمام تلمیحات، تشبیہات اور استعارات عرب اور عجم سے اخذ کیے ہیں کسی حد تک یہ الزام جائز بھی ہے۔ قائم کے کلام میں بھی صنعت ملمع کی بہت سی مثالیں ہیں جن میں ایک مصرعہ عربی ہے۔ اس کے باوجود قائم کی شاعری میں بالعموم اور ان کی غزل میں بالخصوص ہندوستانی عناصر کی فراوانی ہے۔ ان کے کلام میں ہندوستانی تہذیب، مذاہب اور ہندی الفاظ کی جھلک کافی نظر آتی ہے۔ قائم نے اپنی ایک مشہور غزل 'شراب اوروں نے پی اور خمار ہم کھینچا'' میں دیوناگری رسم الخط کا بہت دلچسپ حوالہ دیا ہے:

بخط ہند ہے قائم گویا مرا دیواں
زبس کہ لکھ کے میں ہر بیت پر قلم کھینچا

ایک شعر میں دسہرے کے تیوہار کی تلمیحات استعمال کی ہیں:

دل مرا تم کو تو لنکا ہے دسہرے کے بتاں
فتح ہے سال بھر اس کی جو اسے لوٹے گا

بعض غزلوں میں ہندی کے ثقیل الفاظ اور قافیے بھی نظم کیے ہیں:

بل بے زہرہ کہ میں سمنکھ ہوں نگہ سے تیری
ہے یہ وہ تیر، ہو لوہے کی سپر سے باہر
وہ نخل خزاں دیدہ ہوں اس دشت میں جس کے
سائے میں کسی پنچھی نے بسرام نہ پایا
کیا بتیا تجھے یہیں دینی ہے اے عزیز
اتنا پڑا ہے ملک خدا جا کے مر کہیں

ایک شعر میں ہندی انداز میں 'ان' لگا کر مطلب برآمد کیا ہے:

جلوں کو رونے سے ہو سوز عشق کا دونا
جو چھڑکیں آب تو آتش ہو ان بجھا چونا

ایک مکمل غزل ہندی ردیف میں ہے:

قاصد کو دے نہ اے دل اس گلبدن کی پاتی
چل خود ہی لے چلیں ہم اپنے سجن کی پاتی

قائم لکھا تھا اس نے آنے کا شب کو وعدہ
سو دن میں دیکھی سو دم، اس سیم تن کی پاتی

ان الفاظ کے علاوہ قائم نے لاتعداد ہندی الفاظ اپنی غزل میں استعمال کیے ہیں۔ چتون، سج، دھا، اونا، لھگ، سمکھ، نت درس پتال، اکاس، انچھر وغیرہ وغیرہ۔اس کے علاوہ قائم نے زبان وبیان کی سطح پر بھی بعض آزادیاں روا رکھی ہیں۔ مثلاً وہ گویا کی یہ ظاہر کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ جمع واحد کے سلسلے میں بعض آزادیاں روا رکھتے ہیں۔گلی کی جمع گلیں گالی کی جمع گالیں نظم کرتے ہیں قوافی میں صوتی آہنگ کو ترجیح دی ہے۔ میر نے ایک غزل میں 'آزمائی دل' اور 'نمائی دل' کا قافیہ لگائیے دل باندھا ہے:

گہ رنگ ہے چلا ہے، در بو ہے تو ہوا ہے
کہہ میر اس چمن میں کس سے لگائیے دل

سودا نے 'صبر کر کے ہم' کا قافیہ 'اس قدر کہ ہم' باندھا ہے:

قائم نے بھی اسی انداز میں 'تماشائی شمع' اور 'انجمن آرائی شمع' کا قافیہ 'منگوائیے شمع' باندھا ہے۔ ممکن ہے ان کے عہد میں جائز ہو:

شیخ جی رات اندھیری میں تم آئے ہو یہاں
آپ کے واسطے گرامر ہو منگوائیے شمع

قائم نے اپنی غزل میں سنگلاخ زمینوں کی روایت کو بھی خوب فروغ دیا۔ اتنی سنگلاخ زمینیں اس عہد کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ملتیں۔ بعد میں یہ روایت شاہ نصیر کے یہاں نظر آتی ہے:

آنکھیں یہ بحرِ خوں ہیں اور آنسو نہنگ سرخ
تا پھر وہ تازہ ہوئے مثل یک نہ شد دوشد
اس باغ میں کبھی نہ ہوا برگ کاہ سبز
پھر بے قرار ہے ہوس سوختن ہنوز
تو کیا میں جاؤں گا دینے بہشت میں آتش
بے ربطیاں ہیں ثمرۂ ہنگام اشتیاق

قائم کی استادی مسلم ہے۔ انھوں نے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی۔ انھوں نے بہت سے قصائد بھی لکھے جن میں سے ایک قصیدہ اپنے استاد سودا کی مدح میں لکھا ہے۔ قصیدہ 'درنعت سرور کائنات' اور 'نقبت جناب مرتضوی کے علاوہ آصف الدولہ، سلیمان شکوہ، میر بخشی ہندوستان، نواب نعمت اللہ خاں کے مدح میں لکھے قصیدوں میں شان وشکوہ اور بے پناہ زور تخیل ہے۔ ان میں مدح کی ندرت، تشبیب کی خوبصورتی اور گریز کی فن کاری موجود ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ان کے تمام قصائد میں بھی مکمل فنی احترام لازم رکھا گیا ہے۔

اتنی خوبیوں اور اعلیٰ درجے کی فن کارانہ صلاحیتوں کے باوجود اس مختلف الجہات شاعر پر بوجوہ مناسب توجہ نہ کی جاسکی۔ اگرچہ قائم پر کچھ تحقیقی کام بھی ہوا۔ اکادکا کتابچے بھی شائع ہوئے لیکن یہ عظیم فن کار ہم سے مزید توجہ کا متقاضی ہے۔

ذاکر حسین کالج
دہلی یونیورسٹی، دہلی
drkhalidalvi@gmail.com
09868181236

اردو کا طالب علم: شیخ نگینوی

محمد ارشد معروف بہ ڈاکٹر شیخ نگینوی کی پیدائش 11رجنوری 1973 کو نگینہ میں محمد راقم صاحب کے یہاں ہوئی۔ ابھی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ اپریل 1979 کو ایک حادثہ میں والد کا انتقال ہو گیا۔ مشرقی تہذیب کو اپنانے والی والدہ نے تمام جستجو، محنت اور مشقت کے ساتھ چھ بچوں کی مثالی پرورش کی اور سب کو تعلیمی زیور سے آراستہ کیا۔ محمد ارشد نے پرائمری درجات اردو میڈیم سے پڑھنے کے بعد چھٹی کلاس سے پوسٹ گریجویشن تک کامرس پڑھی۔ ادب اور اکاؤنٹس دو الگ سمت ہونے کے باوجود گھر میں والد نے ورثہ کے طور پر چھوڑی اردو کی کتابوں کے مطالعہ نے اردو سے وابستگی قائم رکھی۔ نویں کلاس سے ہی کالج میگزین میں مضامین لکھے اور ضلع سطحی مضمون نویسی مقابلوں میں شرکت کر انعام حاصل کیے۔

1989 میں نشتر خانقاہی کی زیرِ ادارت بجنور سے شائع روزانہ ''خبر جدید'' سے صحافتی زندگی کا آغاز کیا اور اپنا قلمی نام شیخ نگینوی رکھا۔ گوشوارہ رڑکی، وارتا مرادآباد، دنیا کی کھوج مرادآباد، سونے پہ سہاگہ دھام پور، عالمی جرائم دہلی، فیصل جدید دہلی، قومی آواز دہلی اور لکھنؤ سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ''جدید مرکز'' میں اعزازی نامہ نگار کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ کئی فیچر ایجنسی کے ذریعہ ادبی اور اصلاحی مضامین ملک کے مختلف اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات و رسائل اور آن لائن پورٹل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

2007 میں ''میڈیا پوسٹ'' نئی دہلی میں مدیر ادب بنائے جانے پر شیخ نگینوی کے تحریر کردہ ادبی مضامین، کتابوں پر تبصرے اور انٹرویو میڈیا پوسٹ کی زینت بنے۔ 2006 سے

صوبائی اور قومی اردو سیمناروں میں مقالہ نگار کی حیثیت سے شرکت کر ساٹھ سے زائد مقالے پیش کیے اور ان ادبی مضامین اور مقالات کا مجموعہ ''فیضانِ راقم'' کے نام سے 2015 میں شائع ہوا۔ دوسری کتاب ''دبستانِ بجنور'' 2015 میں اور تیسری کتاب ''دبستانِ بجنور جلد دوم'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے علاوہ ''دبستانِ بجنور جلد سوم'' ''مشاہیرِ نگینہ'' ''اختر الایمان کی ادبی خدمات'' ''رفعت سروش فن اور شخصیت'' ''علما ضلع بجنور'' کتابیں زیرِ ترتیب ہیں۔ اتر پردیش اردو اکادمی نے فیضانِ راقم پر 2015 میں پانچ ہزار کا انعام دیا ہے، یومِ عالمی اردو منتظمہ کمیٹی نئی دہلی نے قاضی عدیل عباسی عالمی اردو ایوارڈ 2016 اور ایم۔ اے۔ میموریل پبلک سوسائٹی نجیب آباد نے علامہ تاجور نجیب آبادی ایوارڈ 2016 کے اعزاز سے شیخ نگینوی کو نوازا ہے اس کے علاوہ کئی ادبی و سماجی تنظیموں سے اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر شیخ نگینوی روہیل کھنڈ کی ادبی سرگرمیوں کا حصہ ہونے کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا پر بھی سرگرم ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو نجیب آباد سے کئی بار خصوصی گفتگو نشر ہو چکی ہے۔ تاریخ ادب ضلع بجنور، صد سالہ صحافت ضلع بجنور، ڈائرکٹری امر اجالا، دہلی ساہتیہ ندیشالیہ، آل انڈیا پترکار کوش ممبئی مجلہ عالمی یومِ اردو نئی دہلی 2016 میں ڈاکٹر شیخ نگینوی کا نام و تعارف شامل ہے۔

ڈاکٹر ابو شہیم خاں

شعبۂ اردو

ڈاکٹر ایچ ایس گور سینٹرل یونیورسٹی،

ساگر، مدھیہ پردیش

❖❖❖

ضلع بجنور میں تذکرہ نگاری کی روایت

ڈاکٹر شیخ نگینوی

تذکرہ نگاری عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ذکر، یاد یاداشت، بیان، یادگار تاریخ، واقعات، سرگذشت اور سوانح عمری وغیرہ کے ہیں۔ لیکن عربی، فارسی اور اردو زبان میں اصطلاحاً اس لفظ کا استعمال ایک ایسی کتاب پر ہوتا ہے جس میں شاعر کے مختصراً حالات اور ان کا مختلف کلام بطور نمونہ درج ہو۔ سوانحی حالات کے تحت تذکرہ نگار شعراء کے نام اور تخلص، وطن اور جائے پیدائش و قیام، علمی و فنی استعداد، شاگردی و استادی کے سلسلے اور روابط، مزاج کی افتاد اور تصنیفی و تالیفی کارناموں کی نوعیت اور کلام کے معیار و مزاق کے متعلق ابتدائی قسم کی ضروری معلومات فراہم کرتا ہے۔ نمونہ کلام کے ذیل میں عام طور پر متفرق غزلوں متفرق اصناف سخن کے منتخب اشعار ریزہ و پیش کیے جاتے ہیں۔

تذکراتی ادب ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم جز ہے، تذکرہ نگاری بہ اعتبار فن ایک اعلیٰ و ارفع فن ہے، یہ نثری اصناف میں اپنا اہم مقام رکھتی ہے۔ بطور خاص اردو زبان و ادب کا مورخ تو ان سے استفادہ کیے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا، بلاشبہ انہی شعرائے اردو کے تذکروں کی بدولت ہمارے ادب میں سوانحی، تاریخی، تحقیقی اور تنقیدی شعور پیدا ہوا ہے۔

ادب میں تذکروں کی بڑی اہمیت ہے یہ تاریخ بھی ہے اور تنقید بھی۔ اگر تذکرے نہ ہو تے تو ہم بیش تر قدیم شعرا کے احوال و کلام سے ناواقف ہوتے۔ تذکروں کی بدولت ایسے بے شمار

شاعر تاریخ میں محفوظ ہو گئے ہیں جن کا کلام کتابی شکل میں موجود ہے اور نہ حالاتِ زندگی کا کسی کو علم ہے۔ تذکروں نے انہیں گمنام ہونے سے بچالیا ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے زیادہ تر اردو شعرا سے واقفیت محض تذکروں کی بدولت ہوتی ہے۔ تذکروں سے نہ صرف زبان کی تاریخ بنتی ہے بلکہ تنقید کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔ عام طور پر تذکروں میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ 1۔ شاعر کے مختصر حالات۔ 2۔ اس کے کلام پر مختصر تبصرہ۔ 3۔ شاعر کے کلام کا انتخاب۔

تذکرہ نگاروں نے عام طور پر غزل گوئی کو اصل شاعری تصور کرتے ہوئے صرف غزل گو شعرا کے تعارف سے سروکار رکھا ہے اور دوسری اصنافِ سخن کو ذیلی وضمنی حیثیت دے کر ان کے نمائندہ فن کاروں کو نظر انداز کر دینے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ پروفیسر حنیف احمد نقوی شعرائے اردو کے تذکروں کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''تذکرہ نویسی کا فن نہ تو براہ راست تاریخ نگاری کے ذیل میں آتا ہیں اور نہ اسے فنِ سیرت یا سوانح نگاری کے تحت رکھا جا سکتا ہے اور نہ اس کا دائرۂ کار تنقید کی طرح صرف اچھے برے کی پرکھ تک محدود ہے بلکہ درحقیقت یہ ان تمام فنون یا اصنافِ ادب کا آمیزہ اور بجائے خود ایک فن یا صنفِ ادب ہے۔ تذکرہ نگار شاعر کے مختصر حالاتِ زندگی قلم بند کرتا ہے، اس کی شخصیت کی تعمیر میں کارفرما عوامل کا ذکر کرتا ہے، اس کی وضع قطع اور عادات واخلاق کی کیفیت بیان کرتا ہے اور اس کے کلام کی خوبیوں اور خامیوں پر اجمالی انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں بطور نمونہ چند اشعار پیش کر کے اپنی ذمے داریوں سے سبکدوش ہو جاتا ہے اگر تحقیق وجستجو کے دوران کسی محقق کو تذکروں کی تشنگی اور تنگ دامانی کا احساس ہوتا ہے تو یہ ایسا نقص نہیں جس کی بنا پر پوری صنف کو دفترِ بے معنی قرار دے دیا جائے، اردو کی توسیع وترقی کے لیے کی گئی کوششوں کی روداد جب بھی قلم بند کی جائے گی تذکرہ سے دامن بچا کر گزر جانا ممکن نہ ہوگا''۔

روہیلکھنڈ کے ضلع بجنور میں تذکرہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تذکرہ نگاری کی روایت ضلع بجنور سے شروع ہوئی۔ شیخ محمد قیام الدین قائم چاندپوری کا تذکرہ ''مخزن نکات' اردو کا قدیم ترین تذکرہ ہے۔ اگرچہ اس کی تکمیل بعد میں ہوئی لیکن اس کا

آغاز ہونے تک کسی اور تذکرے کا وجود ثابت نہیں ہے۔ یہ تذکرہ 1168ھ مطابق 56-1755 میں تصنیف کیا گیا۔ قائم نے دیباچے میں دعویٰ کیا ہے کہ ’’مخزن نکات‘‘ شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ ابھی تک شعرائے ریختہ کے ذکر و بیان اشعار اور احوال کے متعلق کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی ہے۔‘‘

قائم چاند پوری نے اپنے تذکرے میں شعرا کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے اوّل طبقے میں قدیم شعرا شامل ہیں انہیں شعرائے متقدمین کہا گیا ہے۔ دوسرا طبقہ ’’سخنورانِ متوسطین‘‘ اور تیسرا طبقہ ’’شعرائے متاخرین‘‘ کا ہے۔ پہلے طبقے میں ابتدائی اردو شعرا کا ذکر ہے جو قدیم ترین ہیں۔ دوسرے طبقے میں عہد شاہی کے اردو شعرا کا ذکر ہے۔ ان میں زیادہ تر ایہام گو ہیں۔ یہ سب شعرا قائم سے ایک نسل قدیم ہیں۔ تیسرے طبقے میں اہم اور غیر اہم معاصر شعرا کا ذکر ہے۔ قائم کے تذکرے کی ایک اہم اوّلیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے پہلی بار دکنی شاعری کو مناسب اہمیت دی اور ریختہ کے رودِواں میں دکنی شاعری کو شامل کیا۔ قائم کے اپنے تذکرے میں شاہ مبارک آبرو، احمد گجراتی، رائے پریم ناتھ آرام، سراج الدین علی آرزو، شاہ ولی اللہ اشتیاق، شاہ محمد اعظم، خواجہ اکرم، نواب میر خاں انجام، اسد یار خاں انساں، مرزا عبد القادر بیدل، میر عبد الحیٔ تاباں، شرف الدین پیام، فضل علی دانا، جعفر علی خاں ذکی، لالہ کاشی ناتھ، میر حسن علی شوق، خواجہ برہان الدین عاصی، رائے سنگھ عاقل، فرحت اللہ فرحت، میر مکھن پاکباز، صلاح الدین تمکین، شہاب الدین ثاقب، میر جعفر، محمد حاتم، میر باقر حزیں، امیر خسرو، خواجہ میر درد، لالہ بندرابن راقم، آفتاب رائے رسوا، مغل بیگ زار، میر ناصر سلمان، سراج الدین اورنگ آبادی، خوش ونت رائے شاداب، جیون مل عشاق، غلام حیدر مجذوب، محمد محسن خدوی، اشرف علی فغاں، شاہ قدرت اللہ، بدر سنگھ قلندر، میر علی تقی، راجا نند رام مخلص، محمد تقی میر وغیرہ 120 شاعروں کو شامل کیا ہے۔ ’’مخزن نکات‘‘ میں شعرائے اردو کو تین طبقات میں منقسم کرنے اور اردو شاعری کے ادوار متعین کیے جانے کی اردو کی ادبی تاریخ مدون کرنے کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔ اس وجہ سے اپنے معاصر تذکروں میں ’’مخزن نکات‘‘ منفرد ہے۔

ضلع بجنور کے فرزند سعادت علی خاں ناصر نے 1840 میں تذکرہ خوش معرکۂ زیبا لکھا جو کہ اس زمانے کا اہم تذکرہ تھا جس میں سودا، میر، قائم، سمیت 824 شعرا کا ذکر کیا گیا ہے، یہ تذکرہ تین حصوں میں مشتمل ہے پہلے حصے میں 643 دوسرے میں 167 اور تیسرے میں 16 خواتین شعرا کا تذکرہ ہے۔ سعادت علی خاں کے والد رسالت خاں نگینہ ضلع بجنور کے رہنے والے تھے ناصر لکھنؤ جا کر بس گئے تھے اور محمد حسن مذنب عرف چھوٹے مرزا کے شاگرد ہو گئے تھے۔

تذکرہ گلشن ہمیشہ بہار کے مؤلف مولوی نصرت اللہ خاں خویشگی قمر کی پیدائش خورجہ میں ہوئی۔ 1838 میں ان کا تبادلہ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر بجنور ہو گیا۔ ''گلشن ہمیشہ بہار'' قیام بجنور رہی کی یادگار ہے۔ گلشن ہمیشہ بہار 1839ء میں انجمن ترقی اردو کراچی سے شائع ہوا۔ اس تذکرے میں ضلع بجنور کے مولانا جلال الدین اخلاص بجنوری، ضامن علی، احقر بجنوری، مولوی نصیر الدین خالص، غوث محمد بیڈر بجنوری، کنول نین سرکش، منشی منیف علی شوکت بجنوری، وجیہ الدین بجنوری، ظفر علی اخگر بجنوری، امیر خاں امیر نگینوی وغیرہ کے نام وکلام شامل ہیں۔

ضلع بجنور میں تذکرہ نگاری کی روایت کو نہٹور ساکن سیف الحق بجنوری آگے بڑھاتے ہیں۔ انہوں نے 1969 میں ''ہفت رنگ'' نام سے شعرا پر تذکرہ تصنیف کیا۔ اس تذکرہ کا مقدمہ مرزا شرافت حسین ایم اے پی ایچ ڈی نے تحریر کیا۔ ''ہفت رنگ'' میں سید نذر حسن وقار بجنوری، سردار جلیل احمد خاں شیر کوٹی، اعجاز حسین وارثی سنبھل، محمد شمیم سلطانپوری، سید اقبال امام عبادی نوگاؤں سادات، مرتضی خان شمس ایٹوی، مجید مرزا تاباں بچھرایونی، نشتر خانقاہی وغیرہ شعرا کا تعارف اور کلام شامل ہے۔ نشتر خانقاہی نے ہفت رنگ کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے ''مجھے امید ہے کہ مستقبل کا مورخ جب ادب کا جائزہ لے گا تو بجنور کی دنیائے شاعری کے پہلے اور چھوٹے سے اس مجموعہ کلام کو نظر انداز ہر گز نہیں کرے گا۔''

مجاہد آزادی اور شاعر ماسٹر شکیل رحمانی نے 1988 میں ''بامِ ہنر'' نام سے ایک مجموعہ ترتیب دیا، جس میں خاص طور پر ضلع بجنور کے معاصر شعرا کا تعارف، کلام پر مختصر تبصرہ شاعر کی تصویر اور نمونہ کلام شامل کیا۔ ان شعرا میں اختر ایمان، رفعت سروش، عشرت کرتپوری، اظہار اثر،

نشتر خانقاہی، چندر پرکاش جوہر بجنوری، مخفی کریمی، ہلال سیوہاروی، صفدر دھامپوری، افضل کرتپوری، طیب آزاد شیرکوٹی، بے خود نگینوی، ماہر منڈاوری، شوق مانوی، مختار زنجانی، شکیل جمالی، راہی حمیدی، ابرار کرتپوری، ظفر رحمانی، مظفر قیوم ناز، شہباز ابن مخفی، ساحر چاندپوری، گوہر نورپوری، بلراج حیرت، بہزاد یوسف، انصار جنگ، ناصر شاہد علی خاں وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

1991ء میں فرقان احمد صدیقی کے ''بجنور کے جواہر'' نام سے ایک کتاب شائع کی۔ جس میں بجنور ضلع کی ادبی، سیاسی، سماجی، صحافی شخصیات کو شامل کیا ہے۔ ان میں اگر شاعری کے شعبے پر نظر ڈالی جائے تو قائم چاندپوری، شہاب الدین ثاقب، عبدالقیوم ارشق سلمانی، تاجور نجیب آبادی، نہال سیوہاروی، کوثر چاندپوری، اختر الایمان، رفعت سروش، عبدالصمد صارم، محمد عرفان رومانی، قاسم صدیقی سے لے کر شکیل جمالی اور طیب آزاد شیرکوٹی تک کا تذکرہ اور انتخاب کلام درج کیا گیا ہے۔

2008 میں معروف ادیب و شاعر رفعت سروش نگینوی نے ''ہم سخن فہم ہیں'' کے نام سے ایک مضامین کا مجموعہ شائع کیا۔ اس مجموعہ میں رفعت سروش نے ان مضامین کو شامل کیا ہے جو انہوں نے ملک کے نامور ہم عصر شاعروں کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ ان شاعروں میں اسد رضا، بی ایس جین جوہر، پی پی سریواستو رند، تسنیم انصاری، رہبر جونپوری، ڈاکٹر ذکی طارق، سید احمد سحر، طارق باغپتی، فصیح اکمل، قمر سنبھلی، کوثر صدیقی، مصحف اقبالی، منظر اقبال، منصور عثمانی، منظر شہاب، ڈاکٹر مجاہد فراز، نور جہاں ثروت، نسرین نقاش اور ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی کا کلام اس پر تبصرہ تاریخ پیدائش اور وطن کے بارے میں تذکرہ کیا ہے۔ رفعت سروش کا ''ہم سخن فہم ہیں'' مضامین کا مجموعہ مذکورہ بالا شعرا کی شاعری پر اہم کتاب ہے۔ جوان شعرا کے لئے سند کا کام کرتی ہے۔

2009-10 میں شجاع الدین قمر نے ''اردو ادب میں ہمارا حصہ (یادگارِ سیوہارہ)'' حصہ اوّل دوئم نام سے کتاب شائع کی اور اس کتاب میں شجاع الدین قمر سیوہاروی نے سیوہارہ کے قدیم اور ہمعصر دونوں زمانے کے شاعر اور ادیبوں کو شامل کیا ہے۔ جن شاعروں کو شامل کیا ہے

ان کی زندگی وحالات اوران کی شاعری پر تبصرہ کے ساتھ ان کا نمونۂ کلام اور تصویر اس کتاب میں ہے۔ تحسین بیدل سیوہاروی، عبدالخالق نہال سیوہاروی، قاضی ظہورالحسن ناظم، عبدالبصیر عتیقی آزاد، مولوی بدرالدین، حکیم صلاح الدین ناظر، عبدالصمد صارم، عبدالقدیر دلیر سیوہاروی، محمد عارف شہید، عتیق الرحمٰن، محمد عرفان نگینوی، قاسم صدیقی، عبدالحفیظ صدیقی سیوہاروی، حبیب رضا ہاشمی، داؤد اشرف، خورشید جہاں صدیقی، پرکاش مونس کے علاوہ سیوہارہ کے 42 شعرا کا تذکرہ اس کتاب میں ہے۔

ضلع بجنور میں اردو تحقیق اور تالیف کے شعبہ میں ایک اہم نام شکیل احمد خان شکیل بجنوری کا ہے۔ جنہوں نے 2013 میں تذکرہ شعرائے ضلع بجنور رقم کر کے ایک کارنامہ انجام دیا ہے اور قائم چاندپوری کی روایت کو نہ صرف زندہ رکھا ہے بلکہ تین جلدوں میں صرف ضلع بجنور کے تقریباً 470 شعرا کا تذکرہ کر کے تذکرہ نگاری کے فن کو آگے بڑھایا ہے۔ ان تذکروں کو شکیل بجنوری نے قائم چاندپوری کے استاد منعم سے لیکر اطہر شکیل تک کا تعارف کلام، کلام پر تبصرہ اور مہیا تصاویر بھی شائع کی ہیں۔ ضلع بجنور میں اب تک جتنے بھی تذکرے رقم کیے گئے ان میں شکیل بجنوری کا تذکرہ ''تاریخ ادب ضلع بجنور'' سے زیادہ شاعروں کا احاطہ کسی نے نہیں کیا ہے۔ ساتھ ہی اردو ادب پر کام کرنے والے اسکالرس کو نہ صرف مواد مہیہ کرایا ہے بلکہ ایک تحریک بھی دی ہے۔

شکیل بجنوری کی کتاب تاریخ ادب ضلع بجنور میں شعراء کے تذکروں میں بجنور ضلع کے شاعروں کو نگینہ، چاندپور، دھامپور، نجیب آباد، قصبوں اور دیہاتوں کے حساب سے الگ الگ جگہ دی ہے۔ شاعروں کی ترتیب، ان کی تاریخ، پیدائش کے حساب سے کی ہے۔ قیام الدین قائم چاندپوری اوران کی شاعری پر کئی ابواب میں مضمون شامل ہیں۔ اس تذکرہ میں ضلع بجنور کا شاید ہی کوئی شاعر باقی رہ گیا ہو جس کا ذکر نہ ہو۔ شکیل بجنوری نے شاعروں کے ساتھ شاعرات کو تذکرہ میں شامل کرنے کے لئے پوری توجہ دے کر ان کو اردو شعروادب میں زندہ کر دیا ہے۔

تذکرہ نگاری کے میدان میں میرے علم کے مطابق ابھی تک اتنا بڑا کام ہندوستان میں کسی مقام پر نہیں ہوا جتنا کام ضلع بجنور کے موضع حبیب والا کے فرزند انجینئر محمد سمیع الدین علیگ

(تعارف دبستانِ بجنور جلد اول صفحہ 44 اور 239 پر ملاحظہ فرمائیں!) نے کیا ہے۔ انہوں نے ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' کے نام سے ساڑے تین ہزار صفحات پر پانچ جلدوں پر مشتمل کتاب تصنیف کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب تذکرہ کی سب سے بڑی کتاب ہے جس میں آپ نے انبیاء، صالحین، بزرگانِ دین کے علاوہ ادبی اور شعری شخصیات کا بھی تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ جن کا ذکر اس مضمون میں کرنے کے لئے کئی صفحات درکار ہونے۔ 2008 سے 2013 تک شائع ''تذکرہ گنج ہائے گراں مایہ'' کی تصنیف کر محمد سمیع الدین نے اپنی بے پایاں کاوشوں سے اس قدر علمی خزانہ مہیا کرادیا ہے کہ اہل علم وفن ومحققین اس سے بھرپور اور کماحقہٗ استفادہ کرسکتے ہیں۔

اسی روایت کو آگے بڑھانے کا سلسلہ راقم السطور شیخ نگینوی نے بھی اپنی کتاب بعنوان ''فیضانِ راقم'' سے شروع کیا ہے جو''دبستانِ بجنور'' میں تبدیل ہوکر کڑی در کڑی آگے بڑھ رہا ہے۔ ان شاء اللہ۔ بجنور ضلع کے ایک اور ادیب محمد احمد دانش روانوی نے بھی ''نقوشِ دانش'' نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے؛ اس کتاب میں بھی بجنور ضلع کے ادیبوں، شاعروں اور مجاہدِ آزادی کے تذکرے موجود ہیں۔ اگرچہ تذکروں کی جگہ سوانح اور ادبی تاریخوں نے لے لی ہے پھر بھی تذکرہ نویسی کی اہمیت اب بھی برقرار ہے۔ اردو شعروادب کے لحاظ سے زرخیز سرزمین ضلع بجنور نے تذکرہ نگاری کی روایت کو قائم کے زمانے سے لیکر عہد حاضر تک کسی نہ کسی جذبے کے تحت زندہ رکھا ہے جو ایک صحت مند ادبی روایت کا غماز ہے۔

مدیر، میڈیا پوسٹ

چھنگا والا چوک، نگینہ (یوپی)

shaikh.naginvi@gmail.com

9412326875

نظامِ ہاتف: ایک ادبی شخصیت

ڈاکٹر شیخ نگینوی

بزرگ اور استاد شاعر نظام ہاتف کا تعلق شیر کوٹ (ضلع بجنور) سے ہے۔ آپ مولانا نصیر الدین سعدی کے یہاں شیر کوٹ محلہ کھوڑاڑہ میں ہائی اسکول کی سند کے مطابق 16 جون 1949 میں پیدا ہوئے۔ آپ نے پی جے ایم (جوان دنوں) ہائیر سیکنڈری اسکول تھا سے ہائی اسکول کیا، کے ایم انٹر کالج دھامپور سے انٹر اور ہندو کالج مرادآباد سے بی ایس سی کیا۔ 1973 میں آپ کو ریلوے میں ملازمت مل گئی اسی دوران آپ نے پانچ مضامین میں ایم اے پرائیویٹ کیا اور آخری ایم اے (سنسکرت) کا امتحان۔ 2016 میں دیا۔ 30 جون 2009 کو آپ ریلوے کے اسسٹینٹ پرسنل آفیسر مرادآباد کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ مرادآباد کے نزدیک ہرتھلہ اسٹیشن کے قریب ہی آپ نے مستقل جائے سکونت اختیار کرلی ہے۔

نظام ہاتف کی شناخت مایۂ ناز استاد شاعر، محقق، نقاد، افسانہ نگار، اور صحافی کی حیثیت سے ہے۔ عروض پر آپ کی گہری نظر ہے۔ آپ تین زبانوں میں شاعری کرتے ہیں نثری ادبی مضامین بھی لکھتے ہیں جو وقتاً فوقتاً ملک اور بیرونی ملک کے مقتدر اور مستقر ادبی جرائد میں چھپتے رہے اور ریڈیو، ٹیلی ویژن پر بھی نشر ہوتے رہتے ہیں۔ آپ نے مختلف شعرا اور افسانہ نگار حضرات کی کتابوں پر 150 سے زیادہ مضامین لکھے ہیں۔ جو دیباچہ، پیشِ لفظ کے طور پر بہت سی کتب میں شریک ہیں اور بعد از اشاعت تبصروں کے طور پر بھی مختلف ادبی پرچوں میں شائع ہوئے ہیں۔

1973 میں آپ نے پہلا افسانہ ''سہاگن کے آنسو'' علی گڑھ میں تعیناتی کے دوران معروف افسانہ نگار احمد رشید کے اسرار پر تحریر کیا تھا جسے بعد میں بائکلہ (بمبئی) کی انجمن تعمیر ادب

کے کل ہند مقابلہ میں بھیجا۔اس مقابلے کے جج راجندر سنگھ بیدی، قاضی مشیر ریاض، دلیپ کمار (فلم اداکار) اور حسن کمال تھے۔اس مقابلہ میں مذکورہ افسانہ اول آیا تھا، جسے مئوناتھ بھنجن سے نکلنے والے رسالے ''ادب نکھار'' میں اس کے مدیر ایم نسیم اعظمی نے بڑی آب وتاب کے ساتھ شائع کیا۔اس کے بعد آپ نے چند اور افسانے لکھے جن میں بے نام رشتے، بلبل شوریدہ، سلاسل، نانی کے گھر، انوار میاں، شاہین کوثر، رجنی دیوی، میری دادی اور بڑے حکیم صاحب بہت دنوں چرچا میں رہے۔آپ کا شعری مزاج ایک دم یگانہ اور مختلف ہے۔آپ کسی کی تقلید نہیں کرتے جدیدیت اور مابعد جدیدیت پر نظام صدیقی کے طویل مضمون (جو آپ نے گوپی چند نارنگ کی کتاب میں لکھا ہے) میں نظام ہاتف کی غزلوں اور نظموں کا حوالہ ملتا ہے۔آپ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے شعرا میں شمار ہوتے ہیں آپ نے چونکہ مروجہ اردو اصناف کے علاوہ دیگر زبانوں کی اصناف کی فارم میں بھی کلام کہا ہے اس لیے ان کی شناخت الگ سے بھی ہے۔آزاد غزلوں پر اور نثری نظموں پر کئی لوگوں نے کچھ کتابیں شائع کیں۔کئی رسالوں میں خصوصی نمبر شائع کیے اور ان سب میں آپ کا کلام شریکِ اشاعت ہے۔مثلاً نشتر خانقاہی نے ایک بار مجھے علیم صبا نویدی کی کتاب (تالیف) ''قید شکن'' دکھائی تھی جس میں نظام ہاتف کی ایک آزاد غزل شامل تھی اس کے علاوہ ''آپ ہیں'' (تالیف عرفان عباسی) ''ساحل سے سفینہ تک'' (تالیف، شکیل رحمانی) چراغ شہر جگر کے (تالیف قمر قدیر ارم)، میں مراد آباد ہوں (تالیف جاوید رشید عامر)، دستاویز (تالیف شاہد احسن مرادآبادی)، حسنِ افکار (تالیف ماسٹر محمد حنیف)، مسافرانِ ادب (تالیف درد دہلوی) وغیرہ میں آپ کا کلام شاملِ اشاعت ہے۔ماہنامہ شاعر بمبئی نے اپنے آزاد غزل ونثری نظم نمبر میں نظام ہاتف کو خصوصی اہمیت کے ساتھ شائع فرمایا تھا۔آپ نے سانیٹ، بلینک ورس، فری ورس، ہائیکو، ماہیے، دوہے، سورٹھے، ترائیلے وغیرہ بھی کہے ان دنوں رباعیات کے بھی دو مجموعے قریب الاشاعت ہیں۔اردو میں آپ کا مجموعۂ کلام ''وثوق'' اور ''قلم ہوا کی'' شائع ہو چکے ہیں، ہندی میں آپ کے تین مجموعے، ہندی غزل پر مبنی 2014 چھپے۔آگ ہی کشتی، آستین میں چاقو اور مکڑی کے جالے میں شیر، آپ کے ہندی غزل کے مجموعے ہیں ''چنتن

کے مکت کلش'' آپ کا ہندی نظموں کا مجموعہ ہے۔ انگریزی میں آپ کے پانچ مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اردو، ہندی اور انگریزی کا شاید ہی کوئی ادبی جریدہ ہو جس میں نظام ہاتف کی نثری اور شعری نگارشات نہ شائع ہوئی ہوں اور ابھی بھی تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ نظام ہاتف ادب کے قد آور دستخط ہیں۔

ضلع بجنور کا تاریخی تناظر

نظام ہاتف

بجنور ایک معمولی بستی کے طور پر 778۔780 کے آس پاس بسنا شروع ہوا تھا اول ،اول یہاں دو راجپوت قبیلے آئے جو ماؤنٹ آبو یا کچھ تاریخ دانوں کے مطابق آونتی سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ یہ بھی مانا جاتا ہے کہ یہ لوگ راجپوتوں کے گرجر پرتہار ونش سے تھے جو ناگ بھٹ دوئم کے زمانے 795۔822 میں آئے ہوں گے پھر یہاں پیشہ ور قسم کی برادریاں اور مزدور لوگ بستے گئے مثلاً لوہار، بڑھئی، تیلی، دھوبی، نائی وغیرہ۔

ویسے تو ایسے بھی مشاہدات ہیں جو بجنور قصبے کی تو نہیں البتہ آج کے تناظر میں اگر پورے ضلع کو کینواس پر رکھیں تو گجرولہ کے پاس ودر کٹی کا واقع ہونا بجنور کو مہابھارت عہد سے جوڑتا ہے مہابھارت جنگ کا زمانہ 3000 عیسیٰ قبل کا ہے، ودر جی مہاراج کورو اور پانڈو کے بھائی تھے جو کروچھیتر (ہریانہ) سے دور یہاں آ کر رہنے لگے تھے وہ یہاں قیام کے دوران تمام عمر کفِ افسوس ملتے رہے کہ وہ اس جنگ کو رکوانے میں کیوں ناکام رہے۔ اس کے علاوہ شیر کوٹ قصبے کے نزدیک یہ ہے کہ بالکل ملحق بالکشن پور نام کا ایک قدیم گاؤں ہے۔ وہاں اب بھی کچھ گوجر لوگ رہتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہاں بھی کرشن کا بچپن کچھ عرصہ گذرا تھا کیوں کہ پانڈوں کی بیوی کنتی کے کچھ رشتہ دار یہاں رہتے تھے اور کرشن جی ان کے چچیرے بھائی تھے اس لیے وہ بھی کنتی کے ساتھ کچھ کچھ عرصے کے لیے یہاں آجاتے تھے مگر واقعات زیادہ پرانے ہونے کی وجہ سے پورے

وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، پھر بھی ان باتوں سے بجنور کے قدیم الاثار ہونے کو تقویت ضرور ملتی ہے۔ادھر کالیداس کے مشہور عالم ناول ''شاکنتلم'' اور ''میگھ دوت'' میں بجنور ضلع کی کچھ ندیوں (مثلاً مالن، گانگن اور کھو) کا ذکر ہے۔

711 میں محمد بن قاسم (جس کی فوج نے انصار اور مہاجرین کا تناسب ایک اور دس کا تھا) نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا اس نے 715 تک دے ول نے اون سے وان، رے اور آلودور ملتان فتح کیے۔اس کے فوجی پورے ہندوستان میں پھیل گئے تھے جنوبی ہندوستان میں اور مشرقی ہندوستان میں بھی ہریانہ، پنجاب، اتر پردیش میں بالخصوص ضلع بجنور کے نجیب آباد، نگینہ، حبیب والا، شیر کوٹ، نہٹور، بھوت پوری اور ہریولی میں بھی وہ بس گئے تھے۔سہارنپور کے گنگوہ اور میرٹھ اور مظفر نگر کے بھی کئی قصبوں اور دیہاتوں تک میں بھی۔پانی پت کے مولانا الطاف حسین حالی کا شجرہ بھی انھیں سے ملتا ہے خواجہ احمد عباس کا نام بھی اس زمرہ میں آتا ہے۔

1526 میں مغل بادشاہ یہاں آیا اس نے مغلیہ سلطنت دہلی میں قائم کی وہ بہادر اور جنگجو تھا۔اس کے فوج میں فرید ولد حسن نام کا ایک سپاہی تھا۔جو بعد میں شیر خان اور بعد میں شیر شاہ سوری کے نام سے مشہور ہوا، اس کا ذکر ''تزک بابری'' (جو بابر کی ترکی زبان میں تصنیف ہے) میں بھی ہے کہ بابر نے اپنے بیٹے ہمایوں کو اس سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی تھی۔اس شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو دو مرتبہ ایران کھدیڑ دیا تھا۔شیر شاہ سوری نے ہی قصبہ شیر کوٹ ضلع بجنور ایک شکار گاہ کے طور پر آباد کیا تھا۔شیر کوٹ شیروں کے لیے مشہور تھا اور وہ شیر کے شکار کا شروع سے ہی شوقین تھا۔اب وہ جنگلات تو یہاں نہیں ہے مگر زمینی سطح او بڑ کھابڑ ہے جس سے اس کے کبھی جنگل رہے ہونے کا ابطال ممکن ہے۔شیر شاہ سوری مغلوں کا کٹر دشمن تھا اس کا زمانہ پانچ سال رہا یعنی 1540 سے 1545 تک اور اس دوران اس نے بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔بجنور اور شیر کوٹ کی طرح ہی نجیب آباد نگینہ، سیوہارہ، چاند پور، دھامپور اور دیگر مواضع کی تاریخیں بھی نہایت تابناک ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بجنور کا ماضی بیحد آسودہ اور مردم خیز رہا۔یہاں بھی میدانوں کی نامور ہستیاں گذری ہیں۔سیاسی، دینی، علمی اور ادبی۔بجنور کے عبدالرحمٰن بجنوری

مشہور محقق اور ادبی شخصیت رہے غالب کے شارحین میں بقول رام لال وہ سرِ فہرست ہیں۔ادھر آتے آتے نشتر خانقاہی اردو ادب کا بڑا نام ہے۔نجیب آباد کے علامہ تاجور نجیب آباد کو کون نہیں جانتا موصوف کو ''بلیغ العصر'' کا خطاب عطا ہوا تھا۔نجیب آباد کے ایک بزرگ اور مجاہدِ آزادی شکیل رحمانی کا نام ماضی قریب کا اہم نام ہے۔چاند پور کے قایم چاند پوری سب کے لیے مشعلِ راہ ہیں ادھر کوثر چاند پوری مشہور افسانہ نگار رہے۔راہی حمیدی نے قائم چاند پوری کو معنون کرتے ہوئے ایک ادبی جریدہ ''ادب قائم'' نکالا۔ان دنوں شکیل جمالی اور پرویز اختر شعری ادب کی آبیاری کر رہے ہیں۔نہٹور میں سجاد حیدر یلدرم کا پورا خاندان ہی ادب کی شان ہے اور بجنور کو دبستان قرار دلانے میں یہ لوگ ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔قرۃ العین حیدر ایک عہد ساز شخصیت رہی ہیں۔چاند پور کے نزدیک باسٹہ قصبہ ہے باسٹہ کے دو نام (فیضی اور ابوالفضل) بھی قد آور ہیں جو کہ موصوف اکبر کے نورتنوں میں تھے۔بجنور کے لیے یہ لوگ بھی قابلِ فخر ہیں۔شیر کوٹ کے بھی ایک عالم اور شاعر جو سنسکرت کے عظیم وِدوان کے طور پر اسی زمانے میں تھے۔شیخ کریم اللہ ان کا نام تھا جن کی علم دانی سے عبدالرحیم خانخانہ تک متاثر تھے ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بھی اکبر کے نورتنوں میں ہوتے مگر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فیضی اور ابوالفضل نے اس میں ٹانگ اڑا دی۔کیونکہ یہ دونوں لوگ فارسی کے آدمی تھے۔بہر کیف سیوہارہ ،نگینہ، دھامپور، شیر کوٹ، افضل گڑھ وغیرہ سب جگہوں میں بڑے بڑے علماء دین، ادبی و سیاسی شخصیات رہی ہیں۔جن کے دم قدم سے ضلع بجنور کا نام سرِ فہرست رہا جن کے نام و کام بڑے گراں مایہ اور قابلِ تحسین ہیں۔

ضلع بجنور کی خدمات پر فرقان صدیقی، شکیل بجنوری کی دو کتب پہلے ہی آچکی ہیں جن میں کافی کوریج ہے۔ادھر ڈاکٹر شیخ نگینوی جو ایک دم جوان اور عزم حوصلے کی شخصیت ہے انھوں نے 2015 میں دبستانِ بجنور کے نام سے جو کتاب تالیف کی ہے اس میں تمام ہی لوگوں نے (جن سے انھوں نے مضامین لکھوائیں ہیں) بڑی محنتِ شاقہ اور عرق ریزی سے اپنے رشحات قلم بند کیے ہیں دل سے دعا ہے کہ ان کی مختصر کاوش جلد رنگ لائے ان کے قلم کی زرفشانیہ اتنی تابناک اور دستاویزی ہوں کہ شیخ نگینوی کا خواب کہ ''بجنور ایک دبستان ہے'' وہ جلد دبستان

تسلیم کرلیا جائے۔ مگر ہم کو اس مہم سخن میں کچھ اور مراحل ہیں جو ابھی طے کرنا ہے۔ ویسے تو رامپور اور امروہہ والے بھی مصر ہیں کہ رامپور اور امروہہ کو دبستان تسلیم کیا جائے مگر تا حال جو صورت حال ہے وہ یہ ہے کہ صرف اور صرف دو ہی دبستان کے مانے جاتے ہیں۔ دلی اور لکھنؤ۔ حیدر آباد تک کو دبستان تسلیم نہیں کیا جاسکا۔ امروہہ، رامپور کے مقابلے میں البتہ بجنور کا پلہ زیادہ بھاری ہے۔ بجنور کی امیدواری، ایمانداری سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے۔ خدا کرے جب بات کی شروعات کی گئی ہے تو جلد نتیجہ بھی نکلے گا۔ ڈاکٹر شیخ نگینوی اور ان کی ٹیم کے حوصلے کو خدا تعالیٰ جوان رکھے۔

شیخ نگینوی کے دبستان بجنور جلد اول کے مطالعے کے بعد راقم الحروف نے محسوس کیا کہ بے حد کوشش کے بعد بھی چند لوگوں کے نام اور کام کا ذکر اس کتاب میں چھوٹ گیا ہے خصوصاً ان لوگوں کے نام جو بجنور سے باہر رہتے ہیں مگر ہیں بجنور کے۔ میں چند لوگوں کا ذکر اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے کر رہا ہوں اس کے باوجود بھی کچھ لوگ رہ گئے ہوں گے جو بعد میں روشنی میں آئیں تو بھی ہمیں ان کے لیے دروازے کھلے رکھنے ہیں تاکہ مکمل تذکرہ ہو جائے۔

1۔ سید حسین مہدی رضوی: آپ نہٹور ضلع بجنور میں پیدا ہوئے اور لاکڑی والان (مرادآباد) میں مقیم رہے۔ آپ یہاں کے بزرگ ایڈوکیٹ اور نوٹیری پبلک تھے۔ فارسی مطالعہ آپ کا بہت زیادہ تھا۔ علامہ اقبال پر وہ اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے آپ کو شعر و ادب سے بیحد دلچسپی تھی۔ ''نقش ناتمام'' کے نام سے آپ کا ایک شعری مجموعہ بھی آیا تھا۔ ''محمود ادبی دائرہ''، مغل پورہ، مرادآباد کے آفس میں میری ان سے اکثر ملاقات رہتی تھی۔ آپ سجاد حیدر یلدرم کے خاندان سے تھے اور قرۃ العین حیدر آپ کی پھوپھی تھی۔ محترمہ جب ان کے گھر 1980 کے بعد تشریف لائی تھیں تو ہم لوگوں نے محمود ادبی دائرہ کے دفتر میں عشائیہ رکھا تھا۔ جس میں حسین مہدی رضوی نے اپنی کتاب ''نقشِ نام'' کی ایک ایک جلد تقسیم کی تھی اس کے علاوہ علامہ اقبال کا فارسی کلام ''اسرار خودی'' کا بھی آپ نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا تھا، اسرار اقبال کے نام سے وہ شائع ہوا تھا۔ اس کی بھی ایک ایک جلد آپ نے قرۃ العین حیدر کے بدست تقسیم فرمائی تھی۔ آپ نہایت ہی سادہ مزاج اور شفیق قسم کے انسان تھے ان کے احباب میں یہاں کے پروفیسر محمود، وحشی مرادآبادی

،شاہد احسن مراد آبادی، مولوی عزیز حسن، راقم الحروف اور کئی سینئر وکلا تھے۔

2۔ خمار نہٹوری:۔ آپ کا نام عظمت اللہ تھا۔ آپ بھی نہٹور میں پیدا ہوئے تھے مگر تلاشِ معاش میں یہاں مراد آباد ہجرت فرمائی۔ ''عظمتِ وطن'' آپ کا شعری مجموعہ تھا۔ آپ کے متعلق ہندی کے ایک بزرگ شاعر ''بھگوان سروپ پتھک'' نے فرمایا تھا کہ'' آپ کی تخلیقات داغ کی طرح سادہ اور موثر ہے۔ سادہ اندازِ بیان ہے اور خوب صورتی سے آسان فہم زبان میں اپنی بات کہنے پر قادر ہیں'' تبرک کے طور پر آپ کا شعر حاضر ہے۔

صرف ایک پھول کی تمنا تھی
ہاتھ میں شاخ ٹوٹ آئی ہے

انھیں مراد آباد میں ایک استاذ کا درجہ حاصل تھا ان کے ایک شاگرد غلام مراد آبادی کا ذکر درد دہلوی نے اپنی'' کتاب مسافران ادب'' میں کیا ہے۔ آپ محلّہ دیوان کا بازار میں ملانیب کی مسجد کے پاس رہتے تھے وہیں پر آپ کا 14 نومبر 2013 کو انتقال ہوا۔

3۔ جاوید رشید عامر:۔ آپ کا نام جاوید بن رشید ہے اور والد کا نام سید رشید الحسن ہے آپ یکم جنوری 1957 کو نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ ایم اے ایل ایل بی کر کے آپ نے مراد آباد میں وکالت شروع کردی اور جلد ہی لیڈنگ ایڈوکیٹ میں شمار ہوئے۔ ادبی ذوق بچپن سے رہا اس لیے شعری میدان میں حضرت قمر مراد آبادی کو اپنا استاذ بنایا اور شاعری کے رموز سیکھے۔ آپ سیاسی اور سماجی انجمنوں سے بھی منسلک ہیں۔'' وقارِ ادب'' نام سے آپ کی ایک انجمن ہے آپ کے اشعار میں تازہ ہواؤں کے سارے رخ ہیں۔ آپ بہت اچھے مقرر اور ناظمِ مشاعرے کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ تاحال آپ کے سات شعری ونثری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ میں مراد آباد ہوں، سنہرے اکھر، شمشیر صداقت، الہام، ذکرِ رسول، خوشبو کا سفر، العطش، آپ کے مجموعے ہیں۔ آپ نہایت خلیق اور بذلہ سنج قسم کے انسان ہیں۔

4۔ محمد ظہور بھائی جان:۔ آپ بخارا بجنور میں پیدا ہوئے مگر تقسیمِ وطن سے پہلے ہی تلاشِ

روزگار میں مراد آباد منتقل ہو گئے یہاں ظروف سازی جو مراد آباد کی خاص پہچان ہے اس سے جڑ گئے۔آپ بخارا بجنور میں والد کے انتقال کے باعث تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر تعلیم سے انھیں زبردست لگاؤ تھا اور تعلیم کی کمی کو ہمیشہ محسوس کرتے تھے۔آپ حد درجہ مخیّر اور علم دوست تھے۔شعرا ادبا اور طلبہ سے بہت ہمدردی رکھتے اور ان کی ہر ممکن امداد کی کوشش کرتے تھے۔ظہور بھائی جان نے حسین مہدی رضوی کی کتاب ''اسرارِ اقبال'' اور شمیم انصاری کی کتاب ''کافر اقبال'' کی اشاعت اپنی مالی امداد سے کرائی تھی۔آپ نے پیر زادہ محلے میں عبدالقیوم انصاری میموریل لائبریری بھی قائم کی تھی جس سے بہت دنوں تک لوگ فیضیاب ہوئے۔

لاجپت نگر مراد آباد میں عاصم بہاری گرلس انٹر کالج بھی ملت کی بچیوں کی تعلیم کے لیے آپ کا ہی قائم کردہ ہے۔آپ سادہ مزاج تھے ہر سائل کو پہلے کھانا کھلواتے تھے پھر ان کی مالی مدد کرتے تھے۔غریب طلبہ کی فیس اور درسی کتابیں خریدواتے تھے۔بجنور کے لوگوں پر تو وہ جان چھڑکتے تھے۔

5۔ڈاکٹر مختار فہیم :۔آپ کا تعلق نگینہ کے محلہ قاضی سرائے سے ہے۔آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم بی بی ایس کر کے ایم ایس کیا اور پھر ریلوے میں اے ڈی ایم او ہو گئے۔ریلوے سے آپ نے استعفیٰ دیا اور مراد آباد کے محلہ دیوان بازار میں 1972 میں اپنا سرجیکل کلینک کھول لیا۔آپ نامور سرجن ہیں اور ان دنوں لاجپت نگر میں آپ کا عالی شان سرجیکل کلینک ہے۔آپ نہایت ہی خوش مزاج اور مریضوں کے نہایت ہی ہمدرد شخص ہیں۔آپ شاعر یا ادیب تو نہیں مگر ادبا وشعرا کی بہت عزت واحترام کرتے ہیں ان کے احباب میں بیشتر ادبا ہی ہیں۔شاید یہ ان کے علیگ ہونے کا اعجاز ہے یا خاندانی وراثت کا اثر۔

6۔استاذ حنیف شیر کوٹی :۔آپ شیر کوٹ محلہ شیخان میں رہتے تھے۔فارسی کے جید عالم تھے اور مولانا ارشق شیر کوٹی کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر فرماتے تھے۔نظمیں ان کی بالخصوص نہایت مؤثر اور سبق آموز تھیں۔آپ فارسی قواعد کے استاذوں میں شمار ہوتے تھے۔کم گو اور سنجیدہ مزاج رکھتے تھے۔

7۔نواب احمد تقی:۔آپ کا تعلق بھی شیر کوٹ سے ہے آپ کے والد ماجد حکیم محمد تقی شیر کوٹی ایک مشہور حکیم تھے خاص طور وہ پرانے امراض کے علاج کے لیے مشہور تھے۔شعر گوئی سے بھی انھیں دلچسپی تھی اور وہی اثر ان کے بیٹے نواب تقی تاریخ پیدائش 1946 (تقی شیر کوٹی) میں منتقل ہوا۔آپ بہت مضبوط شعر کہتے تھے۔نمونے کے طور پر ایک شعر حاضرِ قارئین ہے:

جلا تو ایسا کہ محفل کی آبرو تھا چراغ
بجھا تو ایسا کہ طاقِ مزار سے بھی گیا

افسوس کہ جلد ہی آپ اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے اور کوئی مجموعہ کلام منظرِ عام پر نہ آسکا۔

8۔خلش شیر کوٹی:۔آپ کا نام محمد فرقان ہے والد کا نام منشی عبد الحق تھا۔آپ کا شیر کوٹ میں کپڑے کا کاروبار ہے۔آپ استاذ حنیف کے شاگردوں میں ہیں۔فارسی مطالعہ آپ کا زبردست ہے فارسی اساتذہ کے سیکڑوں بلکہ ہزاروں شعر ان کو ازبر ہیں۔آپ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں یکساں مہارت سے شعر کہتے ہیں۔آپ حد درجہ متواضع اور بے ریا قسم کے انسان ہیں۔

9۔اقبال ساجد:۔آپ محلہ شیخان شیر کوٹ میں پیدا ہوئے۔تقسیمِ وطن میں پاکستان چلے گئے وہاں شاعری میں خوب خوب نام کمایا وہ شیر کوٹ پاکستان سے ایک مرتبہ آئے تھے ان کے اعزاز میں کئی اعزازی نشستیں لوگوں نے یہاں منعقد کی۔ہندوستانی رسائل میں بھی گاہے بگاہے چھپتے رہے آپ کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

16/15/385، ودھیا نگر،
نزد ہرتھلہ ریلوے اسٹیشن، مراد آباد۔244001
رابطہ:9717640776

ایک افسانہ نگار۔ ایم اسلم صدیقی

ڈاکٹر شیخ نگینوی

"ہمارے دادا نجیب آباد کے نزدیک موضع ہندو پور کے زمین دار تھے۔ اپنے علاقے اور برادری میں دور دور تک ان کو عزت و وقار کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ہماری حویلی پر اکثر مہمان رہتے تھے۔ دادا کا دستر خوان کافی وسیع تھا۔ اچانک دادا کا انتقال ہوا۔ حویلی کی بساط ہی الٹ گئی۔ عیش پرست اور لاپرواہ شہزادے کی زندگی بسر کرنے والے والد درپیش مسائل کا سامنا نہ کر سکیں اور بھری جوانی میں انتقال فرما گئے۔ بیوہ ماں کے ساتھ بچوں نے کن کن حالات کا سامنا کیا۔"

خیر النساں بیگم اپنی یہ حقیقی داستان بیٹے کو سناتی۔ بیٹا جب کچھ بڑا ہوا تو اس کے والد غلام صابر صدیقی نہٹور کے سرگرم کیمونسٹ رہنما اپنے زیادہ تر تحریری کام بیٹے سے ہی کراتے۔ محنت کش طبقے کے مسائل، رکشہ، تانگے والوں کے مطالبات اور درخواستیں لکھتے لکھتے اس لڑکے کے ذہن و دل میں غریبوں، مظلوموں سے گہری ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ والدہ کے ذریعے سنائی گئی ننھیال کی کرب ناک یادیں اور محنت کشوں، غریبوں، مظلوموں کے مسائل نے ایک تخلیقی ذہن کی آبیاری کی اور یہ لڑکا جس کا نام ادب کی دنیا میں ایم اسلم صدیقی ہے نے افسانہ نگاری شروع کر دی۔

محمد اسلم کی پیدائش دانشمندوں کی بستی نہٹور میں 9 جولائی 1966 کو ہوئی۔ 1980 میں حافظ محمد ابراہیم انٹر کالج نہٹور سے ہائی اسکول کیا۔ بعد میں جامعہ اردو سے ادیب ماہر، کامل و معلم اردو کیا۔ 19 سال بعد 1999 میں انٹر میڈیٹ کا امتحان سید یاسین احمد تابش اور مظفر احمد کی

تحریک پر دیا اور فرسٹ ڈویزن حاصل کی۔

محمد اسلم نے کامل اردو کی بنیاد پر بی اے سال سوئم اور ایم اے اردو آگرہ یونیورسٹی سے کیا۔ 2006 میں یو جی سی نیٹ اور یو پی ٹی آئی ٹی 2013 کرنے والے محمد اسلم نے 2015 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر محمد زاہد کی نگرانی میں ''حیات اللہ انصاری کی ادبی وصحافتی خدمات'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹر ایم اسلم صدیقی کی پہلی کہانی ''ایک کرن بجھی سی'' 1998 میں آدرش کومدی میں شائع ہوئی تو پہلی بار 1989 میں ''میرے لال'' کہانی آل انڈیا ریڈیو نجیب آباد سے نشر ہوئی۔ صحافت کا آغاز بطورے صحافی ''امر اجالا'' اور اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا سے 99-1989 میں کیا۔ پہلا افسانہ ''خاتون مشرق'' دہلی میں ''مل گیا ساحل مجھے'' عنوان سے شائع ہوا۔ اب یہ سلسلہ بزم سہارا، عالمی سہارا، حیات ویکلی، بیسویں صدی، سب رس حیدر آباد، ایوان اردو، تحریر نو ممبئی، آج کل دہلی، خبر نامہ لکھنؤ، اردو دنیا دہلی، قومی آواز، رفتار، جاگرن، ہندوستان، چنگاری میں جاری ہے۔ دو افسانوی مجموعے، دو مضامین کے مجموعے، تین ناول ''فساد''، ''گوری آنکھیں کالی چھایا'' اور ''کالی شال'' زیر طباعت ہیں۔ اردو اکادمی لکھنؤ سمیت کئی سماجی و ادبی تنظیموں نے ایم اسلم صدیقی کو اعزاز سے نوازہ ہے۔

ضلع بجنور میں اردو ناول نگاری کی روایت

ڈاکٹر ایم اسلم صدیقی

ضلع بجنور زمانہ قدیم ہی سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ ضلع بجنور کے جانشینوں نے اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دے کر اسے نئی سمت اور نئی جہتوں سے روشناس کرایا چاہے وہ شاعری کا میدان ہو یا فکشن نگاری کا، بات صنف افسانہ کی ہو یا ناول نویسی کی ہر ایک اصناف میں ضلع بجنور کے اردو ادباء نے اپنے جوہر دکھلائے مثلاً ''افسانہ نگاری کے آغاز کا سہرہ جہاں فرزندِ ضلع بجنور سید سجاد حیدر یلدرم کے سر ہے وہیں ناول نگاری کے موجد کا تاج بھی فرزندِ ضلع بجنور مولوی نذیر احمد کے سر ہے۔ وہیں اردو ناول کو نئی سمت اور جدید آہنگ عطا کرنے کا شرف بھی دخترِ ضلع بجنور قرۃ العین حیدر کو حاصل ہے، زیرِ بحث مضمون میں ہماری توجہ صرف ضلع بجنور کے ناول نگاروں تک مرکوز رہے گی۔

اردو ناول **مولوی نذیر احمد** کے احسان سے گراں بار ہے انہوں نے ''مراۃ العروس'' لکھ کر ہماری زبان میں ناول نگاری کی شروعات کی۔ ان کی پیدائش ضلع بجنور کی تحصیل نگینہ کے گاؤں ریہڑ میں 1836 میں ہوئی۔ گھر کے حالات ناساز گار تھے لیکن والد ماجد بشیر احمد کے دل میں بیٹے کو تعلیم یافتہ دیکھنے کا بڑا ارمان تھا۔ سو حصول علم کے لئے انہوں نے اپنے لختِ جگر کو مولوی عبدالخالق کے سپرد کر دیا جو کہ دلی کشمیری دروازے کے قریب پنجابیوں کے کڑے کی مسجد میں مدرس تھے نذیر احمد وہیں رہ کر عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ایک اتفاقیہ حادثے کے بعد

انہیں دلی کالج میں داخلہ مل گیا۔ بچپن سے ہی ذہین اور محنتی تو تھے ہی خوب جی لگا کر پڑھا۔ مولوی نصر اللہ خاں اور مولوی عبدالقادر کی شاگردی اختیار کی۔ منشی کریم الدین اور پیارے لال آشوب ہم جماعت تھے ان کی محبتوں سے طبیعت کو اور جلا ملی۔ اسی دوران اپنے کرم فرما مولوی عبدالخالق کی پوتی صاحبہ کے ساتھ وہ رشتہ ازدواج سے منسلک ہو گئے۔

دلی کالج کی تعلیم سے فراغت کے بعد وہ پنجاب میں مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد تحصیلدار اور پھر افسر بندوبست ہو گئے۔ بعد زاں سر سالار جنگ اوّل نے حیدر آباد بلا لیا۔ ترقی پا کر ممبر مال ہو گئے۔ 1883 میں ان کی وفات کے بعد مولوی نذیر احمد حیدر آباد کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر دہلی چلے آئے اور باقی زندگی یہیں درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ سر سید احمد خاں کے رفقاء میں شامل ہو کر علی گڑھ تحریک میں سرگرم اور فعال رول ادا کیا۔ 1897 میں حکومت نے ان کو شمس العلماء ہند کے خطاب سے نوازا۔ 1902 میں ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔ 1912 میں مولوی نذیر احمد دہلی میں اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔

مولوی نذیر احمد نے بہت سی کتابیں لکھیں لیکن ان کی شہرت کا اصل مدار ان کے ناولوں پر ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ نذیر احمد نے کسی منصوبے کے تحت ناول نگاری کا آغاز نہیں کیا بلکہ قدرت کو ان سے یہ کام لینا مقصود تھا اس لئے آپ سے آپ اس کی راہ ہموار ہوتی گئی۔ مولوی صاحب اپنے بچوں کو تعلیم دینا چاہتے تھے مگر اردو میں درسی کتابیں موجود نہ تھیں۔ اسلئے وہ اپنی بیٹی سکینہ کو ایک۔ ایک دو۔ دو صفحے لکھ کر دے دیا کرتے تھے۔ تحریر دلچسپ بنانے کے لئے انہوں نے کتاب کو قصے کی شکل دی اس طرح پہلے اکبری کا قصہ مکمل ہوا پھر کتاب کو مکمل کرنے کے لئے اس کی چھوٹی بہن اصغری کا قصہ لکھا گیا اور ان کا پہلا ناول مراۃ العروس مکمل ہو گیا۔ یہ 1869 میں شائع ہوا۔ مراۃ العروس ایک اصلاحی ناول ہے اور اس کا موضوع لڑکیوں کی تربیت ہے۔ دوسرا ناول بنات النعش دراصل پہلے ناول کا حصہ ہے۔ جو 1973 میں شائع ہوا۔ اس کا موضوع بھی خانہ داری کی تربیت اور اخلاق کی تعلیم ہے۔ توبتہ النصوح مولوی نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے جو

1877 میں شائع ہوا۔ ''توبتہ النصوح'' کو ان کا شاہکار ناول کہا جاتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار نصوح ایک خواب دیکھنے کے بعد اپنے پورے خاندان کی اصلاح پر متوجہ ہوتا ہے مگر اپنے بیٹے کلیم کی اصلاح میں ناکام رہتا ہے۔
''مرزا ظاہر دار بیگ'' اس ناول کا معرکہ آرا کردار ہے۔

چوتھا ناول ''فسانہ مبتلا ہے''۔ جس کی اشاعت 1885 میں ہوئی یہ ناول کثرت ازدواج کے مسائل پر مبنی ہے۔ 1888 میں شائع ہوئے ''ابن الوقت'' ناول میں بتایا گیا ہے کہ دوسروں کے رہن سہن کی نقل کرنے والا آخر کار پچھتاتا ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ابن الوقت کے پردے میں سر سید پر طنز کیا ہے اور حجۃ الاسلام خود مولوی صاحب کا کردار ہے۔ ''رویائے صادقہ'' مولوی نذیر احمد کا آخری ناول ہے۔ جو 1894 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں مذہبی امور پر اس طرح روشنی ڈالی گئی ہے کہ جدید تعلیم حاصل کرنے والے نوجوان دین سے برگشتہ نہ ہوں۔ مولوی نذیر احمد نے انڈین پینل کوڈ (آئی پی سی) کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں ''تعزیراتِ ہند'' کے نام سے کیا۔ مولوی نذیر احمد کے ناول اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں آئندہ اردو ناول کی عمارت انہیں ناولوں کی بنیاد پر اٹھی۔ اس لئے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ اردو ادب میں مولوی نذیر احمد کو اہم مقام حاصل ہے۔

اُردو کے پہلے افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور **سید سجاد حیدر یلدرم** نے ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی اور کئی ترکی ناولوں کا اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ یلدرم نہٹور کے معروف سادات گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کی پیدائش 1880 میں کانڈیر ضلع جھانسی (والد صاحب کی ملازمت کی جگہ) میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام خان بہادر سید جلال الدین حیدر تھا جو بنارس وغیرہ شہروں کے حاکم رہے تھے۔ 1892 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں نویں جماعت میں داخلہ ہوا۔ اسی سال نومبر میں اسٹوڈینٹس یونین کے سکریٹری چن لئے گئے۔ انہوں نے 15 مئی 1900 کو علی گڑھ میں اردوئے معلیٰ قائم کیا اور اس کے بانی سکریٹری مقرر ہوئے۔ 1901 میں اسی کالج سے بی اے کیا اور قانون کی تعلیم کے لئے داخلہ لیا۔ اس دوران وہ نواب اسمٰعیل خاں

تعلقہ دار میرٹھ اور راجہ صاحب محمود آباد کے سکریٹری بھی رہے۔ زمانہ طالب علمی سے انہیں ترکی زبان سے خاص شغف تھا اور اس میں انہوں نے مہارت حاصل کر لی تھی جبکہ مولانا شبلی نعمانی ان کے فارسی کے استاد تھے۔ انہوں نے ترکی زبان کا تخلص یلدرم اختیار کیا تھا جس کے معنی "برق" کے ہیں قانون کی پڑھائی پوری کرنے سے پہلے ہی 26 مارچ 1904 کو بغداد کے برطانوی قونصل خانے میں ترکی ترجمان کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا۔ بغداد کے بعد ان کا تبادلہ قسطنطنیہ کے برطانوی سفارت خانے میں ہو گیا۔ یہاں انہیں ترکی کے نئے ادب اور نئے لکھنے والوں اور سیاسی انقلابیوں کے بہت قریب رہنے کے مواقع ملے۔ قسطنطنیہ کے بعد ان کا دوسرا پسندیدہ شہر بوڈاپیسٹ تھا۔ یہ پہلی جنگ عظیم سے قبل کا یورپ تھا۔ جنگ چھڑنے سے کچھ عرصہ قبل ان کا تبادلہ شکست خوردہ افغان بادشاہ امیر یعقوب خان کے پولیٹیکل سکریٹری کے عہدہ پر کر دیا گیا جو کہ انگریزوں کے قیدی کی حیثیت سے مسوری اور دہرہ دون میں نظر بند رہے۔ 1910 میں وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1912 میں ان کی شادی نذر زہرہ بیگم سے ہوئی جو کہ ادبی دنیا میں نذر سجاد حیدر کے نام سے مشہور ہیں۔ معزول افغان بادشاہ کے انتقال کے بعد فارن آفس سے ان کی خدمات یوپی سروس میں منتقل کر دی گئیں۔ 1920 میں ایم اے او کالج کو یونیورسٹی کا درجہ ملا تو 26 مارچ 1921 کو یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار کی حیثیت سے یلدرم کا تقرر کیا گیا۔ اس دوران انہوں نے صدر شعبہ اردو کے فرائض بھی انجام دئے اور مسلسل آٹھ برسوں تک ان عہدوں پر فائز رہے۔ علی گڑھ قیام کے دوران ہی 20 جنوری 1926 کو ایک بیٹی کی ولادت ہوئی جس کا نام قرۃ العین حیدر رکھا گیا۔ 1928 میں جزائر انڈمان نکوبار کے ریونیو کمشنر کی حیثیت سے پورٹ بلیئر بھیجا گیا۔ ہندوستان واپس آکر وہ غازی پور اور اٹاوہ کے اضلاع میں تعینات رہے۔ 1935 میں خرابی صحت کی بنا پر قبل از وقت سبکدوش ہو گئے۔ اسی برس انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ یلدرم ملازمت کے زمانے ہی سے سیر و سیاحت کے شوقین تھے اور اکثر چھ چھ مہینوں کی رخصت لیکر انگلستان، یوروپ اور ترکی وقت گزار آتے تھے۔ سبکدوش کے باوجود وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں

مشغول رکھتے تھے وہ اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سکریٹری اور یونیورسٹی کورٹ ممبر رہے۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے ممبر اور صدر رہے۔ یلدرم مذہبی اور تنگ نظری سے عاری بہت پکے مسلمان تھے۔ مختلف مذاہب پر ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ ترکوں کے لہجے میں ترکی اور ایرانیوں کے لہجے میں فارسی بولتے تھے۔ عربی بھی روانگی اور شگفتگی سے بولتے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مغربی طرز کی زندگی گزاری لیکن وہ حد سے زیادہ مغربیت کے قائل نہ تھے۔ ان کا طریقۂ فکر حیرت انگیز طور پر سائنٹیفک تھا۔ 11 اپریل 1943 کو یلدرم کا انتقال ہو گیا اور وہ لکھنؤ کے عیش باغ قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

اُردو کے اولین افسانہ نگار سید سجاد حیدر یلدرم، پریم چند اور علی محمود تینوں کا نام قابل ذکر ہے۔ لیکن ان میں اولاً سب سے زیادہ شہرت سجاد حیدر یلدرم کی ہے ان کو اردو کا پہلا افسانہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ 1900 میں رسالہ معارف میں شائع یلدرم کا افسانہ ''نشہ کی پہلی ترنگ'' کو پریم چند سے پہلے کا افسانہ مانا گیا ہے اسی سال یلدرم کا دوسرا افسانہ ''مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'' بھی شائع ہوا جسے قرۃ العین حیدر اردو کا پہلا افسانہ تسلیم کرتی ہیں۔ یلدرم نے افسانوں کے ساتھ ساتھ اردو ناول نگاری پر بھی توجہ دی۔ 21 برس کی عمر میں 1902 میں انہوں نے احمد حکمت کے ترکی ناول ''ثالث بالخیر'' کا اردو ترجمہ کیا۔ التماس مترجم میں وہ لکھتے ہیں:

''میری تمنا یہ تھی کہ کسی طرح ترکوں کے قصے ترجمہ ہوں اس سے نہ صرف ہماری ناولوں کے لٹریچر میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا بلکہ ترکوں کی سوشل زندگی کا اصلی نقشہ بھی ہمیں نظر آ جائے گا۔ ترکوں کی سوشل زندگی کی تصویر کی میں اردو میں اس لئے ضرورت سمجھتا تھا کہ ہماری سوسائٹی اور طرز معاشرت میں جو انقلاب پیش آ رہا ہے وہ انہیں بھی پیش آ چکا ہے اس وجہ سے ہمیں اس نقشے سے معلوم ہو جائے گا کہ اس منزل سے وہ کس طرح گذرے ہیں اور اب کہاں ہیں''۔

ان کے دیگر اہم ناولوں میں ''زہرا'' ''مطلوب حسینہ اور'' آسیب الف'' وغیرہ شامل ہیں یلدرم کی رومانیت خالص مغربی اور ترکی کی رومانیت تھی۔ انہوں نے اپنی تخلیقات میں عورت کا ذکر اس انداز سے کیا کہ اب وہ چلمن کے پیچھے سے جھانکنے والی عورت نہ تھی۔ وہ عورت کو اپنے برابر

اپنے ہمراہ لانا چاہتے تھے جو ہندوستان میں ناممکن تھا۔ انہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں لڑکیوں کو لکھنؤ اور دلی کی حویلیوں کی چہار دیواری سے نکال کر بمبئی کی چوپاٹی پر کھلی ہوا میں سانس لیتا دیکھنے کی تمنا کی۔ اس لئے انہوں نے ہندوستان سے باہر ترکی کو اپنا آئیڈیل بنایا جہاں یوروپین اقوام کے قرب کی وجہ سے زندگی کی لہر زیادہ تیز ہو چکی تھی۔ یلدرم نے ناول نویسی پر ایک مضمون بھی لکھا جو معارف اکتوبر 1898 میں شائع ہوا۔ انہوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے لئے جو لہجہ اختیار کیا وہ نہایت دلچسپ اور اثر دار ہے۔

سجاد حیدر یلدرم کی شریک حیات اور قرۃ العین حیدر کی والدہ **نذر سجاد حیدر** بھی اپنے دور کی معروف ادیبہ تھیں۔ ان کا شیعہ سادات خاندان بھی یلدرم کے سادات خاندان کی طرح صدیوں سے علمیت اور کلچر کا گہوارہ رہا تھا۔ ان کی پھوپھی ہمشیرہ نذر الباقر نے ''گودڑ کا لال'' ناول تخلیق کیا۔ ملکہ عالم نور جہاں کے عہد میں نیشا پور ایران کا یہ خاندان جہاں گیر کے دربار میں مدعو کیا گیا تھا۔ اس خاندان کے جانشین خان بہادر سید نذر الباقر کی بڑی بیٹی نذر زہرہ بیگم تھیں جو سجاد حیدر یلدرم کی شریک حیات بن کر حلقہ ادب میں نذر سجاد حیدر کے نام سے مشہور ہوئیں۔ وہ خود بھی ایک صاحب طرز ادیبہ تھیں۔ انہوں نے قدامت پسندی اور طبقہ نسواں کے استحصال کی گھنانی رسموں کے خلاف زبردست احتجاج کیا۔ نذر سجاد حیدر کی ولادت 1894 میں صوبہ سرحد میں ہوئی تھی۔ ان کے پردادا معصوم علی مصنف ''انشائے معصوم'' سلطنت اودھ میں ناظم اور چکلہ دار تھے اور ان کے دادا خان بہادر میر قائم علی کو پنجاب کے قانون اراضی کی تشکیل و تنظیم کے لئے منتخب کیا گیا۔ نذر کے والد سید میر نذر الباقر فوج کے محکمہ سپلائی میں بطور ایجنٹ صوبہ سرحد میں مامور رہے۔

شادی سے قبل وہ بنت نذر الباقر کے نام سے ''تہذیب نسواں''، ''پھول'' وغیرہ رسائل میں مستقل کالم اور مضامین وغیرہ لکھا کرتی تھیں۔ نذر سجاد حیدر کا پہلا ناول ''اختر النساء بیگم'' 1908 میں دارالاشاعت لاہور سے شائع ہوا۔ اس وقت ان کی عمر صرف 14 برس تھی۔ انہوں نے سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور تحریک نسواں کی وہ علمبردار تھیں۔ قرۃ العین حیدر کی ہندوستان واپسی کے دوران وہ بیٹی کے ہمراہ ہندوستان چلی آئیں۔ طویل علالت کے بعد نذر سجاد

حیدر کا 19 اکتوبر 1967 کو بمبئی میں انتقال ہو گیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

معروف افسانہ نگار **سید علی کوثر چاند پوری** 18 اگست 1900 میں قصبہ چاند پور میں پیدا ہوئے وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے اور ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔ انہوں نے افسانوں کے ساتھ ہی ناول بھی تخلیق کئے۔ ان کی تخلیقات میں غریب طبقے و عسرت و محرومی و ناکامی اور طبقاتی کشمکش کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ ان کے شاہ کار ناولوں میں ''پتھر کا گلاب'' ''سب کی بیوی'' ''ویرانہ'' ''پیاسی جوانی'' ''اغوا'' ''توڑ دو زنجیریں'' ''مسکراتی کلیاں'' ''مہکتی بہاریں'' ''عشق نہ دیکھے'' ''گونگا ہے بھگوان'' ''میری شام غزل'' ''مرجھائی کلیاں'' کے نام قابل ذکر ہیں۔

ضلع بجنور ہی کہ قصبہ نہٹور کے جاگیردار سادات گھرانے کی جانشین **قرۃ العین حیدر** کی پیدائش 20 جنوری 1926 کو علی گڑھ میں ہوئی جب ان کے والد سجاد حیدر یلدرم یونیورسٹی رجسٹرار کے عہدے پر وہاں معمور تھے۔ جبکہ خود قرۃ العین حیدر اپنی یوم پیدائش 20 جنوری 1928 لکھتی ہیں۔ ان کے نکڑ دادا سید حسن ترمذی وسط ایشیا سے ہندوستان آئے تھے۔ ان کے خاندان میں علم کی وراثت نسل در نسل منتقل ہوتی رہی تھی اور ان کے گھرانے کی عورتیں بھی پڑھی لکھی تھیں۔ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم اور والدہ نذر سجاد حیدر دونوں ہی مشہور قلمکار اور ادیب تھے۔ قلمکار والدین کی سرپرستی میں انہیں ادبی افق پر پروان چڑھنے کے مواقع میسر ہوئے۔

قرۃ العین حیدر کی ابتدائی زندگی پورٹ بلیر جزائر انڈمان نکوبار میں گزری اور ابتدائی تعلیم انہوں نے دہرہ دون میں حاصل کی۔ پھر وہ لکھنؤ کے مشہور ازبیلا تھوبرن کالج میں داخل ہوئیں۔ 1947 میں ہندوستان جب تقسیم کے پر آشوب دور سے گزر رہا تھا انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے گورنمنٹ اسکول آف آرٹس لکھنؤ اور ہیڈ میز اسکول آف آرٹس لندن میں آرٹ کی تعلیم حاصل کی۔ رقص اور موسیقی سے بھی انہیں کافی لگاؤ تھا۔ قرۃ العین حیدر نے پہلی کہانی صرف چھ برس کی عمر میں لکھی۔ تاہم ان کی یہ کہانی کہیں شائع نہیں ہوئی۔ ان کی پہلی تخلیق بی چوہیا کہانی بچوں کے اخبار ''پھول'' لاہور میں شائع ہوئی جبکہ ان کی عمر تیرہ برس تھی۔ پانچ سال بعد ان کی کہانی یہ باتیں لاہور کے مشہور رسالے

''ہمایوں'' میں 1942 میں شائع ہوئی۔

تقسیم ملک کے بعد وہ کچھ مدت پاکستان میں اپنے بھائی کے ساتھ سکونت پذیر رہیں۔ 1950 میں وہ پاکستانی وزارت اطلاعات ونشریات میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئیں اور لندن میں پاکستان ہائی کمیشن میں پریس اٹیچی کی حیثیت سے بھی تعینات رہیں۔ اس دوران انہوں نے بی بی سی لندن میں بھی کام کیا۔ وہ ڈاکیومنٹری فلموں کے پروڈیوسر کے علاوہ پاکستانی کوارٹرلی کے ایکٹنگ ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتی رہیں۔ کچھ دنوں انہوں نے پاکستان ایئر لائنز میں بھی کام کیا۔ اسی دوران ان کا شہرت یافتہ ناول ''آگ کا دریا'' 1959 شائع ہوا جس پر پاکستان میں ایک بحث وتنازعہ شروع ہوگیا اور پھر چھٹے دہے کے ابتدائی برسوں میں وہ اپنی والدہ نذر سجاد حیدر کے ہمراہ مستقل طور پر ہندوستان آگئیں۔ 68-1964 کے دوران وہ امپرنٹ بمبئی کی کیریر ایڈیٹر رہیں۔ 1968 سے 1975 کے دوران وہ مشہور انگریزی ہفتہ وار السٹریٹیڈ ویکل آف انڈیا کی معاون مدیر رہیں۔ وہ سنٹرل بورڈ آف فلمز سے بھی منسلک رہیں اور انہوں نے'' ایک مسافر ایک حسینہ'' کی کہانی بھی لکھی۔ 1967 میں انہیں افسانوں کے پہلے مجموعے'' پت جھڑ کی آواز'' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ دیا گیا۔ 1969 میں انہیں روسی ناولوں کے تراجم پر سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ عطا کیا گیا۔ 82-1984 میں وہ شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وزیٹنگ پروفیسر رہیں۔ 1984 میں انہیں ''پدم شری'' اور'' غالب ایوارڈ'' عطا کئے گئے۔ 1988 میں انہیں ''اقبال سمان'' عطا کیا گیا۔ 1990 میں انہیں ان کی گراں قدر ادبی خدمات پر ہندوستان کا سب سے بڑا اعزاز'' گیان پیٹھ'' ایوارڈ عطا کیا گیا۔

2000 میں انہیں بہادر شاہ ظفر ایوارڈ دیا گیا۔ ان کو دوحہ قطر کا انٹرنیشنل ''فروغ اردو ایوارڈ'' بھی عطا کیا گیا۔ نوبل پرائز کے لئے بھی ان کا نام پیش کیا گیا۔ طویل علالت کے بعد 21 اگست 2007 میں نوئڈا میں ان کا انتقال ہوا اور جامعہ کے قبرستان میں ان کو سپردِ خاک کیا گیا۔

قرۃ العین حیدر نے ناول نویسی کو نئی جہت عطا کی ان کا پہلا ناول ''میرے بھی ہیں صنم خانے'' 1949 میں شائع ہوا۔ اس ناول میں انہوں نے بیسویں صدی کے لکھنؤ کے تہذیب و

تمدن کو پیش کیا ہے جو تقسیم ملک سے بری طرح متاثر ہوا۔ 1952 میں ان کا دوسرا ناول ''سفینۂ غم دل'' شائع ہوا جس کا موضوع بھی پہلے ناول سے ملتا جلتا تھا۔ 1959 میں ان کا مشہور'' ناول آگ کا دریا'' پاکستان قیام کے دوران شائع ہوا۔ یہ ناول تاریخ ساز ثابت ہوا اور اس نے اردو ناول کو ایک نئی سمت عطا کی۔ اس کا موضوع وقت ہے۔ قدیم ہند کی دریافت اس ناول کی دوسری خصوصیت ہے۔ اس ناول میں ڈھائی ہزار سال کے تاریخی پس منظر کو ناول کے وسیع کینوس پر پھیلا کر برصغر کی ہزاروں سال کی تہذیب وتمدن تاریخ فلسفے اور رسم ورواج کے مختلف رنگوں میں ایک ایسی تصویر ہمارے سامنے پیش کی گئی جو ہمارے ذہن وضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ عالمی شہرت یافتہ اس ناول کا انگریزی ترجمہ River OF Fire کے نام سے خود قرۃ العین حیدر نے کیا۔ اس کی رسم اجراء 1999 میں نہرو سینٹر لندن کی ایک تقریب میں برطانوی شاعرہ ڈاکٹر کتھیلین این کے دست مبارک سے ہوئی اس تقریب میں قرۃ العین حیدر بھی موجود تھیں۔

2008 کے نوبل پرائز سے سرفراز جرمن ادیب جان میرل کلج نے ایک سوڈش صحافی نینا لیکندرے کو دیئے انٹرویو میں کہا تھا۔ ''اس سے زیادہ اس ادبی انعام کے حقدار دوسرے ادیب تھے خصوصاً فرانسیسی زبان کے ادوارد گلیساں اور دوسرے قرۃ العین حیدر۔ وہ (قرۃ العین حیدر) ہندوستان کی ہیں۔ جو اردو میں لکھتی ہیں۔ مگر اپنے ناول ''آگ کا دریا'' کا ترجمہ خود انہوں نے ''River Of Fire'' کے نام سے کیا اس کتاب کو پڑھ کر دیکھو''۔ قرۃ العین حیدر کو ''نوبل پرائز'' نہ مل سکا یہ الگ بات ہے مگر نوبل پرائز ونر نے خود قرۃ العین حیدر کو مذکورہ انعام کا حقدار ثابت کر کے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔ یہ بات کسی نوبل پرائز سے کچھ کم نہیں ہے۔

1971 میں ناول ''آخر شب کے ہمسفر'' شائع ہوا جس کا ہندی ترجمہ ''نشانت کے سہیا تیری'' کے نام سے شائع ہوا۔ ''کار جہاں دراز ہے'' سوانحی ناول ہے جو تین جلدوں میں شائع ہوا اور اپنی طرز کا اردو ادب میں یہ پہلا ناول ہے۔ 1988 ''میں گردشِ رنگ چمن'' اور 1989 میں ''چاندنی بیگم'' شائع ہوا۔ انہوں نے چار ناولٹ ''دلربا''، ''سیتا ہرن''، ''چائے کے باغ''، ''اگلے جنم موہے بیٹا نہ کیجو'' بھی تخلیق کیے۔ انہوں نے مشہور انگریزی ناولوں کے اردو ترجمے بھی کیے ان

میں ہمیں چراغ ہمیں پروانے (ہنری جیمس) آپس کے گیت، (واسل بائی کوف) ماں کی کھیتی (چنگیز اعتمادوف) آدمی کا مقدر (میخائل ثولوخوف) کلیسا میں قتل (ٹی ایس ایلیٹ) تلاش (ٹرومین کایوٹ)۔

قرۃ العین حیدر نے سماجی اور تہذیبی تاریخ کے خزانوں سے بیش از بیش فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے زرخیز تخیل اور بے بہا تخلیقی ذکاوت سے تاریخی حقائق کو زندہ اور متحرک پیکروں میں ڈھال دیا ہے قرۃ العین حیدر نے ایک ایسی مشترکہ تہذیب کے گن گائے اور اپنے تہہ دار کرداروں میں ایسی ہندوستانی شخصیت کو اجاگر کیا جن کا خمیر کئی قوموں اور نسلوں کے تہذیبی اختلاط کا رہین منت ہے۔ وہ ہندوستانی تہذیب اور افکار و اقدار کو ایک نامیاتی وحدت کے روپ میں دیکھتی ہیں اور اپنے ناولوں اور کہانیوں کے تارو پود میں ہنر مندی سے سمو دیتی ہیں بلاشبہ ایسے عہد ساز اور با کمال تخلیق کار کہیں صدیوں میں جنم لیتے ہیں۔

برصغیر کے معروف سائنسی ناول نگار **اظہار اثر** قصبہ کرتپور میں 1928 میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے مقامی مدرسے میں حاصل کی۔ ہوش سنبھالنے پر انہوں نے اپنے گھر کو معاشی مسائل سے دوچار پایا اور ان کے حل کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ محض پندرہ برس کی عمر میں تلاش معاش نے ان کو 1943 میں لاہور کی ہجرت پر مجبور کر دیا۔ لاہور کے ادبی ماحول سے وہ متاثر ہوئے اور احسان دانش کی شاگردگی اختیار کی۔ روزگاری معاملات سے فرصت پا کر فکشن و شاعری کی طرف توجہ کرنے لگے۔ 1950 میں وہ دہلی واپس آئے اور دہلی کی شعری محفلوں نے ان کے ذوق و شوق کو جلا بخشی۔ دہلی میں انہوں نے ''چلمن'' اور ''بانو'' کی ادارت کے فرائض انجام دئے اور آریہ ورت کے نائب مدیر رہے شاعری کے ساتھ ہی اثر نے افسانہ نگاری اور ناول نویسی کی جانب توجہ مرکوز کی۔ 1952 میں ان کا پہلا ناول ''ناگن'' شائع ہوا جو ادبی حلقوں میں بیحد مقبول ہوا۔ اظہار اثر نے موپاساں اور روسی ادیب گورکی کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا جنہوں نے ان کے ذہن و دماغ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ ''موت کے بعد''، ''بشارت''، ''فرعونہ'' عمدہ ناول ہیں اور ادب کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کا کئی زبانوں میں ترجمہ ہو

چکا ہے۔اظہار اثر انڈو پاک کے پہلے سائنسی شاعر اور ناول نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ان کی منظرِ عام پر آنے والی تخلیقات کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔

2011 میں اظہار اثر کا انتقال ہو گیا۔ان کے ناولوں میں ''آدھی قیامت''''چیخ'' ''بیس ہزار سال بعد''''مشینوں کی بغاوت''''شیطان''''زندہ بہرے''''آدھی زندگی''، پتھر کے پھول، دو آنکھیں، مہربان کیسے کیسے، ثمر، جاسوسی ناولوں میں،''وفادار قاتل''،''دہلے پہ نہلا''، ''الٹی سازش''، سنہری دھوپ، پتھر کی لاش، آسیبی ناولوں میں ''بھوتوں کا شہر''، ''موت کے بعد''، ''کھلونا''، ''چمگادڑ''، ''چیخ'' اور ''خلیج'' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

مشہور ناول نگار **ڈاکٹر ذکاء الرب رباب** 6 نومبر 1930 کو ضلع بجنور کے قصبہ شیر کوٹ کے جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے والد خان بہادر حاجی مولوی عبد الرب ضلع مجسٹریٹ تھے جو علی گڑھ وغیرہ اضلاع میں تعینات رہے۔ذکاء الرب نے ابتداء سے لیکر اعلیٰ تعلیم تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔انہوں نے بی اے، ایل ایل بی، ایم اے اردو اور پی ایچ ڈی کی تعلیم حاصل کی۔ڈاکٹر ذکاء الرب پانچ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے وہ ہاکی کے کپتان اور اسٹوڈینٹس یونین کے سکریٹری رہے۔ملک کی تقسیم کے دوران اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ یہ بھی پاکستان ہجرت کر گئے مگر وہاں دل نہ لگنے پر واپس ہندوستان لوٹ آئے۔''اردو تنقید پر مغربی اثرات'' کے موضوع پر انہوں نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔فلم صنعت سے متعلق کورس لندن سے کیا۔فلم ڈائریکشن کے ساتھ ہی اداکاری میں بھی ان کی دلچسپی رہی ہے۔ انہوں نے ''میلہ'' وغیرہ متعدد فلموں میں اسسٹینٹ ڈائیریکٹر کے فرائض انجام دئے۔ڈائیریکٹر یوسف خان تھے۔کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی وغیرہ ان کے آئیڈیل رہے ہیں۔ شروع میں انہوں نے افسانے لکھے اور شاعری بھی کی۔''وقت نے کیا ستم بنادیا ہمیں کسان'' ان کی مشہور نظم ہے۔اب تک ان کے 17 ناول شائع ہو چکے ہیں جو سب کے سب پاکستان میں شائع ہوئے اس بارے میں ڈاکٹر ذکاء الرب فرماتے ہیں کہ فلمی زندگی کے آغاز کے دنوں میں جن رسائل کے مدیران سے مراسم تھے وہ سب کے سب پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ جب وہ

ہندوستان اپنے عزیز رشتے داروں سے ملنے آتے تو ان کے ناولوں کے مسودے ساتھ لے جاتے اور پاکستان میں شائع کرتے۔ ان کے پہلے "ناول ہاتھ جو تھامے میت وہی ہے"۔ پر حکومت پاکستان نے نہ صرف فحاشی کے الزام میں پابندی عاید کی بلکہ ناول کی جلدیں بھی ضبط کر کے تلف کرادی۔ فحش کتاب چھاپنے پر پبلشر پر پانچ ہزار کا جرمانہ اور مصنف کی کتابوں کی اشاعت پر دو سال کے لئے پابندی عاید کردی۔ جبکہ مصنف ہندوستان میں رہائش پذیر ہونے کے سبب سزا سے بچ گئے۔

اس ناول میں انہوں نے ٹوکیو کے نائٹ کلب کی نیم برہنہ زندگی کی عکاسی کی تھی۔ رباؔب نے ترقی اور آزادی کے نام پر کی جانے والی عیاشی اور بے راہ روی پر سخت تنقید کی تھی۔ اس ناول کے پیش لفظ میں انہوں نے یہ شعر قارئین کی نظر کیا تھا۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پے لے آیا ہوں میں
محو حیرت کیوں ہو تم اپنی ترقی دیکھ کر

ان کے دیگر ناولوں میں "انتقام"، "تجھ بن تیری بینا روئے"، "خدا کرے کہ قیامت ہو اور تو آئے"، "شوگران کی چاندنی"، "ہم بھی تیرے دل بھی تیرا" "سیاہ کار"، "جب جب تیری یاد آئے گی"، "ٹوٹ گیا تاج محل"، "کیا دل پے چوٹ کھائی"، "منزلیں کھو گئیں"، "چٹکیاں"، "کمال الدین قتل کیس"، "مس نینسی مودی قتل کیس"، "آنکھوں کے تارے"، "جدید الفت کیس"، "شیر کوٹ کی کہانی" قابل ذکر ہیں۔ ایک خوشحال جاگیردار گھرانے کے جانشین ہونے کے سبب عیش و اسائش کی زندگی انہیں حاصل رہی۔ خواہشوں کی تکمیل میں پیسے کی کمی کبھی ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنی انہوں نے درجن بھر ملکوں کی سیر و سیاحت کی ان ممالک میں لندن، جاپان، پاکستان، قطر دوحہ، ایران، پرتگال، ادمان، اٹلی، برما، عراق، بنگلہ دیش، کناڈا وغیرہ شامل ہیں۔ وہ خود بتاتے ہیں کہ ان کا ہر ایک سفر ایک ناول کی تخلیق کا سبب بنا۔

انہوں نے اپنی بیگم فردوس جہاں کے ساتھ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ 27 مئی 2015 کو وہ انتقال فرما گئیں۔ ان کی موت کے صدمے سے ڈاکٹر ذکاء الرب ابھی بھی ابر

نہیں پائے ہیں۔ لکھنا پڑھنا سب بھول گئے ہیں پرانی یادیں بھی یاد کرنے میں انہیں وقت لگتا ہے۔ فی الحال وہ اپنی آبائی ''موروالی کوٹھی'' میں جو کہ ان کے جاگیردارانہ دور کی حسین یادگار ہے رہائش پذیر ہیں اور اپنے اجداد کے ورثے کو محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ ہم ان کی صحت اور عمر درازی کے لئے دعا گو ہیں۔ (جون 2016 میں ہوئی ملاقات تک کے حالات)

نہٹور چیئر مین سید شمیم حسین زیدی کے بھانجے **محمد خالد** اور اس کی پولش نژاد یہودی امریکن بہو **مسز لنڈا** جوان کی حیات میں اکثر نہٹور آیا کرتے تھے۔ دونوں نے مل کر نہٹور کی اپنی شاخ اور اس کے پاکستان انخلاء کے متعلق ایک رومانی ناول ''رفیوجی'' تخلیق کیا۔

ناول نگار **ثروت ذکی** نہٹور کے مشہور و معروف کمیونسٹ لیڈر داروغہ سید اقبال حسین زیدی کی صاحبزادی ہیں۔ 6 اکتوبر 1935 میں ان کی ولادت ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے بعد انہوں نے پرائیویٹ طور پر بی اے پاس کیا۔ گھر کے سیاسی اور ادبی ماحول نے ان کے ذہن کو بھی متاثر کیا اور ان میں لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ نہٹور کی گانگن ندی پر انہوں نے پہلی نظم کہی اس وقت ان کی عمر 11 برس تھی۔ ان کی تحریر کردہ کہانیاں اور غزلیں ''بیسویں صدی''، ''بانو'' اور ''شمع'' وغیرہ رسائل کی زیب و زینت بنیں پروفیسر ثریا حسین نامور ادیبہ قرۃ العین حیدر ان کی رشتے کی بہنیں ہیں ان سے ان کے گہرے مراسم رہے۔ ثروت ذکی خواجہ احمد عباس علی سردار جعفری وغیرہ ادبی شخصیات سے متاثر رہی ہیں۔ ان کے بھائی شوکت اقبال بھی شاعر تھے اور والد محترم بھی ادبی ذوق رکھتے تھے۔ اپنے بارے میں وہ کہتی ہیں...... ''جو کچھ بھی آج میں ہوں اپنے والد ماجد کے بے پناہ پیار اور تربیت کی بدولت ہوں۔ طبیعت بے انتہا حساس پائی ہے۔ غم کہیں بھی ہو کسی کا بھی ہو میرے ذہن کو ضرور بوجھل کر جاتا ہے۔ ہمہ وقت ایک عجیب سی بے چینی اور انتشار چھایا رہتا ہے جس کی وجہ بعض اوقات کچھ بھی نہیں ہوتی۔ شاعری کا بھی شوق رہا ہے چند غزلوں اور تھوڑی سی آزاد نظموں کا ایک مختصر سا سرمایہ بھی ہے میرے پاس''۔

1956 میں سید محمد ذکی صاحب سے ان کی شادی ہوئی جو مقامی حافظ محمد ابراہیم انٹر کالج کے استاد رہے اور پرنسپل عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ ناول ''خواب زخمی ہیں'' کی تخلیق کے

بارے میں وہ فرماتی ہیں کہ شروع میں جہیز کے مسئلے پر افسانہ لکھنا شروع کیا تھا جو پھیل کر ناول میں تبدیل ہوگیا۔ حالانکہ اس کی ابتداء شادی سے پہلے ہی ہو چکی تھی مگر یہ مکمل شادی کے بعد ہو سکا اور 1983 میں سیمانت پرکاشن نئی دہلی سے شائع ہوا۔ جسے اردو اکادمی نے ایوارڈ سے نوازا۔ اس ناول کا ہندی ترجمہ ''بکھرے سپنے'' عنوان سے 1988 میں شائع ہوا ترجمہ کے فرائض ہندی ادیبہ نمرتا پال نے انجام دیئے۔ اس کے پیش لفظ میں وہ ناول کے بارے میں لکھتی ہیں۔ ''جہیز کے مسئلے پر لکھی جانے والی کوئی بھی تحریر بہت اہم ہے۔ موضوع کی اہمیت اور معنویت نے ثروت ذکی کے ناول کی جانب میری توجہ مرکوز کی۔ اس ناول کو پہلے سرسری طور پر پڑھنے پر مجھے یہ دلچسپ لگا اور پھر اس کا ترجمہ کرتے وقت یہ محسوس ہوا کہ حالانکہ ثروت ذکی ایک مسلم خاتون ہیں لیکن ہندو سماج سے ان کی پہچان اتنی گہری ہے کہ ان کے تخلیق کردہ کردار کہیں بھی بناوٹی نہیں لگے۔ کہانی بھی اس ڈھنگ سے کہی گئی ہے کہ ناول پڑھتے وقت یہ یاد نہیں رہتا کہ ہم کتاب پڑھ رہے ہیں۔ لگتا ہے کہ جیسے اپنی ہی گلی میں اپنے ہی کہیں آس پاس ہم ان واقعات کو رونما ہوتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں''۔

اس ناول کے بعد کوئی دوسری تخلیق منظر عام پر نہ آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے ثروت ذکی کہتی ہیں۔...... ''لکھنے کی مصروفیت میں اس روز انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ کھیلتے ہوئے ان کے بچوں نے کب آگ لگالی۔ اس حادثے کے بعد ساس امی کی سخت سست باتوں سے دل برداشتہ ہو کر پھر کچھ نہیں لکھا بس سارا وقت بچوں کی پرورش کے لئے وقف کر دیا''۔ شوہر کے انتقال کے بعد بھرے پورے گھر میں وہ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ضعف اور بیماریوں کی یلغار نے ان کے حافظے پر بھی اثر ڈالا ہے ہم ان کی صحت مندی اور لمبی عمر کی دعا کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ رفعت سروش، نور بجنوری، فرقان صدیقی پرنسپل ابوالحسن، رخشندہ روحی، شمشاد ندیم، نجمہ عزیز، عزیز مرادآبادی اور سالک دھامپوری وغیرہ نے بھی ضلع بجنور کی ناول نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ڈاکٹر ایم۔ اسلم صدیقی کے تین ناول ''فساد''، ''گوری آنکھیں کالی چھایا'' اور ''کالی شال'' کے بھی جلد منظر عام پر آنے کی توقع ہے۔

آخر میں یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ اردو ناول نگاری کی ڈیڑھ سو برس پرانی تاریخ کا آغاز جہاں سرزمین ضلع بجنور سے ہوا وہیں ناول نگاری کو نئی سمت اور نئی جہت عطا کرنے میں بھی ضلع بجنور کا ہاتھ رہا ہے وہیں عصر حاضر میں بھی ضلع بجنور کے قلمکار ناول نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے کے لئے ہمہ تن مصروف ہیں۔ ناول نویسی میں ضلع بجنور کے فکشن نگاروں کی خدمات کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔

ڈاکٹر ایم اسلم صدیقی

نہٹور (بجنور)

9897423570

aslamaligarh@gmail.com

اردو کی اسکالر۔ عالیہ

ڈاکٹر شیخ نگینوی

کروڑی مل کالج دہلی یونیورسٹی کے 84 کالجوں میں سے ٹاپ ٹین کی فرست میں شمار ہوتا ہے۔ یہ کالج اپنے ایلیٹسٹ رویوں کے لئے جانا جاتا ہے۔اس کالج کے طالب علموں میں کردپ سنگھ (گورنر آسام)، پروفیسر کے۔ ایم اشرف، ڈاکٹر خلیق انجم، کامل قریشی اور خالد اشرف جیسے نابغہ روزگار بطور استاد وابستہ رہے ہیں تو دوسری جانب امیتابھ بچن، ششی کپور، سونو نگم، فلم ہدایت کار علی عباس ظفر جیسے اداکار اور فنکار اس کالج کے طالب علم رہے ہیں۔ کروڑی مل کالج کی ہی ایک اور طالبہ عالیہ بنت عرفان کالج کی تعلیم و تربیت اور اپنی صلاحیت کی بنا پر اسپورٹس، این سی سی تقریری مقابلوں اور ادبی سیمناروں میں شناخت قائم کر رہی ہے۔

بارہ دری بلی ماران کی دہلی ساکن محمد عرفان اور رضیہ رحمٰن کی دختر عالیہ ایک ذہین طالبہ ہیں۔ کروڑی مل کالج سے بی۔اے (آنرس) اردو میں ٹاپر رہی عالیہ دہلی یونیورسٹی اردو ڈپارٹمنٹ کی ایم۔اے اور ایم فل کی بھی ٹاپر رہی ہے۔ ایم فل میں عالیہ کا عنوان ''پروفیسر رفیع الدین ہاشمی بحیثیت ماہر اقبالیات'' رہا ہے۔ شطرنج کی کھلاڑی عالیہ نے اپنا میدان اردو کو بنایا اور اب وہ تحقیق میں لگی ہے۔ پی ایچ ڈی میں ان کی تحقیق کا موضوع ''پاکستان میں اردو غزل 1970 کے بعد'' ہے۔ وزیر اعلیٰ دہلی شیلا دکشت کے بدست اعزاز حاصل کرنے والی عالیہ کو اردو اکادمی دہلی سے بھی اعزاز مل چکا ہے۔ ''اردو ساہتیہ پر ہندی بھاشہ کا پربھاؤ'' عنوان سے انٹرنیشنل ای میگزین میں

تحقیقی مضمون شائع ہوا ہے۔

عالیہ نے ''تزک تیموری'' کا اردو سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ غالب، اقبال، داغ دہلوی، حالی، اختر الایمان، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ اردو کی شخصیات پر عالیہ اپنے پر مغز مقالے سیمینار میں پیش کر داد تحسین حاصل کر چکی ہے۔ عالیہ نے بین الاقوامی سطح پر شہرت یافتہ پروگرام ''انٹر کشن وِد مرزا حامد بیگ (مشہور پاکستانی افسانہ نگار) کے علاوہ شمس الحق عثمانی، زبیر رضوی اور پروفیسر خالد علوی سے الگ الگ مکالمہ کیا۔

اسپورٹس مین اسپرٹ رکھنے والی شطرنج کی چالوں سے بخوبی واقف اردو میں اپنا روشن مستقبل دیکھ رہی عالیہ سے اردو ادب کو بھی امیدیں وابستہ ہیں کہ ''اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ''۔

❖❖❖

کشت بجنور کی زعفرانِ شعر

عالیہ

سرزمین بجنور میں اوّلین معروف ومقبول شاعر قائم چاند پوری کا نام لیا جاسکتا ہے۔ایسا نہیں ہے کہ اس سے قبل بجنور میں شعروادب کا چراغ روشن نہ ہوا ہوگا کیونکہ کوئی بھی بڑا شاعر اچانک منصۂ شہود پر نمودار نہیں ہو جاتا بلکہ صدیوں کے تخلیقی عمل کا ثمرہ ہوتا ہے۔اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قائم سے قبل بھی قابلِ ذکر شاعر ہونگے لیکن ان کے بارے میں معلومات ہمارے پاس نہیں ہے۔قائم کے ہمعصروں میں تو کئی شعراء کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

قائم کے برادرِ بزرگ محمد منعم بھی خوش گو شاعر تھے۔میر حسن نے اپنے تذکرے "تذکرہ شعرائے اردو" میں ان کے پختگی کلام کی داد دی ہے۔

"منعم تخلص، برادرِ بزرگ میاں محمد قائم، از مشاہیراں نیست لیکن شعر رتبہ داری گوید، از کلامش ظاہرست" (ص۔۱۵۷)

یعنی میاں محمد قائم کے بڑے بھائی ہیں اگرچہ مشہور نہیں ہیں لیکن کلام سے پختگی ظاہر ہے۔قائم نے بھی اپنے تذکرے میں ان کے اشعار کا حوالہ دیا ہے۔

بھولی نہیں ہے مجھکو بتوں کی ادا ہنوز　دل کی نگیں پہ نقش ہے نام خدا ہنوز
آنکھوں میں کس کے اپنے نگاریں کا نقش ہے　ٹپکے ہے جائے اشک جو رنگِ حنا ہنوز

ہوسکتا ہے کہ محمد منعم جز وقتی شاعر ہوں لیکن ان کی قدر ومنزلت اس درجہ ضرور تھی کہ دلی

کے بزرگ شعراء سے ان کے قریبی روابط تھے اور بعض شعراء سے اس درجہ تعلق خاص تھا کہ باقاعدہ آمد و رفت تھی۔ ڈاکٹر خالد علوی نے قائم چاند پوری کے حوالے سے خبر دی ہے کہ انہوں نے (قائم نے) فائز دہلوی کو اپنے بڑے بھائی کی قیام گاہ پر ہی دیکھا تھا۔ ثابت ہوتا ہے کہ محمد منعم دلی میں اس درجہ باحیثیت ضرور تھے کہ فائز دہلوی جیسے بڑے شعراء بھی ان سے علاقہ رکھتے تھے۔ محمد منعم کے علاوہ اس عہد کے دوسرے بڑے شاعر لالہ خوش وقت رائے شاداب ہیں۔ جس کا ذکر میر حسن نے اپنے تذکرے میں بھی کیا ہے۔

''لالہ خوش وقت رائے، شاداب تخلص مولد او چاند پور ندینہ است'' (ص۔105)

یہاں ہمیں یہ بھی اطلاع ملتی ہے کہ اس وقت صدر مقام بجنور نہیں بلکہ نگینہ ہے اور اس وقت اس شہر کو 'ندینہ' کہا جاتا تھا۔ میر حسن نے شاداب کے کئی اشعار ترجمے میں دیئے ہیں لیکن اس شعر کی داد بطورِ خاص دی ہے۔

دیکھ اس کے منھ پہ زلفِ سیہ فام کے تئیں
کیا زیب دی ہے کفر نے اسلام کے تئیں

قائم نے ''مخزن نکات'' میں بھی شاداب کا ترجمہ شامل کیا ہے اور کئی اشعار کا حوالہ دیا ہے۔

جب تلک ہو کام مژگاں سے تو ابرو مت چڑھا
تیر کے ہوتے کوئی کھینچے بھی ہے تلوار کو

شاداب کے نام 'لالہ' کے لاحقے سے یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ ویش برادری سے تعلق رکھتے ہونگے لیکن ماہنامہ ''ماہِ نو'' کراچی کے مطابق وہ کایستھ قوم سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے خاندان کے افراد چاند پور سے بجنور منتقل ہو گئے تھے اس نسل میں ایک وکیل بھٹناگر گذشتہ چند برسوں تک حیات تھے۔ (قائم اور ان کے ہمعصر۔ خالد علوی۔ تمبر 1992)

شاداب صاحبِ دیوان شاعر تھے افسوس ان کا کلام شائع نہ ہو سکا۔ قائم چاند پوری سے ان کے دوستانہ مراسم تھے لیکن نہ صرف اس عہد کی بلکہ اردو غزل کے ہر عہد کی دیو قامت شخصیت قائم چاند پوری ہیں۔ قائم کو بوجوہ وہ شہرت نہ ملی جس کے وہ مستحق تھے لیکن ان کی اہمیت

ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ محمد حسین آزاد نے ان کو میر تقی میر اور مرزا سودا کا ہم پایہ قرار دیا ہے ۔ میر تقی میر نے ان کو خیرہ وطیرہ اور حسن پرست لکھا ہے اور اپنے تذکرے 'نکات الشعراء' میں اطلاع دی ہے کہ دلّی کے بازار نصر اللہ میں قیام پذیر ہیں، میری بھی ملاقات ہے۔ قائم اپنی ذہنی افتاد کی وجہ سے بادشاہِ وقت محمد شاہ رنگیلا کی ستم کاری کا ہدف بنے اور راہِ فرار اختیار کی۔ ان کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی وہ اس وقت لال قلعہ میں داروغہ توپ خانہ تھے۔ وہ خود سودا کے شاگرد تھے لیکن بہت سے نامور شعراء کے استاد بھی تھے۔ ان کے شاگرد مائل بھی بہت مشہور ہوئے۔ قائم کے کلام کی خوبیوں اور محاسن میں مکمل تصنیف لکھی گئی ہے ان کی غزل میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے اکثر اشعار میں ازبر ہونے کی صلاحیت ہے۔ ان کے لاتعداد اشعار ضرب المثل بن گئے ہیں۔ بدقسمتی یہ بھی ہے کہ ان کے بہترین اشعار دوسرے شعراء سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔ سودا کے کلام میں ان کی کئی مثنویات اور لاتعداد غزلیں شامل ہو گئیں تھیں۔ شیخ چاند، رشید حسن خاں، خالد علوی اور پروفیسر نسیم احمد نے اپنے مضامین اور تصنیفات کے ذریعے ان کی نشاندہی کی۔ اب اکثر غزلیں قائم کے کلام میں واپس شامل کر دی گئی ہیں۔ چند مشہور اشعار ۔

آپ جو کچھ قرار کرتے ہیں کہیئے ہم اعتبار کرتے ہیں

چلئے قائم کہ رفتگاں اپنا دیر سے انتظار کرتے ہیں

مجلس واعظ تو تادیر رہے گی قائم یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

سچ کہو قتل پہ اب کس کے کمر باندھی ہے ان دنوں ہاتھ میں تم رکھتے ہو تلوار بہت

نیک و بد جو تجھے کرنا ہے سو کر لے قائم پھیر امید نہیں یہ کہ جواں ہووے گا

بے دماغی سے نہ اس تک دل رنجور گیا مرتبہ عشق کا یاں حسن سے کب دور گیا

قائم قدم سنبھال کے رکھ کوئے عشق میں یہ راہ بے طرح ہے مری جان دیکھنا

کیوں چھوڑتے ہو دُردِ تہہ جام میکشو ذرہ ہے یہ بھی آخر اسی آفتاب کا

چپ سی کچھ لگ گئی اسے جو کوئی تجھ سے یک بار ہمکلام ہوا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہوس سے ہم کیا تھا عشق اول وہ آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

کس بات پر کروں میں تری اعتبار ہائے اقرار اک طرف ہے تو انکار اک طرف

قائم کے لاتعداد اشعار کا حوالہ دیا جا سکتا ہے لیکن کچھ اشعار پر نظر کرنا اس لئے ضروری ہے کہ قائم نے اپنے استاد سودا کا ذکر کیا ہے۔ مختصر عرصے کے لئے سودا اور قائم میں ناچاقی بھی ہوئی تھی لیکن بہت جلد دل صاف ہو گیا۔ قائم اردو کے واحد شاعر ہیں جنھوں نے اپنے استاد مرزا سودا کی مدح میں طویل قصیدہ کہا اور متعدد غزلوں میں سودا کا ذکر کیا ہے۔

قائم ترے سخن کو شوخی سے مانتا ہے ظاہر میں تجھ سے ناخوش گو ہے، ہزار سودا

سودا تو اپنے حال میں مدت سے مست ہے قائم رہا تھا ایک، سو اپنے وطن گیا

جب کہ ہمراہ لئے دل سا خلل جاؤں گا آگے سودا کے میں لے کر یہ غزل جاؤں گا

سنئے کس کا سخن کہ دل سے مٹے داغ مرزا رفیع سودا کا

سودا کے انتقال پر قائم نے ایک قطعہ بھی لکھا تھا۔ قائم کے بے دماغی کے باوجود ان کی شرافت نفس میں کوئی شبہ نہیں بقول قاضی عبدالودود ''قائم اپنے استاد سودا کا سعادت مند شاعر تھا'' قائم کے بعد عرصہ دراز تک مطلع بجنور پر کسی بڑے ستارہ شعر کی تابانی نظر نہیں آتی اگرچہ غالب کے دو شاگرد بھی بجنور کے رہنے والے تھے لیکن ان میں غالب کی شاگردی کے علاوہ کوئی خوبی نہیں ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دہوں میں عبدالرحمٰن بجنوری قابل ذکر نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی۔ بجنوری کو بہت مختصر سی عمر نصیب ہوئی اگر وہ کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو امکان تھا کہ شعر و ادب میں مزید تحقیقی کامرانیاں حاصل کرتے۔ لیکن یہ امتیاز ان کو حاصل ہے کہ انہوں نے ''نٹ راج'' جیسے موضوع پر نظمیں لکھیں۔ ان کی شاعری میں بعض مقامات پر غالب کے ابتدائی کلام سے ہم آہنگ ہونے کی شعوری سعی نظر آتی ہے۔

صنم فرنگ، قمر جبیں، بہت سیم رنگ، غضب حسیں

وہ عذار نازک شرگیں کہ رقیب ساغر آتشیں

عبدالرحمٰن بجنوری بنیادی طور سے نظم کے شاعر ہیں ان کی اکثر نظمیں طبع زاد ہوتے

ہوئے بھی صدفی صد طبع زاد نہیں معلوم ہوتیں۔ ان کی نظم ''معلم الملکوت'' پر اقبال کی کئی اردو فارسی نظموں کے بہت واضح اثرات نظر آتے ہیں۔ یہ نظم دراصل ایک ڈرامائی کیفیت کی حامل ہے بنیادی طور سے خدائے لم یزل اور ابلیس کے درمیان مکالمہ ہے جس میں ابلیس (عزرائیل) آدم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ تسمیہ بیان کرتا ہے۔

یزداں۔ اس کو سجدہ کرنے سے کیا تجھے انکار ہے

ابلیس۔ ہاں مجھے انکار ہے انکار ہے انکار ہے

یزداں۔ عار ہے کہتا ہے تو، تجھ پہ رہے قہرِ خدا

عار ہے تجھ کو ملائک تک نے جب سجدہ کیا

ابلیس۔ ان کی حالت اور ہے اور میری حالت اور ہے

رسمِ طاعت اور ہے رسمِ محبت اور ہے

غیر کو سجدہ کروں، مجھ سے تو یہ ممکن نہیں

لیکن ابلیس کو یہ بھی خیال آتا ہے کہ اگر تخلیق آدم سے قبل میں خدا سے التجا کر کے آدم کی تخلیق کو منسوخ کرا دیتا تو یہ ہنگامہ نہ ہوتا

عرش کا پایہ پکڑ کر، روتا، کہتا اے خدا خالق کون ومکاں، فریاد ہے عالم پناہ

کر نہ پیدا اس کو روئے ارض پر یہ بدنہاد ڈالے گا عصیاں سے اپنے، کل خدائی میں فساد

بجنوری کی بعض نظمیں دو دو چار چار اشعار پر مشتمل ہیں، 'موسیقی' صرف چار اشعار پر مشتمل ہے۔ ''دعا'' صرف دو اشعار پر مشتمل ہے۔

دعا

جامن کے سائے تلے آبِ رواں اور نیم جاں

شامل ہوں جن میں میرے سب بچے اور ان کی نیک ماں

پیغمبری ہو یا شہی ہو یا حیاتِ جاوداں

مجھ کو دیجیو یہی آب زلال اور نیم ناں

چوتھی، پانچویں اور چھٹی دہائی میں تو بجنور نے اپنے شعری خزانے وا کر دیئے اور تاجور

نجیب آبادی، راز چاند پوری، رفعت سروش، اختر الایمان، ہلال سیوہاروی اور نشتر خانقاہی جیسے خلاق شعراء نے اپنی موجودگی درج کرائی۔ تاجور نجیب آبادی نہ صرف شاعر، مصلح تھے بلکہ افسانہ نگار بھی تھے ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے تھے ان کی اہمیت لاہور میں ایک روشن مینار کی تھی۔ انہوں نے لاتعداد شاعر پیدا کیے۔ احسان دانش، جگن ناتھ آزاد، اظہار اثر وغیرہ کو لاہور میں حفیظ جالندھری کا مدمقابل سمجھا جاتا تھا۔ وہ لاہور کے دیال سنگھ کالج میں اردو فارسی کے استاد تھے ان کا یہ شعر ضرب المثل ہے۔

سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا
الٰہی ساری دنیا کو میں کیسے راز داں کرلوں

راز چاند پوری کے چار دواوین شائع ہوئے تھے ان کے بھی متعدد شاگرد تھے۔ ان کے بیٹے محمود راز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر تھے۔ رفعت سروش اور اختر الایمان نے کشت شعر کو جس طرح شاداب کیا ہے وہ کئی مستقل تصنیفات کا متقاضی ہے۔ اسلئے ان پر تفصیلی گفتگو نہ کرتے ہوئے رفعت سروش کا ایک شعر درج کرتی ہوں۔

نسبت ہے نگینے سے یہ بولی ہے ہماری
اے ناقدِ فن ہم سے کیا ارشاد کرے ہے

ہلال سیوہاروی مزاحیہ شاعری کے امام تھے لیکن مشاعروں میں ان کی شہرت دیکھتے ہوئے کسی نقاد نے ان کو قابلِ اعتنا نہ سمجھا ورنہ ان کی مزاحیہ شاعری یقیناً اس قابل ہے کہ اس پر توجہ دی جائے۔ ان کی کئی مجموعہ کلام شائع ہوئے اولین مجموعے میں کچھ غزلیں شامل تھیں۔

کیوں تارِ نفس آخر شب ٹوٹ چلا ہے
کیا یہ بھی کسی شوخ کا پیمانِ وفا ہے

ان کے آخری مجموعہ کلام ''انگوٹھا چھاپ'' کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی انہوں نے بعض شہرۂ آفاق مزاحیہ قطعات بھی کہے۔ ''غالب ہمدرد دواخانے میں''، ''غالب شمع کے دفتر میں''، ''انگوٹھا چھاپ'' اور ''جوتا'' ان کی مشہور ترین نظمیں ہیں۔ چند قطعات۔

تم خود ہی غریبی کا مداوا نہیں کرتے دیتی ہے حکومت تو سہارا نہیں سمجھے

مدت سے ہے ہر شہر میں راتوں کو اندھیرا تم پھر بھی حکومت کا اشارا نہیں سمجھے

بنگلہ دیش کے قیام پر پاکستان کے نام۔

بنالے تو بھی ایٹم بم، تجھے تو اور آساں ہے ادھر بھی آ، سیاست میں تو کافی تیز ہے ساقی

تو اپنے ملک کا ایک آدھ صوبہ اور کم کردے ذرا کم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ہلال سیوہاروی سے قبل نہال سیوہاروی کا ذکر ہونا چاہئے جو جوش جیسے شعراء کے ہم نشینوں میں تھے۔ایک زمانے میں وہ دہلی کی ادبی مجلسوں کی رونق تھے۔ان کا کلام کوشش کے باوجود حاصل نہ ہوسکا۔نور بجنوری بھی قابلِ ذکر شاعر تھے ان کا یہ ضرب المثل شعر سب نے ہی سنا ہوگا۔

کچھ ترا حسن بھی ہے سادہ و معصوم بہت

کچھ مرا پیار بھی شامل تری تصویر میں ہے

''غزل کے جدید رجحانات'' میں نور بجنوری کا یہ شعر بھی نظر نواز ہوا۔

ہم جوگ لے کے اور بھی برباد ہو گئے

آتی ہیں اپسرائیں بھی چھونے کو اب چرن

نور بجنوری کے برادر خورد عبدالباعث بجنور میں قانونی پریکٹس کرتے ہیں۔

بجنور میں ایک ایسی تخلیقی شخصیت بھی گزری ہے جن کو ان کے استغنا کی وجہ سے وہ شہرت نہ ملی جو ان کا حصہ تھا یعنی نشتر خانقاہی۔نشتر خانقاہی دہلی اور ممبئی میں کئی پرچوں کے مدیر رہے۔'شاہراہ' اور بیسویں صدی کی ادارت میں شامل رہے ان کے پانچ اردو مجموعہ ہائے کلام'' میرے لہو کی آگ''، ''دسترس''،''سرائے میں شام''، اور''سیہ بر سفید'' شائع ہوئے۔ ہندی میں بھی مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کیں۔''بجنور ٹائمس'' کی مجلس ادارت میں ہمیشہ شامل رہے۔ان کا کلام ملاحظہ فرمائیں۔

کس کس کے گھر کا نور تھی میرے لہو کی آگ

میں بجھ گیا تو پھر سے جلایا گیا مجھے

رات کا جنگل تھا ہم اک دوسرے میں کھو گئے
بلب تھے جتنے نواحِ جاں میں روشن ہو گئے

سَن سے اڑتے جہازوں کے اس دور میں جانے کیوں یاد ہے وہ سفر آج بھی
دھیرے دھیرے مرے، پاؤں اٹھتے ہوئے مرے تلوؤں میں دل سا دھڑکتا ہوا
اک جہاں دیدہ پامسٹ کے ہاتھ میں میری مہمل ہتھیلی لرزتی ہوئی
میرے ہی جسم کا ایک حصہ مجھے میرے بارے میں سب کچھ بتا تا ہوا

کیا دے سکا وظیفہ ردّ بلا مجھے
جاگا تو میرے ساتھ ہی جاگے وبال سب

اب نہ دستک میں صدا ہے، نہ ہے زنجیر میں شور
بند پہلے تو نہ ہوا تھا درد تو یہ ایسا

دیکھنا ہے تجھ کو جلتے شہر کا منظر تو آ
اے ہوائے نغمہ میرے جسم کے اندر تو آ

عمر کی بڑھتی ہوئی دھوپ کا رکنا معلوم
گھر کی انگنائی میں بیٹھی ہوئی دختر خاموش

نام تیرا کبھی بھولوں ہوں کبھی چہرہ بھولوں — کیسے دلچسپ مری جان زمانے آئے
حال گھر کا تو کوئی پوچھنے والا نہ ملا — دوست آئے بھی تو موسم کی سنانے آئے

نشتر خانقاہی کی شاعرانہ عظمت کا اندازہ تو اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے بعض اشعار غالب کے نام سے منسوب ہو گئے ہیں۔ مشہور نقاد گوپی چند نارنگ کو بھی یہ تسامح ہوا اور انہوں نے ”گیان سنگھ شاطر از گیان سنگھ شاطر“ کے فلیپ پر نشتر کا یہ شعر غالب سے منسوب کر دیا۔

خود آگہی کو آبلہ دستی گواہ ہے
اس راکھ کو کریدنا آساں بہت نہ تھا

اہلِ بجنور کو نشتر خانقاہی کی شاعری پر مزید غور و فکر کرنا چاہئے۔ ان تمام مشاہیر کے علاوہ کچھ ایسے شعراء بھی بجنور سے وابستہ رہے ہیں جن کے بعض اشعار کچھ رسائل کی وساطت سے مجھ

تک پہنچے ہیں۔

آمادۂ طوفان ہیں اشکوں کے بجرے
ڈرتا ہوں کہ بہہ جائیں نہ آنکھوں کے جزیرے عزیز نہٹوری

یہاں ضرور کوئی قتل گاہ تھی پہلے
تمہارے شہر کے ذرّات خون سے تر ہیں راہی حمیدی چاندپوری

جلیس نجیب آبادی ہمارے عہد کے ہی خلّاق شاعر ہیں ان کے چھ مجموعہ ہائے کلام ''شہر خیال''، ''موسم موسم''، ''برگ آفتاب''، ''تذکرہ سیدنا یوسف''، ''قحط اور بارشیں'' اور ''صبح کرنا شام کا'' شائع ہو چکے ہیں۔ مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی ان کی شاعری پر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے متعدد اشعار کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

اپنی اپنی منزلیں ہیں اپنے اپنے راستے یوں کوئی دو چار دن کو ساتھ ہو جائے تو کیا
بلا سے پیش ہے تاریک راستوں کا سفر ہم اپنا چاند بھی رکھتے ہیں اپنی شام کے ساتھ
یہ کیسی آرزو لیتی ہے دل کی انگڑائی وہ مجھ کو یاد رکھے اور بھول جاؤں میں
فضائے فکر تخیل دھواں دھواں ہے محبت بجھا ہو دل تو غزل کیسے مسکرائے گی

نئی نسل کے نمائندہ شاعر اطہر شکیل کا وطن نگینہ ہے اور وہ گذشتہ ربع صدی سے غزل کے گیسوں سنوار رہے ہیں، ان دنوں ممبئی میں قیام پذیر ہیں۔ سمندر اور سلوٹیں، شکن شکن دریا، جاتے بادل، شہر دوستاں، گلفشانیاں، روئے زمین ان کے شعری مجموعے ہیں۔ کلام ملاحظہ فرمائیں:

آج پھر رات تیری یاد لانے آیا پاس کی جھیل میں پھر چاند نہانے آیا

نجیب آباد کے ہی ایک شاعر شکیل رحمانی میں بڑی تخلیقی قوت تھی لیکن ان کی غیر منظم زندگی نے ان کو کلام شائع کرانے کی مہلت نہ دی۔

آپ سے تعارف بھی کس قدر پڑا مہنگا ہر بلائے بے درما میرے گھر تک آ پہنچی
یہ کہہ کے پھول سے شبنم کو لے اڑیں کرنیں جسے ہو خاک میں ملنا وہی چمن میں رہے

پروفیسر خالد علوی کا آبائی وطن چاندپور ضلع بجنور ہے اگرچہ گذشتہ کئی دہائیوں سے دہلی

یونیورسٹی کے ذاکر حسین دہلی کالج سے وابستہ ہیں اور دہلی میں ہی قیام پذیر ہیں۔ وہ ڈاکٹر محمد حسن اور پروفیسر قمر رئیس کے بعد کی نسل کے اہم نقاد سمجھے جاتے ہیں۔

ان کی متعدد تصنیفات شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں۔

''انگارے''، ''غزل کے جدید رجحانات''، ''انگارے کا تاریخی پس منظر اور ترقی پسند تحریک''، ''قائم چاند پوری''، ''مثنویات قائم''، ''انگارے''(انگریزی)، ''آن منٹو''(انگریزی)، ''جدید ہندی شاعری''، ''غزل نامہ''، ''منٹو پر ایک نظر''، ''اٹھارویں صدی کی غزل''، ''میر کے جنسی رویے''، ''باز یافت''، ''اصطلاحاتِ ذوق''، ''ایقان وادراک'' اور ان کے شعری مجموعے ''مشک'' اور ''وحی'' زیر طبع ہیں۔ چند اشعار۔

جس کو ایک لمحہ غفلت میں گنوایا میں نے
اس کو پھر ڈھونڈنے نکلوں تو زمانے لگ جائیں

وقت کی دھوپ نے جھلسا دیا سب نقش و نگار
اس کا چہرہ بھی مجھے آج پرایا سا لگا

کوئی شے حسبِ ضرورت نہیں ملنے والی
مجھ کو دولت انہیں عزت نہیں ملنے والی

جتنے زخموں کے نشاں ہیں وہ تری پیٹھ پہ ہیں
اس شہادت پہ تو جنت نہیں ملنے والی

تعلقات کی فہرست مختصر ہی سہی
جو نام ہم نے لکھے ہیں وہ کٹ نہیں سکتے

نہ کسی ہجر کا دکھ تھا نہ کسی وصل کی آنچ
زندگی تو نے تو بے فیض گنوایا ہے مجھے

اس قحط کے موسم میں پھلوں سے جو لدی ہے
وہ شاخ ہی مجرم کی طرح کانپ رہی ہے

یہاں نہ ہر شخص کو یہ خوف ہے پتھر ہو جائے
بس اک میں ہوں جو اب بھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا ہوں

اس مختصر سے مضمون میں بجنور کے تمام شعراء کا ذکر ممکن نہیں ہے اس کو بجنور شناسی کی ابتداء سمجھنا چاہئے۔

عالیہ
شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی۔ 110007

❖❖❖

محبِّ اردو۔ ڈاکٹر محمد احسن

ڈاکٹر شیخ نگینوی

ڈاکٹر محمد احسن سات سمندر پار فجی سے جب پہلی بار 2013 میں چھٹیوں میں آئے تو میرے لیے وہاں سے ڈپٹی نذیر احمد کا ناول ''بنات النعش'' کی کاپی لائے۔ جس سے ڈاکٹر محمد احسن کا اردو سے لگاؤ اور اپنے وطن ضلع بجنور سے محبت کا پتا لگتا ہے دوسرے یہ کہ مکمل طور پر انگلش ملک فجی میں بھی اردو کے چاہنے والے آج بھی ہیں۔

محمد احسن کی پیدائش نگینہ میں محمد راقم صاحب کے یہاں ہوئی۔ ابھی ٹھیک سے چلنا بھی نہیں سیکھا تھا کہ والد کی سرپرستی سے محروم ہو گیے لیکن والدہ کی تربیت اور دعاؤں کے سہارے ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ پرائمری درجات تک انگریزی میڈیم اسکول میں اردو کی بھی تعلیم حاصل۔ مصطفےٰ میونسپل انٹر کالج نگینہ میں انٹر کلاس تک کامرس، اسکے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فزیکل ایجوکیشن میں بیچلر اور ماسٹر ڈگری کرنے کے بعد بایومیکینکس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

دہلی کالج آف اسٹڈیز صاحب آباد میں صدر شعبہ فزیکل ایجوکیشنل رہے۔ ڈاکٹر محمد احسن شری رام گروپ آف کالج مظفر نگر میں اسیسٹیٹ پروفیسر، فجی نیشنل یونیورسٹی لوٹوکا (فجی) میں سینیر لکچرار اور آج کل دمام یونیورسٹی سعودی عرب میں اسسٹیٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔

ڈاکٹر محمد احسن کے تین درجن سے زیادہ مقالے نیشنل اور انٹرنیشنل جرنل میں شائع ہو چکے ہیں اردو

سے تعلق مادری زبان ہونے کی وجہ سے بچپن ہی سے رہا۔ طالب علمی کے زمانے سے لکھنؤ، دہلی ممبئی سے شائع ہفتہ روزہ "جدید مرکز" سے وابستگی رہی۔ دبستان بجنور میں اشاعت کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کی تقاریر انھوں نے مہیا کرائیں جوان کے ادبی ذوق کی عکاسی کرتا ہے۔

اقبال میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی نگینہ کے رکن ڈاکٹر محمد احسن تعلیم کے فروغ کے لیے طلبہ کی حوصلہ افزائی اور راہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ بے حد سادہ زندگی گزارنے والے ڈاکٹر محمد احسن خوش اخلاق، ملنسار ہیں اور لوگوں کی خاموش مدد کرتے ہیں۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ ڈاکٹر محمد احسن کو دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں کامیابی، کامرانی سے ہمکنار کرے اور وہ اسی طرح ترقی کے منازل طے کرتے رہے۔ (آمین)

❖❖❖

ابوالکلام آزاد اور ضلع بجنور

ڈاکٹر محمد احسن

تحریک آزادی اور آزاد ہندوستان کی تعمیر نو میں ضلع بجنور کا اہم کردار رہا ہے۔ سیاسی طور پر بیدار اس ضلع کی عوام نے ہمیشہ قومی دھارلے کے ساتھ رہ کر فیصلہ کیا ہے۔ اس وجہ سے ہی اس ضلع میں جہاں ادبی شخصیات کی آمد رہی وہیں سیاسی وملی قائدین نے بھی یہاں آکر قومی، ملی، اور عوامی تحریک کو جلا بخشی ہے۔

روہیلکھنڈ کے اس ضلع بجنور کو سید سالار مسعود غازی، امیر خاں پنڈاری، شوکت علی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا قاسم نانوتوی، سر سید احمد خاں، مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، سرحدی گاندھی، آچاریہ کرپلانی، سردار پٹیل، پنڈت جواہر لعل نہرو، گوبند ولبھ پنت، لال بہادر شاستری مسز اندرا گاندھی، چودھری چرن سنگھ، رفیع احمد قدوائی، راجندر پرشاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا صدیق باندوی، مولانا علی میاں ندوی، مولانا پالنپوری، مولانا ابرار الحق، وغیرہ شخصیات نے تشریف لاکر فخر بخشا۔ 1857 کی جنگ آزادی میں یہاں کی بغاوت سر سید احمد خاں کی کتاب ''سرکشی ضلع بجنور'' میں درج ہے۔ مولانا محمد علی جوہر شوکت علی جوہر کی خلافت تحریک کو اس ضلع نے لبیک کہا اور بڑی سرگرمی کے ساتھ یہاں کی عوام نے حصہ لیا۔ مہاتما گاندھی کھادی تحریک لے کر 1929 کو دھامپور اور نگینہ پہنچے۔ اسی طرح 18 اکتوبر 1920 کو فنِ خطابت کے تاجدار، میدان سیاست کے شہسوار، جدید تاریخ کے ہیرو، اولوالعزم رہنما، صاحب طرز ادیب، جید عالمِ دین،

بہترین ماہر تعلیم، عالم، مفکر، مجاہد، مدبر، عہد آفریں شخصیت محی الدین فیروز بخت یعنی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے نجیب آباد اور نگینہ شہر میں عدم تعاون تحریک کے عوامی جلسوں کو خطاب کیا۔

جس کا ریکارڈ محکمۂ آثارِ قدیمہ میں باکس نمبر 58 میں محفوظ ہے اس کی فائل نمبر 513/20 ہے۔ یہ فائل مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نام سے درج ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا فائل میں درج خطاب قارئین کی نظر۔

''مولانا ابوالکلام آزاد'' کا نگینہ کی عوام کو خطاب 18 اکتوبر 1920ء

''میرے بھائیوں، شریعت کے بموجب جزیرۂ العرب اور اس کے تقدس کا پورا تحفظ ہونا چاہیے لیکن چار سال سے مسلسل فوجی نقل وحمل جاری ہے جس کے سبب جزیرۂ العرب کی باؤنڈری لائن پر ناجائز قبضہ ہوگیا ہے، اس پر بمباری کی گئی ہے۔ جدہ پر اب جو نہ صرف جزیرۂ العرب میں شامل بلکہ حدودِ حجاج کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ بمباری کی گئی ہے۔ مدینہ پر بھی اس وقت طیارے اڑان بھر رہے تھے جب اس پر قبضہ کیا جا رہا تھا سوپوتامیا جس کا دو تہائی حصہ جزیرۂ العرب میں شامل ہے اور بغداد وبسرا تک کے علاقے پر تسلط قائم ہو چکا ہے۔ جنگ کا آغاز ہوتے ہی حکومتیں برطانیہ اور اس کے حکومتِ ہند جیسے زمہ دار ایجنٹوں نے ہندوستانی مسلمانوں سے کئی بار وعدہ کیا تھا اور اعلان بھی کیا تھا کہ ہم چندترکو کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ تو ہم ہندوستانی مسلمانوں کے اطمینان کے لیے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ تمام مقاماتِ مقدس کی حفاظت کی جائیگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی وعدہ کیا گیا تھا کی بھی مقاماتِ مقدس کی جن میں بیو پوتامیا کی زیارت گاہیں بھی شامل ہیں، پورا تحفظ کیا جائیگا اور اس وعدے کی کسی بھی طرح کبھی کوئی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی۔ حکومتِ ہند 2 نومبر 1914 کو کیا گیا یہ ایک ایسا وعدہ تھا جس کا اعادہ وزیرِ اعظم برطانیہ نے بھی کئی بار کیا۔ انہوں نے اپنی 5 جنوری 1914 کی ایک تقریر میں یہ یقین دہانی کی ہے کہ وہ ترکوں کو ملک بدر کرنے کے لیے جنگ نہیں کر رہے ہیں ------------- یہ تھے ان کے وعدے۔

لیکن جنگ کے خاتمِ پر جو کچھ ہوا وہ ان کی ایک کامیابی تھی -------- دنیا کی

تاریخ میں اس حد تک جھوٹ نہیں بولا گیا اور نہ ہی ایسی بے شرمی سے وعدہ خلافی کی گئی جیسے کی حکومتِ برطانیہ نے کیا۔ ان کے تمام وعدے بس پرانے کیلنڈر کی طرح ہو گئے۔ ہر وعدے کی خلاف ورزی کی گئی جن مقامات کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا تھا وہ انگریز فوجیوں کی نگرانی میں دے دیے گئے۔ سی آئی ڈی، رپورٹر یہاں موجود ہیں، اگر وہ چاہے تو یہ تحریر کر لیں کہ یہ ایک حقیقت ثابت ہو چکی ہے کہ یورپ طاقتوں میں سے جس طاقت نے سب سے زیادہ اسلامی حکومتوں، مسلمانوں کے مطالبات اور ان کی بقا وجود کو نقصان پہنچایا ہے وہ حکومتِ برطانیہ ہے اور کوئی نہیں۔ یہ وہ حکومتیں ہیں جس کے ہاتھ آخری خلیفۂ اسلام کے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ یہی وہ حکومت ہے جس نے اپنے تمام وعدوں کو نظر انداز کیا اور اخلاقِ انسانی کی قطعی پرواہ نہیں کی، کیونکہ اس کی یہی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح آخر اسلامی حکومت کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ برطانیہ حکومت شریعت کی رو سے ایک ایسی پارٹی ہے جو اسلام و مسلمانوں اور قابض مسلم علاقوں کے خلاف حالاتِ جنگ میں ہے اور دوسروں کو بھی اس کے خلاف آمادہ کرتی ہے۔ (شریعت کے مطابق کسی بھی مسلمان کو ایسی جماعت سے اس وقت تعلق نہیں رکھنا چاہیۓ۔ کوئی بڑی بات نہیں کہ انگریز گھوڑے پر چڑھ کر آئے اور سب کچھ لے جائے اور تباہی و بربادی مچا دیں۔) شریعت کا یہ حکم بھی ہے کہ رخ دیکھیے۔ ہم لوگوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو سرکاری لوگوں سے تعلقات اپنے مذہب سے زیادہ مقدم رکھتے ہیں۔ تو تمہارا یہ فریضہ ہے کہ سب سے پہلے ان شخصیتوں سے ترک تعلق کر دو اور حکومتِ برطانیہ سے بھی عدم تعاون شروع کر دو۔ اس کا یہ مطلب ہے تمہیں یہ اعلان کرنا پڑے گا، اب تم ان لوگوں کو شادی وغیرہ کی تقریبات میں نہیں شامل کرو گے اور نہ ہی ان کے موت ہونے پر ان کے جنازے کو کندھا دو گے۔

اب عدم تعاون کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ سرکاری عدالتوں کا مقاطعہ کیا جائے۔ تم میں سے اب کوئی بھی ان سے انصاف طلب نہیں کرے گا۔ کیا تم انہیں جانتے ہو جن سے انصاف مانگ رہے ہو؟ انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ ان سے انصاف کے طالب ہو۔ ان میں سے ایک نے پنجاب میں ایک منٹ کے اندر تقریباً 500 لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

برطانوی حکومت اور عوام اس دردناک حادثے کے بعد اسی ظالم شخص یعنی جنرل ڈائر

کی مدد کے لئے ہزاروں روپے کا چندہ جمع کر رہے ہیں۔ روزنامہ مورننگ پوسٹ کے ہی فنڈ میں تین لاکھ پندرہ ہزار روپے جمع ہوئے ہیں۔ آخر اتنی بڑی رقم جنرل ڈائر کو ہی کیوں پیش کی جارہی ہے۔ اس نے کون سا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے جس کے صلے میں برطانوی عوام اسے اتنی کثیر رقم دے رہی ہے۔

میرے دوستوں! دراصل یہ انعام اسے تمہارا خون بہانے کے لیے دیا جارہا ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب وامرتسر میں تمہیں بے آبرو کرنے، تمہاری نیک نامی اور قدر ومنزلت کو مجروح کرنے کے لیے اسے سرفراز کیا جارہا ہے۔ لہٰذا عدم تعاون کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ سرکاری عدالتوں کا مکمل بائکاٹ کیا جائے۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ یہ ہے جس کا مختصراً ذکر پہلے مرحلے میں کیا جا چکا ہے یہ تعلیمی اداروں کا مقاطع وہ تعلیم جو سرکاری اسکولوں میں دی جاتی ہے۔ اس قدر اہانت آمیز ہے کہ اس سے ہزار گنا بہتر جہالت ہے۔ چنانچہ یہ آپکا فرض ہے کہ تمام اسکولوں کا مقاطع کرے جہاں متذکر بالا قسم کی تعلیم وتربیت دی جاتی ہے۔ آپ اپنے بچوں کو بالکل جاہل رکھنا برداشت کر لیجیے مگر سرکاری اسکولوں میں مت بھیجیے گا یہ آپکا فرض ہے کہ قومی تعلیمی نظام کو پھر سے قائم کیا جائے ان سب سے زیادہ سخت تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ کونسلوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔

مولانا آزاد کی اس تقریر کے بارے میں برطانوی حکومت کے مشیر قانون نے چیف سیکریٹری کو اطلاع دی کہ اس جلسے میں تقریر سننے والوں کے مذہبی جذبات کو پرزور طریقے سے مشتعل کیا ہے اور کھلے طور پر برٹش انڈیا میں قانونی طور پر قائم حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کی۔ اس نے ''ہنر مجسٹری'' کی جنتا کو مختلف فرقوں کے جذبات میں جوش بھرنے اور ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ میری رائے میں اس تقریر کے خلاف قانونِ ہند کی دفعہ (اے) 124 اور (اے) 153 کے تحت کاروائی کی جانی چاہیے۔

نجیب آباد کی تقریر

میرے بھائیوں! اسلامی قانون کے مطابق حکومتِ برطانیہ ایک خطاکار جماعت ہے۔ برطانوی قوم اسلام کے خلاف برسرِ جنگ ہے۔ برطانوی حکومت نے اسلام کے خلاف

جنگ کی ہے اور انہیں قید کر دیا ہے، جہازوں میں بندوقیں تان کر مسلمانوں کو ایک معائدہ پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا ہے اس کی فوجوں نے جدہ پر بمباری کی اور اس نے اپنی طیار بھیجیں جو مدینہ میں حضور اقدس محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانِ مبارک پر منڈلاتے رہے۔ یہ تمام قید پر مبنی ہے۔ دراصل یہ ایسی باتیں نہیں ہے جنہیں روکا جاسکے یا محبوس امور حقائق کیا جاسکے۔ لیکن میں جو حقائق پیش کر رہا ہوں وہ دنیاوی طاقتوں سے بالاتر ہے اور انہیں وہ روک نہیں سکتے، یہ حقایق یہ ثابت کرتے ہیں کہ حکومتِ برطانیہ کو ایک خطا کار جماعت قرار دینا چاہیے۔

میرے دوستوں! عدم تعاون تحریک تم لوگوں کے لئے بالکل نئی چیز ہے، تم دنیا کی جھوٹی باتوں سے مت ڈرو اور حکومت سے خوفذدہ مت ہو۔ کیا تم ظلم و جبر، قید و بند اور زنجیروں کی کھٹ کھٹ سے ڈرتے ہو؟

افسوس! میرے دوستوں! تم ان چیزوں سے ڈرتے ہو جبکہ تمہارے اجداد اور تمہارے اپنے مورث اور تم خود بھی نسلِ انسانی کے مردِ میدان رہے ہیں۔ میرے دوستوں! تمہارے اجداد انہیں باتوں سے پیار کرتے تھے، ان ہی کی خواہش کرتے تھے اور ان ہی کے حصول کے لیے کوشاں رہتے تھے جن سے تم آج ڈرتے ہو۔ میرے دوستوں! تمہیں خوف ذدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم بس خدا سے ڈرو کیونکہ اس کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ تم کو اپنے دل میں پختہ یقین رکھنا چاہیے کہ اس دنیا کی فانی حکومت تمہیں تباہ و برباد کر سکتی ہے لیکن تمہارے اعتماد و یقین کو متازلزل نہیں کر سکتی۔ تمہاری گردن کاٹ دی جائیگی اور تمہاری رگوں سے خون بہنے لگے گا لیکن اس خون کا ہر قطرہ ایک نئی زندگی کو جنم دے گا۔ اگر تم مر جاؤ گے تو تمہاری موت بہتوں کو زندگی عطا کرے گی یہی "راہِ حق" ہے۔ وہ جو اس راستے پر چلنا چاہتے ہیں چل سکتے ہیں اور جو اس پر نہیں چلنا چاہتے، خدا سے منہ موڑ سکتے ہیں۔

کالج آف میڈیکل سائنس
دمام یونیورسٹی، سعودی عرب

❖❖❖

ڈاکٹر سید احمد خاں۔ مجاہدِ اردو

ڈاکٹر شیخ نگینوی

اردو ایک زبان ہی نہیں، ایک تہذیب کا نام بھی ہے۔ اس کے باوجود شیریں اور پر اثر زبان کے ساتھ اکثر ناانصافی ہوتی رہتی ہے۔ امتیازی سلوک برتا جاتا ہے۔ یہ رویہ جہاں حکومتی سطح پر ہوتا ہے وہیں ایک خاص ذہنیت کے لوگ اور تنظیمیں اردو کے خلاف محاذ آرائی کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس برصغیر میں اردو اور اس کی تہذیب کو بچانے کے لئے بہت سے افراد بے لوث ہو کر سرگرم ہیں۔ انہیں نام میں سے ایک نام ڈاکٹر سید احمد خاں کا بھی ہے۔

ڈاکٹر سید احمد خاں اردو کے فروغ اور طب یونانی کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ فروغ اردو کے سلسلے میں ڈاکٹر سید احمد خاں کی یہ کوشش رہتی ہے کہ اردو کو اس کا جائز حق مل جائے اور اردو کا تعلق روزگار سے ہو جائے۔ ان کی یہ بھی کوشش رہتی ہے کہ دوسرے لوگ بھی متحد ہو کر اردو کے خلاف ہو رہی ناانصافی و سازش کو ناکام بنائیں اور اردو کے فروغ کے لیے ہمیشہ کمر بستہ رہیں۔ ڈاکٹر سید احمد خاں چاہتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں اور دوسری قوموں کے بچوں کو اردو کی تعلیم کے لئے سرگرم رکھے تاکہ اس ذہنیت کا خاتمہ ہو سکے کہ اردو کی تعلیم سے ترقی کے مواقع نہیں ہیں اور اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ ''عالمی یومِ اردو (۹ نومبر) تحریک کے بانی ڈاکٹر سید احمد خاں کی اردو کے بارے میں یہ سوچ ہے کہ ''گنگا جمنی تہذیب کی سب سے بڑی علامت اردو

زبان ہے۔ اردو زبان کا سیکولر کردار ہی اس کی سب سے بڑی شناخت ہے۔ جس کی ترقی سے ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کو فروغ حاصل ہوا۔"

سید احمد خاں کا آبائی وطن موضع چھتی ضلع خلیل آباد (سنت کبیر نگر) اتر پردیش ہے جہاں ان کی ولادت ایماندار، شریف تعلیم یافتہ کسان الحاج علی رضا خاں کے یہاں یکم جون 1962ء کو ہوئی۔ پرائمری تعلیم گاؤں کے مدرسہ معین الاسلام میں شروع کی اور بی ایس سی انگریزی میڈیم سے گورکھپور یونیورسٹی سے کرنے کے بعد راجستھان یونانی میڈیکل کالج جے پور سے بی یوایم ایس کیا۔ کچھ دن گاؤں میں کلینک کرنے کے بعد دہلی کوچ کیا اور دہلی کو اپنی ملی، سماجی، طبی خدمات کا مرکز بنایا۔ 1992 سے سینٹرل کونسل ریسرچ یونانی میڈیسن میں بحیثیت ریسرچ آفیسر سائنٹسٹ کے عہدہ پر فائز رہے۔ سال 2016 میں ڈاکٹر سید احمد خاں کو ڈاکٹر رام منوہر لوہیا ہسپتال دہلی میں یونانی شعبے میں ڈائریکٹر بنایا گیا۔ ڈاکٹر سید احمد خاں کو اردو کے فروغ اور طب یونانی کے لیے مسلسل جدوجہد کے طور پر 20 سے زائد ایوارڈ مل چکے ہیں۔ ملک میں قائم نیشنل کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات حکومت ہند کے نیشنل کوآرڈی نیٹر بھی ہیں اور مسلسل فروغ اردو و طب کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں۔

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائیزشن کے قومی نائب صدر، یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا کے قومی جنرل سکریٹری اور آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سید احمد خاں طب یونانی اور ملک کی مشہور و معروف شخصیات پر کئی مجلّے شائع کر چکے ہیں۔ طب اور اردو کی شخصیت ڈاکٹر سید احمد خاں سے نگینہ میں منعقد قومی سیمینار بعنوان "ہندوستان میں اردو درپیش مسائل اور ان کا حل" کے موقع پر ملاقات ہوئی جس کی وہ صدارت فرما رہے تھے۔ اردو کی طرح پرکشش شخصیت ڈاکٹر سید احمد خاں سے دبستانِ اردو کے لیے مضمون کی درخواست کی گئی تب انھوں نے ضلع بجنور ہی نہیں برصغیر کی مایہ ناز شخصیت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی پر مضمون عنایت فرمایا۔

بیسوی صدی کے مشہور عالم دین، مجاہد آزادی مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی خدمات مسلمانوں کی سماجی اور سیاسی اصلاح کے لیے کافی اہم ہیں، وطن عزیز کو آزاد کرانے، تقسیم ہند کے

بعد فرقہ وارانہ فسادات میں مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی انہوں نے ایک وفادار سپاہی کی طرح ہر محاذ پر ڈٹ کر فرقہ پرستوں کا مقابلہ کیا، اپنی زبردست قومی اور سیاسی خدمات کے اعتراف میں دستور ساز اسمبلی میں ممبر منتخب ہوئے، جمہوری اور سیکولر آئین وضع کرنے میں خاص کردار ادا کیا، ملک کی پہلی پارلیمنٹ کے رکن بنے۔ انہوں نے مسلمانوں کے تعلیمی، معاشی اور مذہبی حقوق کی بحالی کے لیے جی توڑ کوشش کی ساتھ ہی اردو زبان کو اس کا جائز حق دلانے کے لیے ایوانِ پارلیمنٹ میں بھی اور پارلیمنٹ کے باہر بھی نبرد آزما رہے ہیں۔ ایسی عظیم ہستی پر سید احمد خاں نے مضمون عنایت فرما کر دبستانِ بجنور کو زینت بخشی ہے۔

9412326875

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی
بڑی شخصیت، بڑے کارنامے

ڈاکٹر سیّد احمد خاں

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی کے ایک پیغام میں درج ہے کہ:

''حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اپنے عہد کی بڑی اہم اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے بڑی کارگزار شخصیت تھے، ان کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو بہت سخت حالات پیش آنے کے زمانے میں مسلمانوں کے تحفظ اور ملکی اور ملّی حقوق کے حصول میں بہت سرگرداں رہے اور حالات کا مقابلہ بہت دور اندیشی سے کیا۔ اس کے لیے حکومت وقت کی مضبوط شخصیتوں کے سامنے مسلمانوں کی مضبوط ترجمانی کرتے تھے، ملک کی آزادی سے پہلے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں وہ اکثریتی ہندوؤں کے ساتھ برابری کی سطح سے کام کرتے رہے تھے، جس سے ان کی شخصیت میں اعلیٰ ملکی سطح پر خصوصی وزن پیدا ہوا تھا جو انہوں نے آزادی ملنے کے بعد مسلمانوں کے تحفظ کو خطرات لاحق ہونے پر پوری طرح استعمال کیا اور ان کی ساری جدوجہد بڑی مخلصانہ اور دلیرانہ رہی، جس کو حالات سے سب واقف حضرات دیکھتے اور تسلیم کرتے تھے۔''

اسی طرح م۔ افضل نے اپنے پیغام میں تحریر کیا ہے کہ:

''بلاشبہ مولانا مرحوم ایک بیباک اور حق گو رہنما تھے، ملک اور ملت دونوں کے لیے ان

کی محبت اور قربانی مثالی تھی اور اس سلسلے میں ان کی خدمات بھی بیش بہا ہیں لیکن افسوس ناک امر یہ ہے کہ ان کی حیات وخدمات پر زیادہ کچھ نہیں لکھا گیا جبکہ آج کے دور میں یہ بے حد ضروری ہیکہ ہم اپنے اکابرین اور اسلاف کی خدمات اور کارناموں سے اپنی نئی نسل کو واقف کرائیں۔"

بہر حال ہندوستان کی تحریک آزادی میں یہاں کے مسلمانوں نے جس جوش وخروش سے حصہ لیا تھا اس کی نظیر نایاب ہی نہیں فہم وادراک سے بالاتر ہے۔ دوسری جماعتوں میں اس کی مثال مفقود ہے۔ یہ خودنگہداری نہیں بلکہ تاریخ کے ہر حرف پر یہ حقیقت ثبت ہے۔ کورنظر والے بھی معترف ہیں۔ اگرچہ اقرار سے مصلحتاً گریز کرتے ہیں بلکہ اب تو صورت حال ہی مختلف ہے۔ ہماری ہر قربانی کا انکار وبائے عام بن چکی ہے۔ دانش وری کے مدعی بھی معترف نہیں ہیں بلکہ گمراہی پھیلانے میں ان کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں ہماری ہی صفوں سے برآمد ایک مقتدر صحافی کو سب سے پہلے شہادت ملی۔ کسی اور زبان کے صحافی کے مقدر میں یہ مقام نہیں لکھا گیا تھا۔ اردو کی صحافت نے پوری فضا کو جس طرح طوفاں بدوش بنایا تھا دوسری زبانوں کے مصلحت آمیز رویوں نے خاموشی اختیار کی تھی۔ اسی صحافت کی صفوں نے ایسے جیالے اور جاں باز بھی پیدا کیے جن کی تمثیل نظر نہیں آتی۔ مولانا باقر سے لے کر سر سیّد تک شہیدانِ وفا کی ایک سلسبیل ہے۔ بعد ازاں الہلال، البلاغ، زمیندار، کامریڈ، ہمدرد وغیرہ اخباروں نے آزادی کی آواز کو قیامت خیز بنانے میں سب سے نمایاں خدمت انجام دی۔ ان جیالوں کی جرأت آزما حرارت کو آفریں ہو کہ انگریزی اقتدار میں زلزلہ طاری ہوا اور اقتدار کو ترک کرنے پر مجبور ہوئے۔ صبح آزادی کا طلوع ہونا تھا کہ آنکھ جھپکتے ہی امیدوں کی بساط بدل گئی۔ دار ورسن کی دل خراش آزمائش میں پوری امت مبتلائے آلام ہوئی۔ وہ دشنہ ودشنام کا ہدف بنی۔ زبان وقلم دونوں سزاوار ٹھہرائے گئے۔ یاس وحرماں کی ہمت شکن فضا میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن نے ہمت بڑھائی۔ انہوں نے اپنی تحریر وتقریر نیز قوتِ عمل سے احساسِ شکست کو جھٹک دینے کی توفیق دلائی۔ کچھ علما ان کے ہم دوشِ سفر تھے اور کچھ صحافی بھی ساتھ ساتھ تھے۔ خاص طور پر دعوت و الجمعیۃ نے دلاسائی کے اسباب پیدا کیے۔ مولانا حفظ الرحمٰن جمعیۃ العلما سے وابستہ تھے۔ مولانا

آزاد سے مراسم خاص بھی تھے مگر خضر والیاس کی بے دست و پائی بھی قابل رحم تھی۔ پھر بھی وہ حتی المقدور خدمات بجالانے میں وقف تھے۔ ان کی تحریریں خاص طور پر اداریے اور بے باک تقریروں نے نیم سوختہ لکڑیوں کی راکھ میں حرارت پیدا کی۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، مفتی عتیق الرحمٰن، محمد مسلم، قاضی عدیل عبّاسی وغیرہ نے جان وتن کی بازی لگا کر ایک محاذ کی تشکیل کی۔ مفتی عتیق الرحمٰن کے دفتر ندوۃ المصنفین میں کبھی کبھار جلسے ہوتے اور خطاب عام بھی ہوتا۔ مولانا حفظ الرحمٰن کو ان جلسوں میں دور سے دیکھا۔ دراز قد وجیہہ شخصیت، شیروانی میں ملبوس پیکر اپنی دلآویزی لیے ہوئے متاثر کرتی۔ عام تقریروں سے مختلف فکری نکات اور دور اندیشی کے خیالات سے لبریز گفتگو کا لب ولہجہ سحر آفریں ہوتا۔ ان سے دل کی درمندی اور سوزِ آرزو ظاہر ہوتی۔ پورے ملک میں سرزد ہونے والے حادثوں سے دوچار مسلم آبادی کی دل جوئی کی خاطر متواتر سفر میں رہتے اور اقتدار کی سرزنش بھی کرتے، ساتھ ہی تحریر وتصنیف کے مشغلے میں بھی مصروف رہتے۔ دہلی کیا دور دور تک ایسی بے لوث شخصیتیں بہت کم تھیں۔ اسی زمانے میں فسادات نے وبائی صورت اختیار کی اور ارباب اقتدار کی بے اعتنائی نے سنگین صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ مولانا مسلم آبادی کی آبادکاری اور جلے ہوئے مکانوں کی تعمیر میں بھی سرگرمِ کار تھے۔

حفظ الرحمٰن بن مولوی شمس الدین صدیقی سیوہاروی نامی طالب علم ابھی بیس سال کا تھا اور ابتداءً تعلیمی مراحل سے گزر رہا تھا کہ سیوہارہ سے تقریباً سات میل دور سہسپور ریلوے اسٹیشن پر ایک ایکسپریس ٹرین حادثہ کا شکار ہوگئی۔ مدرسہ کا نوعمر طالب علم حفظ الرحمٰن وہاں جا پہنچا جس نے بساط بھر متاثرین کی مدد کی۔ کوئی درد سے کراہ رہا ہے کوئی پیاسا ہے کسی کے جسم سے خون کا فوارہ ابل رہا ہے۔ ایسے میں یہ طالب علم زخمیوں کی مدد کر رہا ہے، کسی کو پانی پلا رہا ہے تو کسی کے زخم پر پٹی باندھ رہا ہے۔ وہیں پولیس کے جوان مردوں کی جیبیں ٹٹول رہے ہیں، کلائیوں سے گھڑیاں اتار رہے ہیں اور عورتوں کے جسم سے زیور کھینچ رہے ہیں۔

"مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کو میں 1936 سے جانتا تھا۔ جب کہ وہ اور میں دونوں

ایک ساتھ سیاسی کام کرتے تھے۔ مولانا بہت سلجھے ہوئے دماغ کے ستودہ صفات اور عالم فاضل انسان ہیں اور اس کے باوجود کہ میں جس سیاست پر کار بند تھا اس سے ان کو بہت سی باتوں میں اختلاف تھا۔ ان کی شفقت وعنایت مجھ پر ہمیشہ رہتی تھی۔ میں انہیں سامراج دشمنی، وطنی آزادی کی مشترکہ جدوجہد میں اپنا بزرگ اور قابل احترام رفیق تصور کرتا تھا۔ میں جب بھی دلی جاتا توان کی زیارت اپنا فرض سمجھتا تھا۔'' (دار العلوم دیوبند ادبی شناخت نامہ، ص:105۔106، بحوالہ روشنائی، 345۔350)

حیرت کا مقام ہے کہ مولانا کی زندگی پر اب تک کوئی باضابطہ تصنیف نہیں ملتی، بس جمعیۃ کا وہ خصوصی نمبر ملتا ہے جس میں معاصرین کے تاثراتی قسم کے مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ یا مولانا سلمان شاہ جہاں پوری کی کتاب 'مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی: ایک سیاسی مطالعہ' ملتا ہے، جو کوئی مستقل اور باقاعدہ تصنیف نہیں، بلکہ مختلف مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مولانا تو کینسر کے مہلک مرض کا شکار ہو کر بہت پہلے ہم سے منہ موڑ کر چلے گئے، لیکن ان کے انتقال کو ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہے، ضرورت ہے کہ کوئی اردوداں یا مدرسے کا کوئی فاضل ہی اس خالی میدان میں آئے اور کوئی سوانحی کتاب لکھ کر اس خلا کو پر کردے۔ تاکہ 50 سال بعد ہی سہی علمی اور ادبی دنیا میں مولانا کے نام اور کام سے شناسائی کا سلسلہ شروع ہو سکے۔ اسلاف فراموشی کے مرض پر قابو پانا ضروری ہے، ورنہ نسل نو ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

مولانا حفظ الرحمٰن کی پیدائش 10 جنوری 1901 کو ضلع بجنور کے قصبہ سیوہارہ میں مولوی شمس الدین کے معزز گھرانے میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ فیضِ عام سیوہارہ اور مدرسہ شاہی مرادآباد میں ہوئی۔ بعد میں دیوبند میں داخلہ لیا اور طالبِ علمی کے زمانے میں ہی دینی نصاب (درسِ نظامی) تیار کیا۔ 1928 میں مولانا کو درس وتدریس کے لیے جامعہ ڈھابیل ضلع صورت بھیج دیا گیا۔ 1929 میں گاندھی جی سے رابطہ کر کے مولانا نمک تحریک سے جڑ گئے اور تحریکِ آزادی کے پروگراموں میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ 1932 میں مولانا جمعیۃ علماء کی منتظمہ کے رکن بنے 1942 میں لاہور میں ہوئے تیرہویں اجلاس میں ناظمِ اعلیٰ بنائے گئے اور تاحیات

ناظمِ اعلیٰ رہے۔ مولانا نے یوپی اسمبلی اور پارلیمنٹ کی نمائندگی 1949 سے 1962 تک کی ۔مولانا کی قصص القرآن (چار جلدوں میں) اسلام کا اقتصادی نظام، اخلاق وفلسفۂ اخلاق، رسول کریم، بلاغ المبین وغیرہ تصانیف ہیں۔ 2/اگست 1962 کو دہلی میں اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے بھی حضرت مولانا کو قوم وملت کا ہیرو مانتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ:

''فسادات کا یہ دور مولانا کے لیے نہایت اہم اور نازک تھا۔ دہلی کے مسلمان گھبرائے ہوئے تھے۔ بہت جاچکے تھے باقی جانا چاہتے تھے۔ مولانا محسوس فرماتے تھے کہ ان کا دہلی سے ان حالات میں جانا جہاں ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہوگا وہاں ہندوستان کی بین الاقوامی شہرت اور عزت کے لیے بھی مضر ثابت ہوگا۔ چنانچہ چوبیس گھنٹے اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے تھے اور اس کوشش میں تھے کہ فضا ہموار ہو اور بھی قومیں پھر سے پہلے کی طرح شیر وشکر ہوکر رہیں۔ اس دور میں مسلمانوں کی صحیح نمائندگی کا بوجھ یا تو امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اٹھا سکتے تھے یا مولانا حفظ الرحمٰن۔ اس لیے نہیں کہ دہلی یا ہندوستان میں اور کوئی صحیح دماغ مسلمان لیڈر نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ مولانا آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن پر سب قومیں اعتماد رکھتی تھیں اور ان کی ہر تجویز کو محض اس لیے نہیں ٹھکرادیا جاتا تھا کہ ان میں کسی تعصب یا انتقام کا عنصر ہے۔''

ان دنوں مجھے وقت بے وقت دہلی کے گلی کوچوں میں گشت کرنی پڑتی تھی۔ کبھی کبھار مولانا بھی ہمراہ ہوتے تھے۔ فضا مایوس کن ہونے کے باوجود مولانا کو ہندوستان کا مستقبل تاریک نظر نہیں آتا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ہمارا ملک سیکولرزم کی صحیح مثال دنیا کے سامنے پیش کرسکتا ہے اور کرے گا۔ چنانچہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مولانا کی یہ پیشین گوئی کس قدر درست ثابت ہوئی۔

جو شخص اپنے عقائد کا پکا ہو، بہادر بھی ہوا کرتا ہے۔ اسی جذبے نے دنیا میں غازی اور شہید پیدا کیے ہیں۔ مولانا بھی اپنی دھن کے پکے تھے اور کبھی کسی مصیبت یا رکاوٹ سے گھبراتے نہیں تھے۔ میں نے ان کو کئی بار مخدوش علاقوں میں اکیلے چکر کاٹتے دیکھا۔ ایک بار لال کنواں بازار کی ایک گلی میں کسی پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ میں پولیس لے کر فوراً موقع پر پہنچا، دیکھا کہ مولانا پہلے

سے ہی وہاں پر موجود ہیں۔ میں نے گزارش کی کہ اب آپ تشریف لے جائیے میں یہاں کی دیکھ بھال کرلوں گا۔ میں نے ہر چند چاہا کہ پولیس ساتھ کردوں تا کہ مولانا کو گلی قاسم جان تک پہنچا آئے۔ لیکن مولانا نے انکار کردیا اور فرمانے لگے کہ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔ میں نے تعمیل حکم میں پولیس کو کہیں اور گشت کے لیے بھیج دیا۔ مولانا پیدل ہی واپس گلی قاسم جان کی سمت چل پڑے۔ بظاہر تو میں نے مولانا سے رخصت چاہی لیکن جب وہ تھوڑی دور چلے گئے تو میں آہستہ سے اُن کے پیچھے ہولیا تا کہ راستے میں کہیں کوئی اور واقعہ نہ پیش آجائے۔ مولانا کی زندگی ہمارے لیے ایک بیش بہا سرمایہ تھی، جسے ہم کسی قسم کے خدشہ میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ اس واقعہ کا ذکر آج میں پہلی بار کر رہا ہوں۔ مولانا کو بھی اس کا علم نہ تھا۔ مولانا کی تمام عمر اسی جدو جہد میں گزری کہ ہم ہندوستانی بلا تفریق مذہب وملت باہم اُنس واخلاق سے رہیں اور اپنے محبوب وطن کی فلاح و بہبود کے لیے شانہ بشانہ کام کریں۔ جب لسانی مسئلہ نے نازک صورت اختیار کی اور یہ ایک مذہبی سا مسئلہ بن کر رہ گیا، اس وقت بھی مولانا نے اس طوفان بدتمیزی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انہیں ایام میں وِدیا شنکر جی آئی سی ایس سردار پٹیل کے سکریٹری تھے بلکہ دست راست تھے۔ انہوں نے ایک روز مجھے یاد فرمایا اور کہا کہ سردار پٹیل یہ چاہتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ تعصب سے بری رہنا چاہئے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ چند ایسے لوگ میدان میں آئیں جن کا کردار ہمیشہ سے غیر متعصب رہا ہے۔ دونوں زبانوں کو نزدیک لانے کی کوشش کی جائے۔ ہندی کو بسر و چشم قومی زبان تسلیم کیا جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی پنپنے کا موقع دیا جائے۔ میں نے اس بارے میں جن معدودے چند حضرات کو ہم راز بنایا ان میں سے ایک مولانا حفظ الرحمٰن تھے اور دوسرے منشی گوپی ناتھ امن۔ ان دونوں کے مشورے سے دہلی میں اردو سبھا کا انعقاد ہوا۔ کچھ دیر تک اردو سبھا نے اس سلسلہ میں بہت اچھا کام کیا اور مولانا نے ہی سرپرستی فرمائی۔

(کنوینر، عالمی یوم اردو آرگنائزنگ کمیٹی، نئی دہلی)

D-49 نیو سیلم پور، نزد شہید اشفاق اللہ خاں پارک، نئی دلی 53

موبائل نمبر: 09810429359

دبستانِ بجنور کی بیٹی شاداں پرویز

ڈاکٹر شیخ نگینوی

اکیسویں صدی کے نامور ادیبوں کی اولادوں میں بڑی تعداد ایسی ہے جو اردو سے نابلد ہے۔ لیکن بیسویں صدی کی ادیبوں شاعروں نے اس بات کو ترجیح دی اور آنے والی اپنی نسل کی ایسی تعلیم و تربیت کی کہ انہوں نے اردو کو زندہ رکھا۔ اس فہرست میں دبستانِ بجنور کے فرزندوں میں ڈپٹی نذیر احمد کے بیٹے بشیر احمد، نذر سجاد اور سجاد حیدر یلدرم کی دختر قرۃ العین حیدر، رفعت سروش کی بیٹی ڈاکٹر شبانہ نذیر، قیام بجنوری کے بیٹے جاوید دانش، نور بجنوری کی دختر رعنا نور، مسعود الحسن پر کمی کی دختر فرزانہ عالم، شوق بجنوری کے فرزند شکیل احمد خاں، حکم صلاح الدین کے بیٹے شجاع الدین قمر، ملک عرفان علوی کے فرزند ڈاکٹر خالد علوی، کوثر چاند پوری کے بیٹے نعیم کوثر، صدیقہ بیگم کی بیٹی پروفیسر سیما جاوید، مولانا محمد اسحاق کے بیٹے محمد عرفان رومانی وغیرہ کے نام ہیں جنھوں نے اپنے والدین کی وراثت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اردو کے محافظ بن کر آگے بڑھایا۔ ان ہی ناموں میں ایک نام پروفیسر اطہر پرویز کی دختر شاداں پرویز کا بھی ہے۔ شہر نگار ممبئی میں قیام پزیر شاداں پرویز کی ابتدائی تعلیم ماریشس میں ہوئی۔ لندن یونیورسٹی سے جی۔ بی۔ ای ''او'' لیول کیا اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم ایس سی (حیوانیات) کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے البرٹا اڈمنٹن کناڈا کا رخ کیا۔ شاداں پرویز کی دلچسپی شروع سے ہی اردو اور انگریزی ادب سے رہی ہے۔ شاداں پرویز کی تصانیف شمسی توانائی ''اردو گھر علی گڑھ سے''، ''فضائی اور خلائی

اڑان'' ترقی اردو بیورونئی دہلی اور'' ہمارا ماحول'' ترقی اردو بیورونئی دہلی سے شائع ہوئیں۔ ان کتابوں پر حکومت ہند کا قومی ایوارڈ اور یوپی اردو اکادمی کا ایوارڈ شاداں پرویز کو ملا۔ ہندو پاک کے کئی معتبر اردو رسائل میں شاداں پرویز کے مضامین شائع ہوئے۔ آل انڈیا ریڈیو سے بھی مضامین اور افسانے نشر ہوئے۔ ممبئی آنے سے پہلے شاداں دور درشن ڈی ڈی نیشنل کے اردو پروگرام 'بزم'' میں رابطہ کار کی حیثیت سے کام کرتی تھی۔

شاداں پرویز آج کل ممبئی میں اسکرین پلے اور ڈائلاگ لکھنے کا کام کر رہی ہیں۔ شاداں پرویز نے ''سپنوں سے بھاری نینا''، ''پرتگیہ''، ''بنو میں تیری دلہن''، ''ماتا کی چوکی''، ''عنبر دھارا''، ''فییر فاکس''، ''ہم ہیں نا''، ''ڈولی ارمانوں کی''، ''بڑی دیورانی''، ''تو میرا ہیروں'' وغیرہ ہندی فلموں اور ٹیلی ویژن کے سیریل میں بطور کریٹو ہدایت کار کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ وراثت (اسٹار پلس) کامنی دامنی (سہارا ون) آپ بیتی، اپرادھی کون، چمتکار وغیرہ ٹی وی سیریل میں پروجیکٹ ہیڈ اور ''بائبل''، ''بندہ یہ بنداس ہے'' میں پروجیکٹ سپروائزر کی حیثیت سے کام کیا ہے۔ شاداں پرویز نے ای ٹی وی اردو کی کئی ٹیلی فلموں کے ڈائیلاگ اور اسکرین پلے تحریر کیے ہیں۔ پروفیسر اطہر پرویز کی ادبی وسماجی خدمات پر ان کا یہ مضمون ان کی ادبی صلاحیتوں کا نمونہ بھی ہے اور پروفیسر اطہر پرویز کو خراج عقیدت بھی۔

پروفیسر اطہر پرویز
ایک ادیب، ایک سماجی کارکن

شاداں پرویز

محمد عثمان اطہر پرویز ہاں یہی ان کا پورا نام ہے۔ وہ اردو زبان کے ممتاز ادیب، نقاد اور محقق تھے۔ ان کی پیدائش 25 ستمبر 1925ء کو محمد عمر اور حلیمہ بیگم کے گھر ہوئی۔ ان کا تعلق (سیوہارہ) ضلع بجنور کے ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ ان کے خاندان کے پہلے فرد جناب حسن زنجانی آذربائیجان سے مغل بادشاہ ہمایوں کی فوج میں سپہ سالار ہوکر ہندوستان آئے اور پھر یہی کے ہوکر رہ گئے۔ بجنور کی سرزمین پر ان کی جڑیں ادب اور سیاست کے میدان میں پھیلتی چلی گئیں۔ مشہور مصنف عبدالرحمٰن بجنوری، پروفیسر خورشید الاسلام اور سیاست داں مولانا حفظ الرحمٰن سب اسی خاندان کے افراد تھے۔

اطہر پرویز نے فارسی اور اردو ادب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن کیا تھا۔ اور پھر ان کی کتاب 'داستان کا فن' پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ اطہر پرویز جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے اس وقت سارے ملک میں برطانوی سلطنت کے خلاف نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ہندوستانی عوام دوسو سالہ انگریزوں کی غلامی کی زنجیریں توڑنے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا تو بھلا اطہر پرویز اس آگ سے کس طرح اپنا دامن بچا سکتے تھے۔ وہ بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن کی

حیثیت سے کام کرنا شروع کیا اور آگے جا کر تین ٹریڈ یونینوں کی سربراہی کی۔ وہ کئی مرتبہ جیل گئے لیکن اس سے ان کے جوش یا حوصلے میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ انھوں نے اپنی خود گزشت ''جنوں میں جتنی بھی گزری'' میں اپنے جیل کے تجربات قلم بند کیے ہیں۔ مگر زندگی نے انہیں اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنی کتاب مکمل کر پاتے۔ اطہر پرویز وقت کا صحیح استعمال کرنا جانتے تھے۔ جیل میں رہتے ہوئے انہوں نے اپنا مطالعہ جاری رکھا اور جن قیدیوں نے لکھنے پڑھنے میں دلچسپی دکھائی انہیں باقاعدہ درس بھی دیے۔

15 اگست 1947ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔ ہمیں آزادی تو ملی مگر ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصہ بھارت دوسرا حصہ پاکستان۔ ان ہی دنوں اطہر پرویز نے اردو زبان کی مشہور مصنفہ صدیقہ بیگم سیوہاروی سے نکاح کیا۔ ان کا نکاح جلد بازی میں ہوا جس کی وجہ یہ تھی کہ صدیقہ بیگم اپنے بڑے بھائی اخلاق احمد وارثی کے ساتھ رہتی تھیں۔ اخلاق صاحب نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ صدیقہ بیگم پاکستان نہیں جانا چاہتی تھیں۔ وہ رشتہ میں اطہر پرویز کی ماموں زاد بھی تھیں۔ لہٰذا فیصلہ یہ ہوا کہ وہ اطہر پرویز سے شادی کر کے ہندوستان ہی میں رہ جائیں۔ اور اس طرح ان دونوں کی شادی ہوئی۔ مگر عدم تشدد سے ملی یہ آزادی اپنے ہی بچوں کے خون کی بلی چاہتی تھی۔ ہر طرف دنگے فساد ہو رہے تھے۔ ایسے ہی ماحول میں اطہر پرویز اپنی بیوی صدیقہ بیگم کو اپنے چچا محمد ادریس کے یہاں سیوہارہ سے الہ آباد لے کر پہنچے اور یہاں سے ان کی زندگی کا نیا سفر شروع ہوا۔ گھر اور بیوی کی ذمہ داری آنے کے ساتھ ہی انہیں ذریعہ معاش کی فکر ہوئی۔ انہوں نے مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہونے والے بچوں کے رسالے ''پیغام تعلیم'' میں بطور مدیر نوکری کر لی۔ اسی دوران انہوں نے بچوں کے لئے کئی دلچسپ ڈرامے لکھے۔ 'محلے کی ہولی'، 'ہولی اور چراغ'، 'چراغ سے چراغ جلتا ہے' کافی مشہور ہوئے۔

جس دوران وہ مکتبہ جامعہ میں ملازمت کر رہے تھے ان کی ملاقات کرنل بشیر حسین زیدی اور ان کی بیگم قدسیہ زیدی سے ہوئی۔ بیگم قدسیہ زیدی تھیٹر کی جانی مانی شخصیت تھیں اور کرنل بشیر حسین زیدی ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ اطہر پرویز کی علم دوستی دیکھتے

ہوئے زیدی صاحب نے انہیں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لیکچرر شپ کی پیش کش کی۔ جو فوراً ہی قبول کرلی گئی۔ اس طرح ایک بار پھر اطہر پرویز علی گڑھ آ گئے۔ پہلے ان کا تقرر جنرل ایجوکیشن کے شعبے میں ہوا بعد میں وہ شعبہ اردو میں منتقل کر دیئے گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے آخری وقت تک پڑھایا۔

علی گڑھ آنے کے کچھ سال بعد اطہر پرویز کو حکومتِ ہند کی طرف سے ماریشس بھیجا گیا جہاں وہ استادوں کو اردو زبان پڑھانے کی تعلیم دیتے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ماریشس کے بچوں کے لئے درسی کتابیں بھی لکھیں۔ ماریشس کے دارالحکومت پورٹ لوئس میں اردو ادب کی کتابوں کی ایک لائبریری بھی قائم کی۔

ماریشس روانہ ہونے سے پہلے جب وہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملنے گئے جو شروع سے ہی اطہر پرویز کے قدر دان تھے۔ ذاکر صاحب نے ان سے کہا کہ وہ ماریشس کے اسکول اور وہاں کا طریقۂ تعلیم دھیان سے دیکھیں کیونکہ ہندوستان میں عام بچوں کے لئے اچھے اسکولوں کی کمی ہے۔ اطہر پرویز صاحب نے ذاکر صاحب کی اس ہدایت کو فرض ہی نہیں اپنے اوپر قرض سمجھ لیا۔ ماریشس کے دوران قیام انہوں نے برٹش کاونسل کی ان گنت فلمیں دیکھیں اور وہاں سے علی گڑھ واپس آکر انہوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین ماڈل اسکول کی بنیاد ڈالی۔

اطہر پرویز اپنے عہد کی انسانیت اور اس کے ضمیر کی تصویر تھے۔ وہ لوگوں کی جس طرح بھی ممکن ہوتا تھا مدد کرتے تھے۔ اور اس کے لیے انہوں نے بارہا قربانیاں دیں۔ اطہر پرویز اپنے گردو پیش سے کبھی غافل نہیں رہے۔ وہ انسانوں کے ٹھاٹھے مارتے سمندر میں اپنے آپ کو غرق کر کے دیکھتے اور محسوس کرتے تھے۔ انہیں علی گڑھ سے پیار تھا۔ اور اسی جذبے نے ان سے ان کی کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' لکھوائی۔ ماریشس کے دورانِ قیام انہیں دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹر نے ان پر لکھنے اور پڑھنے کی پابندی لگادی۔ مگر نہ جانے انھوں نے کہاں سے کاغذ اور قلم حاصل کر لیا اور یہ کتاب لکھنی شروع کردی۔ آج کے دور میں جب لوگوں کو اپنے پڑوس میں رہنے والوں کی خبر نہیں ہوتی۔ اطہر پرویز اپنے اطراف میں رہنے والوں کی زندگی اور حالات پر گہری نظر رکھتے

تھے۔ان کی کتاب ''علی گڑھ سے علی گڑھ تک'' میں علی گڑھ یونیورسٹی کے بیچوں بیچ بسے شمشاد مارکیٹ ہی نہیں بلکہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تہذیبی زندگی کی بھی داستان ہے۔اس میں جیتے جاگتے کردار ہیں۔شمشاد مارکیٹ کی سیاسی اور ادبی زندگی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اطہر پرویز نے مجازؔ، اختر الایمانؔ، خورشید الاسلامؔ، جذبیؔ، حبیب تنویر اور راہی معصوم رضا وغیرہ کے بارے میں بڑے دلچسپ واقعات لکھے ہیں۔

اطہر پرویز نے اپنے تعلیم دور سے لے کر استاد کی منزل تک پہنچنے کو دوران زندگی کی ان گنت شعبوں میں وقت گزارا ہے اور ادب نے ہر منزل پر ان کی مدد کی۔نہ صرف اردو ادب بلکہ انگریزی اور فرانسیسی ادب پر بھی ان کا گہرا مطالعہ رہا ہے۔ان کی کتاب ''ادب کا مطالعہ'' بہت مقبول ہوئی۔اس کتاب کے ذریعے انہوں نے طلبہ کو ادب کے چند اہم اصناف،اس کے طریقہ کار اور فوائد سے روشناس کرایا۔اس کتاب کا مقصد دنیا کے چند مشکل موضوعات میں سے ہے مگر اطہر پرویز نے اپنی کتاب کو سیدھی سادھی آسان زبان میں بیان کیا ہے۔

اطہر پرویز کی کتابیں اردو ادب کے سرمائے میں ایک اہم اضافہ ہیں انھوں نے مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے۔ان کا مخاطب ہمیشہ ایک ہی قسم کا حلقہ نہیں رہا ہے۔انہوں نے بچوں کے لئے بھی لکھا،حرف شناس بالغوں کے لئے بھی اور تعلیم یافتہ حضرات کے لئے بھی۔وہ ادب اور سماجی مسائل کے علاوہ سائنس کی دنیا سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔انہوں نے سائنس کے دقیق موضوعات کو بھی آسان اور دلچسپ زبان میں پیش کیا۔لیکن اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ضرورت اور ذہنی تحریک کے مطابق ان موضوعات کو افسانے یا ڈرامے کی شکل بھی دے دیتے ہیں۔

حکومتِ ہند نے ان کی ادبی خدمات کو انعامات کی شکل میں سراہا۔شاید ہی کوئی دوسرا ادیب ہو جسے اپنی کتابوں پر اتنی بڑی تعداد میں انعامات ملے ہوں۔اطہر پرویز کو بچوں کے ادب سے خاص طور سے دلچسپی تھی۔یہی وجہ ہے کہ بچوں کے حرفِ اول کے ادیبوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ان کی چند قابلِ ذکر کتابیں ہیں۔

1۔خلا کا سفر　2۔نجومی آپا　3۔توانائی کا راز　4۔مصنوعی چاند

5۔گلیلی گلیلیو　6۔ستاروں کی دنیا　7۔بدن کی کہانی

ان کے علاوہ انھوں نے کچھ ادیبوں اور شاعروں کی کتابیں بھی مرتب کیں۔

بچوں کے حالی۔　بچوں کے اقبالؔ۔　شفیع الدین نیرؔ۔

کرشن چندر اور ان کے افسانے۔　راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے

اردو کے تیرہ افسانے　ہمارے پسندیدہ افسانے　منٹو کے نمائندہ افسانے۔

اطہر پرویز صاحب ایک اچھے انسان، ایک اچھے ادیب اور ایک شفیق باپ تھے۔ وہ رشتوں کی اہمیت اور ان کی قدر کرنا جانتے تھے۔ وہ اپنی ساری صلاحیتوں کے ساتھ زندگی کے نشیب وفراز سے دلیرانا گزرتے چلے گئے۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ''میرے پاس کام بہت ہے مگر وقت بہت کم''۔ اور یہ بات صحیح ہوگئی۔ زندگی نے انہیں وقت کم دیا۔ 10 مارچ 1984ء کو وہ ہم سب کو چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر چل دیئے۔ ان کی زندگی ایک مثال ہے۔ عام طور پر لوگ اپنے لئے جیتے ہیں مگر اطہر پرویز ہمیشہ دوسروں کے لئے جیے۔ وہ آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں۔

J-101,Manik Moti, Sarla CHS,

Panch marg, Yari Road, Versova,

Andheri West, Mumbai-61

09821612349

ڈاکٹر نصرت مہدی
خوش آہنگ و خوش گلو شاعرہ

ڈاکٹر شیخ نگینوی

''بھارت میں اردو اور بالخصوص اس کے رسم الخط کو جو مسائل درپیش ہیں اس کا اثر وہاں کی شاعری کے معیار پر تو پڑا ہے؛ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مشاعرے کی روایت وہاں نہ صرف پاکستان کی نسبت بہت زیادہ مستحکم اور مقبول ہے؛ بلکہ مسلسل فروغ پذیر بھی ہے البتہ جہاں تک وہاں کی شاعرات کا تعلق ہے ان میں سے بہت کم ایسی ہیں جن کے کلام کو اعلیٰ تو کیا درمیانے درجے کا بھی قرار نہیں دیا جا سکتا مشاعروں میں وہاں سے جو خواتین شعرا آتی ہیں ان میں بیشتر کے اگر ترنم کو خارج کر دیا جائے تو باقی کچھ نہیں بچتا۔ اس فہرست میں میرے مشاہدے اور تجربے کی حد تک صرف عزیز بانو داراب وفا، فاطمہ شعری حیدر آبادی، ملکہ نسیم اور نصرت مہدی ہی چند ایسے نام ہیں جنھیں شاعرات کی اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے جس میں ادا جعفری، زہرہ نگاری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، تبسم شکیل، پروین شاکر، نوشی گیلانی، ثروت زہرا، حمیدہ شاہین بشریٰ اعجاز اور دیگر کئی پاکستانی شاعرات کے نام شامل ہیں''۔

''اس فرق کی بہت سی وجوہات ہیں جن کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں کہ فی الوقت میں نصرت مہدی کے شعری لہجے اور نسائیت کے اس معتدل متوازن اور خوب صورت

اظہار کی تحسین کرنا چاہتا ہوں جس میں عورت کے الگ اور مخصوص تشخص کے ساتھ ساتھ مردوں کے بنائے ہوئے اس معاشرے میں عورت کو (جنس کی تفریق کو تسلیم کرتے ہوئے) ایک مکمل فرد اور Person کی طرح دیکھنے اور دکھانے پر زور دیا گیا ہے۔ وہ یقیناً اکیسویں صدی کی عورت کا وہ روپ ہے جسے گزشتہ صدیوں میں بوجوہ نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ یہ تازہ نسائی آواز جہاں ایک طرف ہمیں ادبی منظر نامے میں خواتین کی بھرپور اور خوش آئند موجودگی کا احساس دلا رہی ہے وہاں اس بات کی بھی شاہد ہے کہ آج کی عورت ہر اعتبار سے مردوں کے دوش چلنے کے لیے نہ صرف تیار ہے بل کہ اس سفر میں کچھ نئی جہتوں کی سمت نمائی بھی کر رہی ہے۔''

معروف شاعرہ دبستان بجنور کی بیٹی ڈاکٹر نصرت کی شاعری پر روزنامہ ایکسپریس کراچی (9 فروری 2014) میں اپنے مضمون میں مذکورہ سندی الفاظ عالمی شہرت یافتہ امجد اسلام، امجد نے 30 جنوری کو دبئی کے مشاعرے میں نصرت مہدی کی غزل سن کر رقم کیے۔ نصرت مہدی کی پیدائش ضلع بجنور کے مردم خیز شہر نگینہ کے محلہ سرائے میر میں 1965 کو جناب التجا زیدی کے یہاں ایک ادبی خاندان میں پیدا ہوئی۔ نصرت مہدی کی دادی کنیز محسن خود شاعرہ تھیں اور ان ہی کی پرورش اور سرپرستی نے نصرت مہدی اور ان کی بھی بہنوں شمیم زہرہ، مینا نقوی، نزہت زہرہ، علینا عترت کا ادبی اور شاعرانہ ذہن تیار کیا، نصرت مہدی کی ابتدائی تعلیم نگینہ میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم انھوں نے بھوپال سے مکمل کر کے کلاس دوئم افسر کے طور پر مدھیہ پردیش حکومت کی ملازمت شروع کی۔ نصرت مہدی کے مضامین، شاعری، ڈرامہ، اسکرپٹ اردو، ہندی اور انگریزی رسائل میں اکثر زینت بنتے رہتے ہیں۔ ''سایہ سایہ دھوپ''، ''آبلہ پا''، ''میں بھی تو ہوں''، ''گھر آنے کو ہے'' نصرت کے شعری مجموعے ہیں اور نثر میں 1857 کی جنگ آزادی، انتخاب سخن، تصانیف ہیں۔ نصرت مہدی کو پروین شاکر ایوارڈ مہاراشٹر، قمر الشاعرات، بیسٹ سٹی زن آف انڈیا گولڈ میڈل، خواتین اودھ لکھنؤ، نشور ایوارڈ کانپور، شہید اشفاق اللہ خاں ایوارڈ، مظہر سعید خاں ایوارڈ، بھارت رتن مدر ٹریسہ گولڈ میڈل ایوارڈ اور اختر الایمان ایوارڈ نگینہ اب تک مل چکے ہیں ایشکر وفٹ یونیورسٹی لندن نے انھیں ''ڈاکٹر آف لٹریچر'' کے اعزاز سے نوازہ ہے۔ اردو کی ترقی و ترویج کے لیے ذاتی

طور پر مصروف رہنے والی بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعرہ، ڈرامہ نگار، اسکرپٹ رائٹر، کہانی کار اور مقالہ نگار نصرت مہدی امریکہ، خلیجی ممالک، پاکستان اور ملک کے تمام شہروں میں ہونے والے مشاعروں، سیمناروں میں اکثر شرکت کرتی ہیں۔ ساہتہ اکادمی بھوپال کی ڈپٹی ڈائریکٹر، اردو اکادمی مدھیہ پردیش کی سکریٹری اور این سی پی یو ایل نئی دہلی کی منتظمہ کمیٹی کی رکن ڈاکٹر نصرت مہدی بھوپال میں اردو کی معیاری محفلوں کو خوب سے خوب تر کر کے سجا رہی ہیں۔

نصرت مہدی کے شعری سروکار کے حوالے سے بات کی جائے تو تو ان کے یہاں اخلاقی قدروں کی پاسداری بھی ہے اور مشاہدات و تجربات کی روشنی بھی۔ نصرت مہدی کی غزلوں میں سادگی اور پراثری دونوں پائی جاتی ہیں۔ نصرت مہدی نے دورِ اذکار کا تشبیہات اور بوجھل وثقیل الفاظ سے اجتناب کرتے ہوئے جو شعری پیکر تراشے ہیں ان میں حیاتِ انسانی کی تلخ وشیریں احساسات پوری طرح نمایاں ہیں۔ نصرت مہدی ایک خوش آہنگ اور خوش گلو شاعرہ ہیں جو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر نہ صرف خواص میں بلکہ عوامی سطح پر بھی مقبولیت سے ہمکنار ہیں۔

خوش اخلاق اور خوش گفتار نصرت مہدی ایسی شاعرہ ہیں جنھوں نے بڑے شوق اور دل وجان کی آمادگی کے ساتھ غزل گوئی کو اپنایا ہے۔ نصرت کی شاعری یہ تاثر دیتی ہے کہ ان کا شاعرانہ وجدان غزل آشنا ہے اور چاہتا ہے کہ غزل کو آمد والے لہجے میں اس طرح برتے کہ غزل شاعرہ کے حسن وسلوک سے پھول کی طرح کھل اٹھے۔ ان کے شعری لہجے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ خیال اور مضمون کی ندرت والی دنیاؤں سے واقف ہیں۔ یہ آگاہی ان کے لہجے کو وہ تازہ دمی عطا کرتی ہے جو سبک اور گراں بار ہر طرح کے احساسات کو بغیر کسی کاوش کے بیان کر جاتی ہے۔ نصرت مہدی ایسے تازہ کار شعر لکھنے لگی ہیں جو غنایت سے تو بھرپور ہیں مگر تلازمات، استعارات اور تراکیب سے دامن جھٹکنے کے باوجود گہری معنویت کے حامل ہیں اور یہ ان کی کامیابی ہے۔

نصرت مہدی کی غزل پڑھتے ہوئے یہ خوبی بھی نظر آتی ہے کہ انھوں نے فیشن والی نسائیت پسندی کو اپنی غزل میں راہ نہ دی۔ اس شعری رویے کی بنیاد پر ان کی غزل اپنے مرکزی دھارے سے باہر نہیں آتی۔ وہ شعر کو غزل کا شعر بنا کر ہی پڑھنے والوں کے حوالے کرتی ہیں

۔نصرت کی غزل یہ انکشاف بھی کرتی ہے کہ خیال اور جذبے کی محرابوں میں چراغ روشن کرنے کا ہنر اور سلیقہ انھوں نے سیکھ لیا ہے۔

نصرت مہدی جس خود اعتمادی اور یقین کے ساتھ اس جہانِ دراز میں محوِ سفر ہیں اسے دیکھ کر یقین ہے کہ وہ دور تک اور دیر تک ظاہر اور باطن کے ان مناظر کو لفظوں میں سمیٹتی رہیں گی۔نمونۂ کلام پیشِ خدمت ہے۔

روشنی دیتی ہے پیغام ہر ایک منظر سے
یہ دیے میرے نہ بجھ جائیں ہوا کے ڈر سے

مرحلہ ضبط کا عشق میں سنبھلو نصرت
چشمِ احساس میں ٹھہرے ہوئے آنسوں کی طرح

چھا گیا روح پہ احساس سے طلسمی تیرا
میں بھی طاری ترے اعصاب پہ جادو کی طرح

بے خوف جو سچ بولتا رہتا ہے ہمیشہ
وہ آئینہ اپنا میں بدلنے کی نہیں ہوں

❖❖❖

کوثر چاند پوری: مفکر اور افسانہ نگار

ڈاکٹر نصرت مہدی

کوثر چاند پوری ضلع بجنور کے قصبہ چاند پور سیاؤ میں 8 اگست 1900ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا انتقال 13 جون 1990 کو دہلی میں ہوا۔ تدفین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تاریخی قبرستان میں ہوئی۔ ممتاز ناقد و محقق مالک رام نے کوثر صاحب کی سال پیدائش 1908ء تحریر کی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر گیان چند جین نے 1905 قرار دی ہے۔ کوثر چاند پوری کے صاحبزادے افسانہ نگار نعیم کوثر نے اپنے مضمون مطبوعہ سہ ماہی ''کاروانِ ادب'' بھوپال شمارہ 27 میں تحریر کیا ہے کہ سرکاری سروس بک کے مطابق کرثر صاحب کی تاریخ پیدائش 8 اگست 1900 ہے۔ بہر حال یہ بحث آگے نہیں بڑھی۔

بھوپال کے آصفیہ طبیہؒ کالج سے طبیب کامل کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ ریاست کے یونانی شفاخانہ میں طبیب کا تقرر پائے۔ 1955ء میں افسر الاطباء کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔ 1965ء میں ہمدرد نرسنگ ہوم دہلی کے چیف میڈیکل آفیسر کے عہدہ پر تقرر ہوا۔

آغاز میں کوثر چاند پوری کو شاعری سے دلچسپی ہوئی۔ اس دور کے ممتاز شعراء جمیل احمد

سہسوانی، مانی جائسی، آثر لکھنوی، عزیز لکھنوی، ہادی مچھلی شہری اور سیماب اکبر آبادی سے اصلاح لیتے رہے۔ بعدازاں نثر نگاری کی طرف راغب ہوئے۔ نگار لکھنؤ، نیرنگ خیال لاہور، ادبی دنیا اور شاہکار لاہور، کلیم دہلی جیسے معیاری رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ انشائیے بھی تحریر کئے۔ مضافات میں تعیناتی اور دیہاتوں کے سرسبز وشاداب ماحول نے انہیں افسانہ نگاری کی طرف مائل کیا۔ یہ 29-1928ء کا زمانہ تھا۔ پریم چند اردو افسانہ کے باوا آدم ہوئے۔ رومانوی افسانہ نگاری میں سجاد حیدر یلدرم کی مقبول شناخت تھی۔ آہستہ آہستہ سلطان حیدر جوش، پنڈت سندرشن، اعظم کریوی، ایم اسلم، علی عباس حسینی اور حیات اللہ انصاری نے بھی قدم بڑھائے۔ کوثر چاند پوری کا شعور منشی پریم چند سے زیادہ متاثر ہوا۔ وہ ثابت قدمی سے عصری زندگی کے مسائل کا احاطہ کر رہے تھے۔ زندگی کو حقیقت پسندی سے منسلک کیے رہے۔ انقلابی نعروں سے دور رہتے ہوئے کوثر چاند پوری نے انفرادی شناخت قائم رکھی۔ اس کا اعتراف ممتاز ناقد وقار عظیم، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر اعجاز حسین، پروفیسر عنوان چشتی، وزیر آغا اور انور سدید نے کیا۔ انہوں نے کوثر چاند پوری کو ادب میں اہم مقام دیا۔

اردو ادب میں کوثر چاند پوری کی ایک مخصوص شناخت تھی۔ افسانہ اور ناول کے علاوہ انہوں نے ادب اطفال پر بھی پوری نظر رکھی۔ بچوں کے لیے دلچسپ مصور کہانیاں لکھیں۔ ان کی تعداد 25 ہے۔ یہ دلچسپ امر ہے کہ ان کے افسانوی مجموعوں کی تعداد 14 اور ناول 17 تحریر کیے۔ یہ صاف ہے کہ وہ بچوں کے لیے بھی قیمتی وقت نکالتے تھے۔ ادب اطفال کو تخلیقی ذمہ داری خیال کرتے تھے۔

کوثر چاند پوری کو ہشت پہل ادیب کہنا مناسب ہوگا۔ انہوں نے ناول اور کہانیوں کی 56 کتابیں لکھیں۔ سوانح پر چار تصانیف، تنقید وافسانے وتحقیق پر 5 کتابیں اور رپورتاژ، ایک انشائیہ کے علاوہ طبی یونانی پر 15 کتابچے بھی منظرِ عام پر آئے۔ ساتھ ہی 5 مضامین بھی منظر عام پر آئے۔

یاد رہے کہ کوثر چاند پوری کا پہلا افسانوی مجموعہ ''دلگداز افسانے'' 1929ء میں مکتبہ

جدید لاہور نے اور پہلا ناول ''ویرانہ'' انوار احمدی پریس آلہ آباد نے 1944ء میں شائع کیا۔ جب کہ آخری افسانوی مجموعہ ''آوازوں کی صلیب'' 1973ء اور ناول ''مہکتی بہاریں'' 1974ء میں شائع ہوا۔ ناول ہو کہ افسانہ کوثر چاندپوری صاحب کا قاری وحدت تاثر کے خمار میں ڈوبا رہتا ہے۔ کسان اور محنت کش طبقہ، دفتری ملازمین، جاگیرداری اور زمینداری کے تانے بانے اور معاشرہ کے نشیب وفراز مرکزی خیال کو اثر انگیز بناتے ہیں۔

''کوثر چاندپوری زندگی کی طرح فن میں بھی نفاست پسند ہیں۔ وہ زندگی سے اتنا بے تکلف نہیں ہوتے کہ شرم وحجاب سے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنے لیے دیے بھی نہیں کہ غربت اور اجنبیت کا احساس باقی نہ رہے۔ وہ زندگی کو ایک خاص شریفانہ سطح سے دیکھنے اور اس سے متاثر ہونے اور اپنے فن میں سمونے کی شعوری کوشش کرتے ہیں''۔ کوثر صاحب نے اپنے فن میں کسی کی تقلید نہیں کی۔ زندگی اور سماج کے پیچ وخم کی عکاسی اور انسانی نفسیات کی تصویر کشی کی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں ''کہانی کے فن پر کوثر چاندپوری کو ماہرانہ قدرت حاصل ہے، ان کے یہاں فن کا مسلسل ارتقاء ہے۔'' نیاز فتح پوری کی نظر میں ''کوثر کے فن کی حقیقت نگاری میں دلکشی اور گہرائی ہے۔'' فکر تونسوی کہتے ہیں ''کوثر چاندپوری کا نام آتے ہی پریم چند کا تصور اُبھر آتا ہے۔ کوثر بھی اسی تہذیب وتعمیر کے نقیب ہیں''۔ پروفیسر کنہیالال کپور کے الفاظ میں ''کوثر چاندپوری اردو افسانہ کی توانا تحریک تھے۔'' ڈاکٹر اعجاز حسینی کی رائے میں ''کوثر چاندپوری کے افسانوں میں مقصدیت اور انسان دوستی کے جذبات ہیں''۔

پروفیسر مظفر حنفی نے لکھا ''افسانہ، ناول، ادبِ اطفال، تاریخ، سوانح، طب، انشائیے، رپورتاژ، طنز ومزاح، تنقید وتحقیق اور ماہنامہ ''جادہ'' کی ادارت۔ نہ جانے کتنی مہمات میں ان کے اشہب قلم نے جولانیاں کی ہیں۔ لیکن ان کی اتنی وسیع قلمی اور ادبی خدمات کا اعتراف ہماری تنقید نے اس جوش وخروش کے ساتھ نہیں کیا جس کا کہ کوثر چاندپوری کو حق تھا۔ غلام ربانی تاباں کا کہنا ہے ''کوثر چاندپوری ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ان کی عبارت اپنی صحت و شرافت کے اعتبار سے ایک امتیاز کی مالک ہے۔ ان کی کردار نگاری میں جذبہ کی آنچ ملتی ہے۔''

پروفیسر شفیقہ فرحت نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ''کوثر چاندپوری کا شمار اردو کے ایسے ادیبوں میں کیا جاتا ہے جو لمحاتی اور ہیجانی موضوعات پر نہیں بلکہ زندگی کے ادبی پہلوؤں کو بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے فن میں جگہ دیتے ہیں۔'' ممتاز پاکستانی ادیب و دانشور انور سدید (رحلت 2016) لکھتے ہیں'' آج کے بہت سے ادیب جب اپنے پالنے میں انگوٹھا چوس رہے تھے تو کوثر چاندپوری شہرت کے ہفت آسمان پر پہونچ چکے تھے۔ پھر کئی نامور افسانہ نگار ہمارے دیکھتے دیکھتے اپنی شہرت کا بوجھ نہ سہار سکے اور آج اتنے گمنام ہو گئے ہیں کہ ان کا نام افسانہ نگاروں کی طویل فہرست میں بھی نظر نہیں آتا؛ لیکن کوثر چاندپوری کا قلم نہ صرف رواں دواں ہے بلکہ ان سے اکثر و بیشتر ایسی تخلیق بھی وہ جاتی ہے ہیں۔ ان کا تذکرہ رسائل سے نکل کر لبوں تک بھی آجاتا ہے۔'' حیات اللہ انصاری نے رائے ظاہر کی ''کوثر چاندپوری کے اسلوب میں موپاساں کی شباہت ہے۔ معمولی سی بات میں گہرائی دیکھ لینا، قابل توجہ حرکتوں میں افسانہ پیدا کر دینا اور بڑی بڑی کہانیوں کو اختصار میں سمیٹنا ہی قلم کاریوں کی وجہ سے کوثر چاندپوری کی بعض کہانیاں دماغ میں عرصہ تک گونجا کرتی ہیں۔

یہ امر بھی باعث دلچسپی ہے کہ کوثر صاحب حاذق طبیب تھے۔ وہ مشہور زمانہ ''الحکیم'' لاہور کے مدیر معاون بھی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نبض شناسی افسانوں میں جذبہ کی آنچ اور حقیقت شناسی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ انہوں نے 1947ء سے 1951ء تک معیاری ادبی ماہنامہ ''جادہ'' بھوپال کی بھی ادارت کی۔ کوثر چاندپوری کے افسانے، ناول تخلیقی شعور کی پختگی اور فنی مہارت کی بالیدگی کے عکاس ہیں۔ ان کے افسانے نچلی منزل، باب کریم، ایک قدم تمنا کا، سیڑھی، اللہ بخشے، ارتھی، ید بیضا اور خون کی قیمت ایسے یادگار افسانے ہیں جنہیں زبان و ادب سرمایہ افتخار سمجھے گی۔ راقم الحروف کہہ سکتی ہے کہ یہ افسانے اردو صنف افسانہ کی ثروت مندی کا باعث ہیں۔ اس لیے کہ ان میں کوثر صاحب نے معنوی اور روحانی مسرت کے حصول کو ذہن میں ترجیح دی۔ شاید وہ مسرت کو بجائے خود افادی قدر سمجھتے تھے۔ موضوعات، کردار اور بیاناتی مراحل میں کوثر چاندپوری صاحب نے زندگی صرف زندگی کو علامت بنایا ہے۔ افسانے

کے رویے، اندازِ بیاں، لہجے اور پیشکش کے اعتبار سے کوثر چاند پوری ایک عظیم مفکر اور فکشن کے مایہ ناز فنکار تھے۔

سکریٹری

مدھیہ پردیش اردو اکادمی

علامہ اقبال مرکز، ملا رموزی بھون

بھوپال، مدھیہ پردیش۔

❖❖❖

ایک مصور بھی، ادیب بھی: پروفیسر سیما پرویز

ڈاکٹر شیخ نگینوی

جب ضلع بجنور کی تاریخ تحریر کی جاتی ہے اور اس میں یہاں کی ان شخصیات کا ذکر کیا جاتا ہے، جنھوں نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اپنا اور ضلع بجنور کا نام روشن کیا ہے تو ایک بڑی طویل فہرست تیار ہو جاتی ہے اور اس فہرست میں بہت سے نام چھوٹ بھی جاتے ہے۔ کالی داس کے شہرۂ آفاق ڈرامہ کی کردار شکنتلا، معروف ناول نگار قرۃ العین حیدر، افسانہ نگار صدیقہ بیگم سیوہاروی ، نذر سجاد، خواتین ہاکی ٹیم کی کپتان اور گول کیپر رہی رضیہ زیدی، اردو کی مشہور مصنفہ ڈاکٹر شمع افروز زیدی، جموں یونیورسٹی کی پروفیسر خورشید حمرا صدیقی، علی گڑھ یونیورسٹی کی پروفیسر ثریا حسین ڈاکٹر عابدہ سمیع ، مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی سکریٹری اور معروف شاعرہ ڈاکٹر نصرت مہدی وغیرہ خواتین کا تعلق ضلع بجنور سے ہے اسی فہرست میں ایک نام پروفیسر سیما جاوید کا بھی ہے۔ سیما جاوید نے پینسل ، برش اور رنگوں کے ذریعے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کئی ممالک میں اپنی پہچان بنائی۔

سیما پرویز معروف افسانہ نگار صدیقہ بیگم اور مشہور ادیب پروفیسر اطہر پرویز کی بیٹی ہیں صدیقہ بیگم اور اطہر پرویز دونوں کا آبائی وطن ضلع بجنور قصبہ سیوہارہ ہے انکے یہاں الہ آباد قیام کے دوران ایک بیٹی کی ولادت ہوئی جس کا نام سیما رکھا۔ الہ آباد کے بعد اطہر پرویز کی فیملی جامعہ

چلی گئی اور پھر وہاں سے علی گڑھ مستقبل مسکن بنالیا۔سیما کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی پھر لکھنؤ آرٹ کالج سے آرٹ کا کورس کیا۔کچھ برس ماریشس میں پروفیسر اطہر پرویز نے ملازمت کی تو سیما نے ماریشس کے مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ میں کچھ دن آرٹ کی کلاسیں لیں۔علی گڑھ واپسی پر سیما یونیورسٹی میں فائن آرٹ میں لیکچرر مقرر ہوئی۔اسی درمیان سیما کی شادی ایڈوکیٹ جاوید قمر سے ہوئی اور وہ سیما جاوید ہوگئی۔ریڈر اور پھر پروفیسر ہوکر جولائی 2014 میں ریٹائر ہوئی۔پروفیسر سیما جاوید علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فائن آرٹ ڈپارٹمنٹ کی 8 برس چیرمین رہیں۔

سیما پرویز کی پینٹنگ نے یوپی للت کلا اکادمی لکھنؤ، فائیو اسٹار کانٹینل ہوٹل ماریشش آسٹریلیا، سوئٹزرلینڈ اور نیشنل حبیب بینک، اردو انسٹی ٹیوٹ کے علاوہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر رونق بخش رہی ہیں۔انہوں پرنٹ میکنگ میں بھی کافی کام کیا ہے۔کئی قومی اور بین الاقوامی سطح کی نمائشوں میں آپ کی پینٹنگ شائقین کی توجہ کا مرکز بنی ہیں۔پروفیسر سیما کئی ریسرچ اسکالر کی سپروائزر بھی رہی۔آپ بنارس ہندو یونیورسٹی، جامعہ ملیہ یونیورسٹی دہلی، راجستھان یونیورسٹی، جے پور، کماؤ، روہیلکھنڈ، الہ آباد، امبیڈکر، دہلی وغیرہ یونیورسٹیز کی ایکسپرٹ کمیٹی، بورڈ آف اسٹیڈیز کی ممبر پی ایچ ڈی ایکزامنر رہ چکی ہیں۔اردو کیونکہ سیما جاوید کو وراثت میں ملی اس لیے انھوں نے ''آرٹ کی کہانی'' ''ہندوستان مصوری''، سائنس کے راستے پر اور تیجا سنگھ (ترجمہ اردو) کتابیں لکھ کر اردو کا حق ادا کیا جن پر انھیں اکادمی ایوارڈ بھی ملا۔شہرہ آفاق رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں پینٹنگ پر ان کے مضامین شائع ہوئے۔دبستان بجنور کے لیے جب پروفیسر سیما پرویز سے معروف افسانہ نگار اور ان کی والدہ صدیقہ بیگم پر مضمون کے لئے درخواست کی گئی تو انھوں نے نہ صرف اسے بخوشی قبول کیا بلکہ اپنی مصروفیت اور عمر درازی کے باوجود بہت جلد مضمون روانہ کیا۔

❖❖❖

معروف افسانہ نگار: صدیقہ بیگم سیوہاروی

پروفیسر سیما پرویز

معروف افسانہ نگار صدیقہ بیگم سیوہاروی کا بچپن سیوہارہ اور نگینہ میں گزرا۔ بچپن میں والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ دادی زندہ تھی ان کے پاس، پھر نگینہ اپنے ننہال میں رہیں۔ والد نے دوسری شادی کر لی۔ یہ لوگ تین بہن بھائی تھے۔ ایک بڑے بھائی اور ان سے بڑی بہن خود سب سے چھوٹی تھیں۔ مدھیہ پردیش جو اس زمانہ میں CP کہلاتا تھا بڑے بھائی کی ملازمت ریلوے میں وہاں کے شہر گوندیا میں ہو گئی۔ تو وہ وہاں چلی گئیں۔

اس زمانہ میں لڑکیوں کے پڑھنے لکھنے پر پابندی تھی۔ سیوہارہ میں تھیں وہاں رہ کے خاموشی سے کامل اردو کے امتحان دیے اور اردو رسالے چھپ چھپا کر پڑھتیں۔ کتابیں پڑھتی تھیں، خاموشی کے ساتھ جامعہ اردو کے سارے امتحان دیے۔ لکھنے کا شوق بھی ہو گیا۔ کہانیاں لکھنے لگیں اور رسالوں میں بھیجنے لگیں۔ جو اردو کے مختلف رسالوں میں چھپتی تھیں۔ خاندان میں اس بات پر اعتراض بھی ہوا۔

جب گوندیا میں رہنے لگیں تو وہاں یہ مسائل نہیں تھے۔ ترقی پسند تحریک سے جڑ گئیں۔ اردو ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس جبلپور میں ہوئی۔ غالباً یہ ترقی پسند ادب کی پہلی کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس میں شرکت کی اور وہاں اپنا افسانہ پڑھا۔ اتنے لوگوں کی بھیڑ میں اسٹیج پر ایک کم عمر لڑکی کے لئے اس زمانے میں یہ ایک بڑی بات تھی۔ غالباً یہ زمانہ آزادی سے کافی پہلے کا ہے مجھے اس کا سن تو

نہیں معلوم۔

جب ہم لوگ علی گڑھ میں رہتے تھے گوندیا قصبہ چھوڑے میری والدہ کو کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ ایک بار ظ انصاری صاحب علی گڑھ آئے تو مجھ سے بولے تمہاری امی نے جب جبلپور میں جب پہلی بار اسٹیج پر اپنا افسانہ پڑھا تو اس وقت وہ بہت کم عمر تھیں۔ افسانہ ختم ہو جانے کے بعد میں نے ان کو مبارک باد دی اور ہاتھ ملایا تو ان کے ہاتھ کے پسینے سے میرا ہاتھ بھی بھیگ گیا۔

آزادی سے پہلے ہی بڑے بھائی گوندیا کی ملازمت چھوڑ کے لاہور چلے گئے اور وہیں لاہور کراچی اور اس کے بعد حیدر آباد میں ۔۔۔۔ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے۔ بھائی کے جانے کے بعد سیوہارہ آگئیں بعد میں پھوپی زاد بھای اطہر پرویز سے شادی ہوگئی اور وہ الہ آباد آگئیں۔ کئی سال وہاں رہنے کے بعد میرے والد کی نوکری جامعہ میں ہوگئی۔ اس وقت میں بھی تھی۔ لکھنے کا سلسلہ جاری رہا۔ افسانوں کے پانچ مجموعے چھپے۔

1۔ دودھ اور خون۔ 2۔ رقصِ بسمل

3۔ پلکوں میں آنسوں 4۔ ہچکیاں

5۔ ٹھیکرے کی مانگ

ترقی پسند تحریک سے تعلق رہا۔ دودھ اور خون کے افسانے بنگال کے قحط سے متاثر ہو کر لکھے۔ مختلف رسالوں میں افسانے چھپتے رہے۔ اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی نشر ہوتے تھے۔ پاکستان کے رسالوں میں بھی چھپتے تھے۔ روسی زبان میں بھی ان کے افسانوں کے ترجمے ہوئے اور چھپے۔ علی گڑھ کے قیام کے دوران صدیقہ بیگم دلی کے ایک زمانہ رسالہ 'آوازِ نسواں'' کی اڈیٹر رہیں۔ ان کے افسانوں میں متوسط طبقہ کی گھریلو زندگی دکھائی دیتی ہے۔ انہوں نے اس کو ہی اپنا موضوع بنایا۔ ان کا مشاہدہ گہرہ ہے۔ متوسط گھرانوں کی اخلاقی، معاشی،، معاشرتی اور ذہنی زندگی کے تمام گوشے ان کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار حقیقی زندگی کے چلتے پھرتے ہیں۔ ان باریکیوں کو انہوں نے سیق کیا ہے۔ اپنے افسانوں کے کرداروں سے انہیں لگاؤ محسوس ہوتا ہے۔ جس کو انہوں نے بہت سادگی اور خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے

جڑی رہیں۔ الہ آباد سے ایک رسالہ سب رس نکلتا تھا وہ اس کی اڈیٹر رہیں۔ بعد میں آزادی کے بعد وہ رسالہ پاکستان سے نکلنا شروع ہو گیا جس کے لئے ان کو پاکستان بھی بلایا گیا مگر وہ ہندوستان چھوڑ کر نہیں گئیں۔

صدیقہ بیگم کی کہانیوں کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہوئے۔ روسی، چینی، اور انگریزی۔ اردو کی ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس میں یہ افسانہ پڑھا۔ ''پیپ بہتی ہوئی پکتے ہوئے ناسوروں سے'' اس سے ان کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

جامعہ چند سال رہ کر علی گڑھ آگئیں بس پھر ہم لوگ یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ میرا تقرر بھی یونیورسٹی میں ہو گیا۔ صدیقہ بیگم نے بہت کم وقت میں بہت لکھا اور اس وقت کافی شہرت بھی حاصل کی۔ بعد میں لکھنا بالکل چھوڑ دیا اور گھریلو مصروفیات میں لگ گئیں۔ یہ عورتوں کی بدنصیبی بھی ہوتی ہے گھر کو نظر انداز بھی نہیں کر پاتی ہیں۔ اردو ادب میں صدیقہ بیگم سیوہاروی کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ مختلف یونیورسٹی میں ان پر تحقیقی کام بھی ہوا ہے۔

بعد میں وطن سے بالکل تعلق ختم ہو گیا تھا اس بات کا ہم لوگوں سے کچھ ذکر نہیں کرتی تھیں مگر اس تکلیف کا ہم کو اندازہ تھا۔ والدین کے بعد ویسے بھی گھر سے تعلق دھیرے دھیرے ختم ہو جاتا ہے۔ مگر سوتیلے رشتہ کی وجہ بالکل ہی ختم ہو گیا۔ جامعہ میں جو وقت گزرا وہ ان کے لئے اچھا وقت تھا۔ ان کو ادبی سرگرمیاں ملتی رہیں مگر دھیرے دھیرے گھر کی مصروفیات کی وجہ سے کم ہوتی گئیں۔ جامعہ نیا نیا بنا تھا آبادی زیادہ نہیں تھی ادبی سرگرمیاں بھی تھیں اور سماجی بھی۔ پورے جامعہ کے لوگ ایک کنبہ کی طرح رہتے تھے چاہے وہ امیر طبقہ کے ہوں یا غریب یا درمیانی۔ سب ایک دوسرے کے خوشی اور غم میں شریک ہوتے تھے۔ آپسی میل ملاپ بہت تھا جس کا آج آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔

میں تو بہت چھوٹی تھی میری والدہ اور والد وہاں کی باتیں سناتے تھے۔ حبیب تنویر جو کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں ان دنوں جامعہ میں تھے اور ساتھ ہی رہتے تھے۔ انہوں نے وہی رہ کر اپنا ڈرامہ ''آگرہ بازار'' لکھا اور یہ ڈرامہ جامعہ میں پہلی بار اسٹیج ہوا۔

1957ء میں میرے والد علی گڑھ آ گئے ساتھ میں کنبہ بھی۔ میری والدہ کو ادبی ذوق تو تھا ہی مگر ساتھ میں سلائی، کڑھائی، بنائی اور بہترین کھانا پکانا بھی۔ خود ڈیزائن بناتی تھیں اور کڑھائی کرتی تھیں۔ ڈرائنگ بنانے میں ہماری مدد کرتی تھیں ہمیں سکھاتی تھیں۔ ان کی اولادوں میں میں سب سے بڑی تھی۔ اس لئے میں نے کافی وقت ساتھ گزارہ۔ جب سے ہوش سنبھالا جب سے یہ دیکھا وہ دوسروں کا کتنا خیال رکھتی تھیں۔ آس پڑوس کے لوگوں کا اور عزیز رشتہ داروں کا۔ والد کے ملنے والوں کا دائرہ بہت وسیع تھا، عورتوں کا گھر میں بہت آنا جانا بھی تھا۔ رشتہ داروں کا بھی آنا بہت تھا۔ وہ ہر ایک سے تعلق نبھاتی تھیں۔ کتنا ہی کام ہو ان کے ماتھے پر شکن نہیں آتی تھی۔ مگر دوسرا پہلو زندگی کا یہ بھی ہوا کہ ان مصروفیات کی وجہ سے ان کی ادبی زندگی بالکل ختم ہو گئی۔

4/1334 سرسید نگر، نزد عظیم ای اسٹیٹ
علی گڑھ۔202002
9837288049
ssjavedamu@yahoo.com

نور کا نور رعنا پروین

ڈاکٹر شیخ نگینوی

نور بجنوری ہمارے عہد کے ایک ہمیشہ زندہ اور تروتازہ رہنے والے شاعر ہیں، وہ پاک وہند کی ایک عہد ساز شخصیت ہیں رعنا پروین، نور بجنوری جیسے قدآور شاعر کی بیٹی ہیں۔

نور بجنوری کی وفات ہوئی تو اس سے پہلے وہ کافی بیمار ہو گئے تھے رعنا نے انکی وجہ سے ایک ماہ کی بینک سے چھٹی لی۔ رعنا اور نور کا گھر آمنے سامنے ہے وہ روزانہ کام کاج کر کے اپنا زیادہ وقت انکے پاس گزارتی۔ نور بہت سی باتیں کرتے اور بعض اوقات بہت خوبصورت مگر انتہائی غمزدہ سے اشعار سناتے ان دنوں نور ''چراغوں کا سفر'' مرتب کر رہے تھے۔ رعنا نے انکی بہت سی نظمیں اور غزلیں کاپی کیں اور انہوں نے کہا بیٹی وقت بہت کم ہے۔ بس اسے جلدی سے متین فکری کو بھیج دو تا کہ وہ پبلشر کو دے دیں اور یہ میری زندگی میں ہی چھپ جائے۔ رعنا کی چھٹی ختم ہونے کے چند دن بعد ہی انکا انتقال ہو گیا۔

رعنا نور کی پیدائش 25 ستمبر 1955 کو لاہور میں ہوئی۔ نور بجنوری انتہائی مشفق باپ، بہترین انسان اور نہایت مخلص دوست تھے۔ انہوں نے اپنی قلیل آمدنی میں بچوں کی بہترین پرورش کی۔ رعنا کی والدہ عابدہ خاتون انتہائی نیک عورت تھیں، جو کہ نور کی ماموں زاد بہن اور مولوی عبدالخبیر بجنوری کی چھوٹی بیٹی تھیں نور نے ہمیشہ تعلیم کو اہمیت دی جس کے باعث رعنا بینک میں vice پریزیڈینٹ کے عہدے سے ریٹائر ہوئی اور بیٹا طارق سہیل الیکٹریکل انجینئر بہت

ذہین اور Telented شخص ، چھوٹی بیٹی رخسانہ پروین جس کی حال ہی میں وفات ہوئی ، اس نے بھی گریجویشن کی ہوئی تھی۔

رعنا نور بتاتی ہیں ''ہم لاہور میں قیام پزیر تھے ساری تعلیم لاہور میں حاصل کی اور لاہور کالج سے اپنی گریجویشن مکمل کی ۔ ان دنوں اخبار میں بینک کی ملازمت کا اشتہار آیا اور میں نے نور صاحب کی اجازت سے ٹیسٹ کوالی فائی کر ملازمت شروع کی ۔ چونکہ ہمارے گھر میں بہت سے ادبی رسالے ، ہم قلم ، نگارش ، سیپ ، ادبی دنیا ، نقوش ، فنون اور نیرنگ خیال آیا کرتے تھے بچوں کے رسالے ہمارے لئے آتے تھے تعلیم و تربیت ، پھلواری ، بچوں کی دنیا ، پھول ، کھلونا ، بھائی جان ۔ اس لئے ہم تینوں بہن بھائیوں کو بچپن سے ہی مطالعے کی عادت تھی'' ۔ مجھے یاد ہے کہ جس دن بچوں کا اخبار (امروز) کا آنا ہوتا تھا تو میں اور طارق دونوں اس کوشش میں ہوتے کہ پہلے میں لے لوں اخبار والے نے میرا نام بھوکی رکھا ہوا تھا ۔ بس ایک نشست میں رسالہ ، اخبار ختم کرتی تھی چنانچہ پاپا نے ہمیں کوئی وعظ و نصیحت نہیں کی ۔ بس اپنے کردار اپنی شخصیت سے اور کتابوں کے ذریعے ہماری خاموش تربیت کی ۔ پھر اپنے بچپن کے قصے سناتے رہتے تھے جس سے ہمیں سچ بولنے اور بددیانتی سے بچنے کی عادت پڑی ۔''

رعنا نور آگے بتاتی ہیں کہ ''اگر آپ مجھ سے یہ پوچھیں کہ شاعری کی ابتداء کب کی میرا شروع سے ہی ادب کی طرف رجحان تھا اور زیادہ تر گھر میں رکھے رسالے پڑھا کرتی تھی اور اپنے اسکول میں مضمون اور خط ہمیشہ اپنے تخیل سے لکھا کرتی تھی جو کہ بہترین قرار پائے تھے ۔ کالج کے زمانے میں چند آرٹیکل لکھے اور ایک ڈرامہ ''لیٹرے محافظ'' لکھا ۔ اسکی کہانی کچھ یوں ہے کہ مجھے اخبار کا ایک ٹکڑا ملا (میری عادت ہے کوئی بھی پیپر بغیر پڑھے نہیں پھینکتی) اس میں نقلی سپاہی کی ایک چھوٹی سی خبر تھی اور اس خبر نے ایک مکمل ڈرامہ لکھوا دیا ۔ پاپا نے دیکھا تو بہت تعریف کی اور اس میں کوئی غلطی نہیں نکلی وہ میرے کالج کے میگزین میں چھپا ۔''

رعنا نے طالب علمی کے زمانے میں طبع موزوں پائی تھی سو چھوٹے موٹے شعر کہہ لیتی تھی ۔ فرسٹ ایر میں انھوں نے ایک غزل لکھی نور بجنوری کی کسی نظم غزل سے متاثر ہو کر ۔

رات کا سایہ ڈھلتا جائے صبح کا جادو چلتا جائے

جادو کی جو چھڑی گھمائی کنکر موتی بنتا جائے

وقت کو روکو پکڑو دیکھو لمحہ لمحہ ہنستا جائے

دیکھا جب بھی آس کا جگنو غم کا بادل چھٹتا جائے

پھر انھوں نے ایک اور غزل لکھی اور نور بجنوری کو دکھائی جسکا مطلع تھا۔

پہنچ ہی جائے گا وہاں

جہاں کا ہے یہ کارواں

نور صاحب نے کہا بیٹے اس کا کیا مطلب ہوا کہ پہنچ ہی جائے گا وہاں جہاں کا ہے یہ کارواں۔ سفر میں کوئی اٹل حقیقت کوئی ٹھوس بات ہونی چاہیے تم یہ بھی کہہ سکتی ہوں۔

ازل سے ہے رواں دواں

یہ زندگی کا کارواں

غرض یہ ابتدائی دور کی بات ہے۔نور صاحب نے بالکل حوصلہ افزائی نہیں کی اور میں نے بھی بینک ملازمت کے دوران اور پھر شادی کی مصروفیات میں لکھنے کی طرف بالکل توجہ نہیں دی البتہ مطالعہ جاری رکھا۔ادبی غیر ادبی رسالے ناول جومل سکے وہ پڑھ لئے۔

جب بچے سوتے تو انکو لوری سناتی تو از خود رعنا نے لوریاں بنالیں جوان کے بچوں کو آج بھی یاد ہیں مثلاً:

سوجا راج دلاری سوجا ماں کی پیاری

سو گئے چاند ستارے تو بھی سو جا پیارے

چھپ گیا چندا چھپ گئے تارے دیکھو بدلی آئی

نکلا چندا نکلے تارے چلی یہ کیسی پروائی

اور پھر انگریزی میں بھی لوری کہی اپنی بڑی بیٹی کے لئے

Sleep Sleep

O Baby Sleep
No moon is rising
No star is shinig
The night is dark
The dogs seldom bark
Sleep Sleep Sleep
O Baby Sleep
Keep quiet my darling
The dreams are charming
Hear the fairy tails
Don't bite your nails
Sleep Sleep Sleep
O baby Sleep.

پھر بچوں کے لئے نظمیں لکھیں۔

ہم نے ہے اک بلی پالی پیاری پیاری بھولی بھالی
یوں ہولے ہولے میرے نیا ڈولے

پھر ایک نظم محنت کی عظمت پر لکھی۔

تعلیم سے کبھی نہ دل اپنا چرانا ہے علم ایک دولت یہ نہ کی بھلانا
ایسے نہیں یہ قومیں چھا جاتی ہیں فلک تک اوج و کمال ملتا ہے کا م کر کے

اسکے علاوہ اور بھی بہت سی نظمیں بچوں کے لئے لکھیں۔ کہانیاں بھی لکھیں۔ طوطا کہانی، اللہ نگہبان۔

رعنا کہتی ہیں کہ ''میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ میں شاعری بھی کر سکتی ہوں ہمارے گھر کا ماحول بہت سادہ تھا۔ والد کے سامنے کچھ اور غزلیں بھی لکھیں مگر ان کا موضوع کچھ رومانوی تھا اس لئے اصلاح کروانے کی ہمت نہ پیدا ہوسکی۔ اور ہمیشہ ایک حجاب سا رہا۔''

جب رعنا کی امی کی وفات ہوئی اور پھر والد نور کی بھی تو انھوں نے اپنے والدین پر ایک نوحہ لکھا۔ نوحہ بچھڑی محبتوں کا۔

میرے خواب سارے بکھر گئے میری چاہ والے کدھر گئے

ہاں خوشبوؤں کا ہے بانکپن وہ جہاں جہاں سے گزر گئے

دو گلاب تھے جو کھلے ہوئے وہ ہوا چلی کہ بکھر گئے

میرا شہرِ دل بھی اجڑ گیا جو مکیں تھے کوچ وہ کر گئے

نہیں ضبط کا مجھے حوصلہ غم و درد حد سے گزر گئے

یہ پھر جنگ کے ادبی حصہ میں شائع ہوا نور صاحب کو ڈائری لکھنے کی عادت تھی میں نے وہ پڑھی اور جن کے بارے میں انھوں نے اچھے تاثرات لکھے تھے ان سے رابطہ کیا، خطوط لکھے۔ جواب میں احمد ندیم قاسمی، منو بھائی، امجد اسلام، متین فکری وغیرہ کے بڑے پیارے خطوط ملے جن میں پاپا کے لئے محبت، احترام کے جذبات تھے۔ میں پوری پوری رات بیٹھی پاپا پر مضمون لکھتی رہتی وہ میرا مضمون ''نیرنگ خیال'' میں چھپا۔

رعنا اپنے والد سے بہت پیار کرتی ہیں۔ اس پیار نے انھیں مجبور کیا کہ انکی یادوں کی شمع جلائے رکھیں اور پھر انھوں نے شاعری کرنے کی کوشش کی تاکہ ادب کے کسی کونے میں جگہ ملے ۔نور بجنوری کے نام اور انکی شاعری کی لو سے وقتاً فوقتاً دوسروں کو ان کی موجودگی کا احساس ہوتا رہے رعنا کو نور بجنوری کے خواب کو پورا کرنا ہے کہ وہ روشنی سے پیار کرتے تھے آ گہی کی روشنی ،محبت واحترام کی روشنی اور انسانیت کا نخوت وتکبر سے پاک رشتے کا معاشرہ۔

رعنا نے جو شاعری کی ہے اس میں غزل بھی کہی اور نظم بھی۔ آزاد نظم اور پابند نظم، حمد بھی نعتیں بھی لکھیں، سلام بھی لکھا، ہائیکو میں بھی لکھا غرض جو بھی ذہن میں آمد ہوئی وہ لکھا۔ رعنا اپنی شاعری کا تجربہ کرتی ہیں تو وہ فطرت سے بہت متاثر ہیں ان کی بیشتر نظمیں اور غزلیں اس حقیقت کی عکاس ہیں۔ شاعری ''جنگ'' کے ادبی صفحے میں چھپتی رہتی ہیں۔ رسالوں میں بھی چھپی ہے جن میں نیرنگ خیال، چہار سو کتاب وغیرہ ہیں۔ رعنا پروین شاعری کو کسی مخصوص نظریہ سے منتھی کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ ان کا ماننا ہے۔ ''شاعری کی پرواز لامحدود ہے البتہ شعر کہتے ہوئے یہ ضرور سوچنا چاہئے کہ اس سے سوسائٹی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''

رعنا اپنے پاپا نور بجنوری کی وفات سے پہلے کبھی مشاعرے میں نہیں گئی۔ البتہ جب نور بجنوری کے تعزیتی مشاعرے ہوئے اس میں بہت سے شاعروں میں انھیں اور بھائی طارق کو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا گیا جس میں شرکت کی۔

مشاعرہ پڑھنے کا سب سے پہلا موقع پی ٹی وی پر نعتیہ مشاعرے میں شرکت پر ملا۔ یہ رعنا کی زندگی کا پہلا مشاعرہ تھا اور اتنا اچھا پڑھا گیا کہ ٹی وی پر کافی مرتبہ نعتیہ مشاعرہ پڑھنے کا موقع ملا اسکے بعد چند مشاعرے ادبی تنظیموں کی طرف سے ہوئے ان میں شرکت کی۔ رعنا نور کے نزدیک ''مشاعرے بڑے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس سے انسان کی تہذیبی اور فکری تربیت ہوتی ہے''۔

نسبتیں انسان کے مقام کو دو چند کر دیتی ہیں اور اس تعلق کی بڑی اہمیت اور افادیت ہوتی ہے اور یہی صورت حال رعنا کے ساتھ بھی ہے دبستان بجنور کے لیے انھوں نے نور بجنوری کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال ہے، جو قارئین کی خدمت میں ان کے بہت شکریہ کے ساتھ پیش ہے۔

نور بجنوری ایک بلند پایہ شاعر

رعنا پروین

میرے والد نور بجنوری 24 جنوری 1924 کو یو پی انڈیا کے شہر بجنور کے ایک نہایت علمی، ادبی اور کٹر مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام نور الحق صدیقی تھا۔ میری دادی افتخار بانو کو خواب میں جناب غوث الاعظم حضرت شیخ عبد القادر جیلانی نے پاپا کے ہونے کی بشارت دی اور ان کا نام نور الحق رکھا۔ ان کے ایک بڑے بھائی محمد ادریس اور تین بڑی بہنیں تھیں۔ فاخرہ، مبینہ اور تیسری کا نام یاد نہیں۔ نور صاحب کے والد قاضی فرحت اللہ پولیس انسپکٹر تھے۔ اسی لئے ان کا بچپن ہندوستان کے مختلف شہروں میں گذرا۔ وہ بندیل کھنڈ، جریا پلکھوا، ضلع میرٹھ اور چھپری گوگورا اور ریاست ٹونک کا ذکر کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم جریا بندیل کھنڈ میں ایک استاد ناظم صاحب سے حاصل کی۔ تیرہ برس کی عمر میں ضلع ہمیر پور کے گورنمنٹ ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ نور صاحب نے علی گڑھ یونیورسٹی انجینئرنگ فورمین کی کلاس میں داخلہ لیا۔ مگر وائے قسمت 1941 میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور انہیں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر تلاش معاش میں لگنا پڑا۔ جریا اور علی گڑھ میں قیام کے دوران انہوں نے اردو اور انگریزی ادب کے حوالے سے بے شمار کتب کا مطالعہ کیا۔ چونکہ ان کے والد کے پاس بہت سی کتب اور رسالے آتے تھے لہٰذا انہوں نے ابتدا بانگ درا سے کی اور اس وقت کے تمام اردو و انگریزی شعرا اور ادبا کے کلام کو

پڑھا۔ان کا پورا خاندان علمی اور ادبی لحاظ سے اعلیٰ مقام پر فائز تھا۔ چنانچہ تحقیق کا عمل بانگ درا، تہذب نسواں، عصمت، پریم پچیسی، شیکسپیئر، سر والٹر سکاٹ، گلیور ٹریولز، گریٹر فیری لیٹ، ایس۔ بے۔ این۔ ونڈر لینڈ، چارلس ڈکنز، گریگ مائتھولوجی، الف لیلیٰ، حاتم طائی، قصہ چہار درویش کے ابتدائی مطالعہ سے شروع ہوا۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں قیام کے دوران جوش، اختر شیرانی، مجاز، داغ، فگار، غالب اور دیگر بہت سے شعرانے انہیں بیدار کیا۔انھوں نے 1942 میں ملٹری اکاؤنٹس لاہور سے ملازمت کی ابتدا کی۔1943 میں دہلی ٹرانسفر ہو گئے اور 1947 میں ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ منشی فاضل، بی۔اے۔آنرز اور ایم۔اے۔اردو کی اسناد دوران ملازمت حاصل کیں۔نور صاحب یوں تو بچپن سے ہی شعر کہ رہے تھے جو سب بچے ایک، ایک کر کے گایا کرتے۔

باد صبا تو جا کر میرا سلام کہنا
میرا سلام کہہ کر میرا پیام کہنا
کہنا ایک بلبل فریاد کر رہا تھا

انہوں نے اپنا پہلا باقاعدہ مشاعرہ 1937 میں، صرف تیرہ برس کی عمر میں جھکڑی گو گور میں ناظم توفیق صاحب کے توسط سے پڑھا اور ایک طرحی غزل کہی۔

بحر غم کا کنار کیا کہنا
کھنچ گیا عکس یار کیا کہنا
ان زلفوں میں تو مہک آئی
اے نسیم بہار کیا کہنا

(جگمگ)

نور صاحب علی گڑھ کالج میں خوب زور شور سے شاعری کر رہے تھے۔دو قطعے ملاحظہ کیجئے:۔

اب فریب وفا نہ دے مجھکو
رہنے دے زلف عنبریں کے حال

مجھ کو رعنائیوں میں قید نہ کر
سر سے ڈھلکا ہوا دوپٹہ سنبھال

میں نے دنیا کی بے ثباتی پر
خون روتے شفق کو دیکھا ہے
آؤ جی بھر کے پیار کر لیں آج
زندگانی کا کیا بھروسہ ہے

نور صاحب شروع میں جناب سیماب اکبرآبادی کے (بذریعہ ڈاک) شاگرد بن گئے اور اصلاح سخن کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن بہت تھوڑے عرصے میں فارغ الاصلاح قرار دیدیا گیا اور شاعر آگرہ کے کسی شمارے میں فارغ الاصلاح شعرا کی فہرست میں ان کا نام شائع ہو گیا۔ انھوں نے 1942 تا 1947 میں بہت سی نظمیں، غزلیں کہیں جو شاعر آگرہ، ادیب دہلی، ہمایوں، ادب لطیف، افکار وغیرہ میں شائع ہوئیں مگر ان کا کوئی ریکارڈ ان کے پاس نہیں تھا۔

انھوں نے 1947 میں ہجرت کی اور انسان کی بربریت کے تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور خود بھی دو تین مردہ نعشوں کے نیچے چھپ کر اپنی جان بچائی۔ یہاں لاہور میں انہوں نے سرکلر روڈ پر ''نیا ادارہ'' کے دفتر میں نذیر چودھری سے ملاقات کی اور پھر ان کی بہت سارے شعرا و ادبا سے ملاقات ہوئی۔ ان میں ساحر لدھیانوی، احمد راہی، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، سعادت حسن منٹو، ظہیر کاشمیری اور مرزا ادیب قمر تسکین اور بہت سے دیگر شامل تھے۔ پاک ٹی ہاؤس شاعروں اور ادیبوں کا مسکن تھا جہاں وہ باقاعدگی سے جاتے وہیں ان کی دوستی اے حمید سے بھی ہوئی۔ ان دنوں روزنامہ ''امروز'' میاں افتخار احمد نے نکالا تھا جو مولانا چراغ حسن حسرت، فیض احمد فیض اور ایوب کرمانی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اور یہ فی غزل، نظم دس روپے معاوضہ دیا کرتے تھے۔ نور صاحب نے قمر تسکین کے کہنے پر اس وقت غزل کہی۔ روزنامہ امروز کو بھیج دی۔ یہ اسی ہفتے شائع ہو گئی اور ادبی حلقوں میں اسے بہت پذیرائی ملی۔ ملاحظہ کیجیے:

کون یہ آیا بال بکھیرے
چونک پڑے مایوس اندھیرے
ہم کو دیکھ زمانے ہم نے
پتھر کھائے پھول بکھیرے

جگمگ

نور ''امروز'' میں برسوں مسلسل پوری آب وتاب سے چھپتے رہے جبکہ چراغ حسن حسرت کے زمانے تک گنے چنے شعراء وادیب امروز میں شائع ہوتے تھے۔ان کی لاتعداد اہم نظمیں، غزلیں یوم آزادی کے سلسلے میں نظمیں قائداعظم اور قائد ملت پر نظمیں، تضمین سب امروز کے صفحات میں گم ہیں۔اس کے علاوہ ان کے بعض تراجم ایک طبع زاد افسانہ ''زلفیں اور زنجیریں'' جو''امروز'' میں شائع ہوا تھا۔ادب لطیف، افکار، ہم قلم میں مطبوعہ ایک اہم نظم ''لومبا'' اور سویرا نمبر 3 میں ایک نظم ''محل'' بھی شائع ہوئی تھی جو ان کے پاس نہیں۔

ماہنامہ سیلاب لاہور ہفت روزہ انصاف، بہاولپور اور ہفت روزہ فرض میں بھی بہت لکھا۔اسکے علاوہ انہوں نے فنون، نقوش، ادبی دنیا، نگارش، افکار میں بھی بہت لکھا۔نور ایک جگہ لکھتے ہیں۔''یار نور بجنوری، تمام زندگی تم نے اس لاابالی پن میں گذار دی۔بہت خوبصورت تھا وہ لاابالی پن، مگر تف ہے تمہاری روایتی بے نیازی پر، کم از کم مطبوعہ چیزوں کو ہی محفوظ کرلیا ہوتا''۔

نور نے سویرا، ریاست، ویکلی دہلی ہفت روزہ فرض میں کام کیا۔فرض میں تو ادبی اور قلمی صفحے کے مدیر بن گئے۔ایک مستقل کالم احساسات کے نام سے لکھنا شروع کیا اور پھر اداریہ بھی لکھنے لگے۔1948 میں انڈیا جانے کے باعث یہ پرچہ بند ہوگیا۔ان کی عدم موجودگی میں دو شمارے مشہور شاعر قتیل شفائی کی زیرادارت شائع بھی ہوئے۔نور نے وحشی مارہروی کے رسالہ ''چاند اور آداب عرض'' میں بھی بہت لکھا اور چند ماہ تک ان کے ساتھ باقاعدہ کام بھی کیا۔یہ اپنے طرز کا انوکھا مزاحیہ ماہنامہ تھا۔اس میں نور، قمر تسکین، شبلی بی کام اور احسان بی۔اے مزاحیہ مضامین، افسانے اور پیروڈیاں لکھا کرتے تھے۔نور اپنے اصلی نام کے علاوہ علامہ لٹھیت، گرگ

انارکلوی اور جہانگیر فرحت کے نام سے بھی لکھا کرتے تھے۔ چاند میں ان کے تین افسانے، بھیڑیا، سنڈے ایڈیشن اور دل کے ٹیلیفون پر اصلی نام سے شائع ہوئے۔

نور ریڈیو سے بھی وابستہ رہے اور ایک ہفت روزہ پروگرام کے علاوہ کچھ ڈرامے بھی لکھے۔ایک تو سمزا تھا، باقی نام ذہن میں نہیں۔ٹی۔وی۔ پر ان کی ادبی تخلیق کشمیر سے متعلق تھی۔ وطن کے نغمے، کچھ غزلیں اور نظمیں ٹیلی کاسٹ ہوئیں۔

جہاں جہاں پہ لہو گرا ہے
زمین کا سینہ دہک اٹھا ہے
بہار گذرے گی جس طرف سے
یہی وہ رنگین راستہ ہے

میرے والد انتہائی زندہ دل ،خوش مزاج، خوش پوشاک اور ہر دلعزیز شخص تھے۔ ہمارے ساتھ بہت مشفق اور بے تکلف تھے۔ مگر رعب ایسا کہ گھور کر دیکھ لینا ہی کافی تھا۔ ہم تین بہن بھائی ہیں۔ میں (رعنا پروین) سب سے بڑی، پھر بھائی طارق سہیل اور بہن رخسانہ۔ ہم تینوں کے ساتھ وہ لوڈو، کارڈز اور کیرم کھیلا کرتے تھے۔ تعلیمی معاملات میں ہمیشہ رہبری کی۔ گو ہمارا گھرانہ مالی لحاظ سے ایک متوسط گھرانہ تھا، مگر انہوں نے کبھی کسی تنگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ہماری تعلیم کو اولیت دی اور تمام تعلیمی اخراجات نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کئے۔ چنانچہ ان کا بیٹا طارق سہیل ماشاءاللہ الیکٹریکل انجینیر ،اور انکی ایک بیٹی (راقم الحروف) بینک آفیسر (VP) بنی۔ دوسری بیٹی بھی گریجویٹ تھی وہ 2 فروری 2016 کو انتقال کر گئیں۔

وہ ایک نہایت سچے، کھرے اور مخلص انسان تھے۔ لاہور میں ان کے احباب کا وسیع حلقہ تھا۔ جن میں ادبی اور غیر ادبی سب طرح کے لوگ تھے۔ انکے ذاتی دوستوں میں احمد ندیم قاسمی، قمر تسکین، ناصر زیدی، کلیم عثمانی، محمد طفیل، عزیز اثری، یونس نشاط، زیب ملیح آبادی، ڈیوک آپٹیکل والے، فاروقی صاحب، ولی حمزہ نازش وغیرہ تھے۔ انہوں نے کبھی اپنی دوستی کو کیش نہیں کرایا اور نہ کبھی کسی سے شکوہ کیا۔ اپنے بچھڑے دوستوں کو بہت یاد کرتے تھے۔

اے میری عمر گذشتہ کے سہانے لمحو
میرے بچھڑے ہوئے احباب کہیں سے لاؤ

پھر یہ شکوہ بھی کہ،

اے کاش تجربوں کی دولت مجھے نہ ملتی
اے کاش یوں نہ ڈرتا میں اپنے دوستوں سے
تھی بہت فہرست یاروں کی طویل
رفتہ رفتہ نام سارے کٹ گئے
کتنی خستہ ہے کتاب زندگی
سب ورق مہر و وفا کے پھٹ گئے

نور بجنوری کی شاعری گلشن ادب کا ایک خوبصورت کنج تھی۔ مگر وائے قسمت کہ انہیں زندگی میں وہ شہرت نہ مل سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ حالانکہ تمام قد آور شعراء اور ادیبوں نے ان کے استادانہ رنگ کو تسلیم کیا۔ بقول احمد ندیم قاسمی ''نور اردو کا ایک نہایت ذہین، بے حد حساس اور مکمل طور پر شائستہ شاعر تھے ان کا پہلا شعری مجموعہ ''جگمگ'' 1964 میں منظر عام پر آیا۔ اس میں ان کا 1947 سے لیکر 1962 تک تخلیق کردہ کلام شامل ہے۔ اس سے پہلے، یعنی 1941 سے 1947 تک کا کہا گیا بے شمار کلام شاید ہجرت کی نذر ہو گیا۔ حالانکہ یہ وہ دور تھا جب انکی تخلیقی قوتیں شباب پر تھیں اور بقول ان کے اگر وہ محفوظ رہ جاتا تو کئی اور شعری مجموعے چھپ سکتے تھے''۔ دیباچہ معروف دانشور و ادیب احمد ندیم قاسمی نے لکھا، عنوان تھا ''نور کی شاعری'' جو ان کی شاعری کا ایک بھرپور اور ناقدانہ جائزہ تھا۔ ان کی برسوں پہلے کہی ہوئی باتیں آج بھی پرانی نہیں ہوئیں۔

قاسمی فلیپ پر لکھتے ہیں، ''نور کی غزل میں اردو غزل کی ان تمام روایات کا فنکارانہ احترام موجود ہے جو نہایت حسین ہیں اور جب تک شاعری زندہ ہے، وہ زندہ رہنے اور رکھے جانے کے قابل ہیں۔ ان روایات میں ہر نئے غزل گو نے انفرادی اضافے کیے ہیں اور نور نے بھی خوبصورت اضافوں کا یہ سلسلہ جاری رکھا ہے۔ فیض، سیف اور قتیل کی طرح نور کو بھی الفاظ کی

موسیقی سے کام لینے کا ملکہ حاصل ہے“۔

دوسرا مجموعہ۔ ”ہجر کا سورج“۔ 1995 میں شائع ہوا۔ یہ ان کی چنیدہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ تیسرا مجموعہ ”چراغوں کا سفر“، وہ اپنی زندگی میں بیماری کے دوران نومبر 1996 میں مرتب کر کے چھپنے کیلئے بھجوا چکے تھے۔ ان کی آخری خواہش تھی کہ۔ ”میری زندگی میں ہی چھپ جائے“، مگر مجھے امید نظر نہیں آتی کیونکہ زندگی بار بار یاد دلا رہی ہے کہ وقت بہت کم ہے۔ وہی ہوا، وہ اپنی خواہش تشنہ چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ پھر یہ مجموعہ کلام 2010 میں لاہور سے شائع ہوا۔

نور بجنوری نے جس زمانے میں شعور کی آنکھ کھولی، اس وقت شعری ادب میں انقلاب اپنا کام کر چکا تھا۔ اقبال کے عہد آفریں کلام کے بعد ترقی پسند تحریک سے نور بھی متاثر تھے۔ انھوں نے پورے ادراک کے ساتھ شاعری کی روایت اور جدید حیثیت سے اپنے ادبی شعور کو نامدار کیا اور انتہائی توانا اور پرکشش لہجہ اپنایا تو وہ باذوق ادبی قارئین اور شعرا کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ان کی شاعری میں ایک منفرد انداز اور بڑا وصف ان کا سچا اور کھرا پن تھا جو دل میں اتر جاتا تھا۔

سید عارف نے اپنے مضمون میں لکھا کہ ”نور بجنوری کے سچے پن اور خودداری کے کئی تناظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ واقعی اپنے کھرے اور مفادات کو ٹھوکر مارنے والے انسان کیلئے ہمارے سماج میں کوئی جگہ نہیں۔ ہم تو چڑھتے سورج کے پجاری ہیں۔ مندروں کی چاکری: منصبوں کے گرد گھومتے اور عہدوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ نور صاحب میں بلا کا ملال تھا۔ خلاف طبع کوئی بات سنتے اور نا برداشت کرتے تھے۔ جہاں تک نور صاحب کی شاعری اور فن کا تعلق ہے: احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا کہ نور بجنوری کا موضوع فن ”زندگی اور اس کے مفاہیم و مقاصد کی جستجو ہے“۔

وہ ”چراغوں کے سفر“ کے متفرقات کا مجموعہ بھی چھپوانا چاہتے تھے مگر وہ اپنی آخری خواہش تشنہ چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔

رات کے جگنو ہو گئے رخصت — صبح کا تارا چلا گیا
لے گئے خواب اڑا کر ہم کو — دیکھتی رہ گئی ساری دنیا

گو شعر و ادب کے بڑے بڑے نقادوں میں جدید شعری ادب اور جدید اسکالروں نے

جائزے میں شاذ ہی نور بجنوری کا اچٹتا سا ذکر ہی کیا ہو۔ اس کے باوجود نور اُردو کا ایک ذہین بے حد حساس اور مکمل طور پر ایک شائستہ شاعر ہے، (احمد ندیم قاسمی)۔

بہر حال نور بجنوری ان تمام باتوں سے بے نیاز ایک قلندر صفت آدمی تھے اور صف اول کے شاعر تھے۔ اور ہمیشہ رہیں گے۔ ان کی شاعری 58 برس پر محیط ہے۔ لیکن جب ایک اہم مضمون ''اردو غزل کے پچاس سال'' (رشید امجد صاحب سے معذرت کے ساتھ) اور دوسرا مضمون ''اردو نظم کے پچاس سال'' (رفیق سندھلوی صاحب سے معذرت کے ساتھ) روزنامہ جنگ کے ادبی صفحہ پر چھپے تھے۔ یہ دونوں تحقیقی مضامین ہیں اور ان میں نئی اور پرانے دور کے شعرا کو شامل کیا۔ مگر وہ اس تحقیق میں نور بجنوری کو نظر انداز کر گئے۔ تو اب سوائے اس کے اور کیا سوچا جا سکتا ہے کہ جدید سوچ اور کلاسیکی اظہار کا ایک اور اہم تخلیقی فنکار ہمارے ادبی معاشرے کے رویے کی عمومی بے حسی کا شکار ہو گیا۔

اکثر ادبی حلقوں میں یہ سوال بھی اٹھایا جاتا کہ پہلے مجموعے ''جگمگ'' 1964 اور دوسرا مجموعہ ''ہجر کا سورج'' 1995 میں تیس سال کا طویل فاصلہ کیوں ہے۔ میں ٹھیک سے تو نہیں جانتی مگر میرے خیال میں یہ شاعر کا انتہائی ذاتی فیصلہ ہوتا ہے کیونکہ اس عرصے میں وہ تواتر سے لکھتے اور معروف ادبی پرچوں میں چھپتے رہے۔ بعض اوقات احساس کی کسوٹی پر ناشناس زمانے کا رویہ بھی اس بات کا محرک ہو سکتا ہے۔

شہر ناپرسان میں جب موتی بھی کنکر ہو گیا
میں بہت حساس تھا گھبرا کہ پتھر ہو گیا

سن 2006 میں میرا اپنے شوہر شجاعت کے ساتھ دس دن کیلئے بجنور جانا ہوا تو پتہ چلا کہ وہاں نمائش میں دسمبر 2005 میں نور بجنوری کے اعزاز میں ایک بہت بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس میں حکومتی سطح کے اعلی فسران بھی شامل تھے۔ انویٹیشن کارڈ پر نور بجنوری کی ایک خوبصورت فوٹو اور ایک شعر درج تھا۔

ہمارا شہر، ہمارا تو کیا تمہارا شہر
تمہارے شہر کی ہر بات یاد آتی ہے

(کارڈ میرے پاس محفوظ ہے)

وہ ریٹائرمنٹ کے بعد 1986 میں تین ماہ کیلئے بجنور گئے تھے۔ مگر وہاں پرانی محبتیں

بچھڑے دوست اور معلوم نہیں کیا احساسات ہوں گے۔ کافی اپ سیٹ ہو گئے۔ وہ اس دنیا کے کینوس سے ہمیشہ کیلئے چلے گئے۔

ہماری ناک میں تھی زرد ساحلوں کی ہوا
سمندروں کی تہوں میں اتر گئے ہم لوگ

ان کا ایک نظری ناول "ہائے محبت، ہائے زمانے" یہ لاہور سے 1957 میں شائع ہوا۔ اور اس کا دیباچہ ایڈیٹر "نقوش" محمد طفیل نے لکھا۔

ان کے تینوں شعری مجموعے، روشنی کا استعارہ ہیں۔ جگمگ، سورج، چراغ۔ البتہ وہ معاشرے کی ناہمواریوں کا کرب دل میں سمیٹ کر، اندر ہی اندر سلگتے رہے۔

میں زندگی کی سخاوت پہ کانپ اٹھتا ہوں
کہ بے دریغ یہ ظالم لٹا رہی ہے مجھے
اب مجھے پہچاننے والا یہاں کوئی نہیں
چپ کھڑا ہوں دیر سے شہر وفا کے سامنے

وہ ایک خوددار انسان تھے اور خوشامد کو زحمت سمجھتے تھے۔

ہم سے کبھی کسی کی خوشامد نہ ہو سکی
فن ذلتوں کہ راہ میں دیوار بن گیا

انہوں نے کبھی شہرت کی پرواہ نہیں کی اور تنہائی میں خیالات واحساسات کی محفل سجائے رہتے۔

میں آئینوں کی بستی میں قدم رکھنے سے ڈرتا ہوں
نظر آیا نہ میں خود کو، تو دل پہ زنگ آئے گا
ضرور یہ بھی کوئی دشمنی نکالے گا
کسی نے پیار سے دیکھا تو ڈر گئے ہم لوگ

نور احساسات کی کسوٹی پر خود کو پرکھنے کا ہنر جانتے تھے۔

ملک سخن میں اور بھی دستور تھے بہت
کہنے کو یوں تو نور بھی مشہور تھے بہت
اچھا ہوا کہ آج بھرم اپنا کھل گیا
ہم اپنے انکسار پر مغرور تھے بہت

ہم تک پہنچ سکی نہ صدائے رحیل بھی
ہم حدِ بازگشت سے بھی دور تھے بہت

نور صاحب کسی ادبی تنظیم سے وابستہ نہ تھے۔ جب ان کی وفات ہوئی تو اخباروں میں خبریں چھپیں، تعزیت کے پیغام آئے، انھیں میں ایک خط اے حمید صاحب کا بھی تھا جسے میں کوٹ کرنا چاہوں گی۔ ''برخورداری شاعر اور ادیب زندہ نہیں رہتے انھیں ان کا فن زندہ رکھتا ہے۔ نور بجنوری کے شعر اس کے دل سے نکلے ہیں اور دوسروں کے دل میں اتر کر نور کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے مگر مجھے فخر ہونا چاہئے کہ تم ایک عظیم انسان، ایک خوبصورت شاعر، ایک خوبصورت آدمی کی اولاد ہو۔ اور واقعی بہت سے مختلف الخیال لوگوں کا ایک طعنہ عظمت پر متفق ہوتا ہے۔

میں بہت عرصے سے اس کوشش میں ہوں کہ ان کی کلیات چھپوالوں اور باقی کلام حمد نعت، سلام، نظمیں، وطن کے گیت جو ان کے مجموعوں میں نہیں، وہ بھی شامل ہوں۔ کاش میرے پاس کوئی نیک مہربان جن ہوتا جو ان کی تمام گم گشتہ ادبی تخلیقات کو سالہا سال پرانے اخباروں، رسالوں کی تہ سے نکال لاتا۔ کیونکہ بقول نور بجنوری۔

زمین نے رینگنا سیکھا تھا جب خلاؤں میں
تمام شہر طلسمات کے گمان میں تھا
کہ تیری آنکھ کا جادو میرے بیان میں تھا
میں اس سے قبل بہت قبل بھی اڑان میں تھا

میں اپنا مضمون، ان کی نظم ''گشت وفا'' کے ایک بند پر ختم کرتی ہوں:

پلکوں پہ سجائے ہوئے بہتے ہوئے خورشید
آنکھوں میں سسکتے ہوئی مہتاب چھپائے
ہونٹوں پہ جلائے ہوئے سنگیت کی شمعیں
ماتھے پہ چمکتے ہوئے افکار سجائے
پہلو میں کسی شوخ تمناؤں کے مدفن

چہرے پر کسی ناچتی امید کے سائے
قدموں میں لپٹتی ہوئی احساس کی زنجیر
ہاتھوں میں کئی پھول کئی خواب اٹھائے
بڑھتا ہی چلا جاتا ہوں، میں دشت وفا میں
ایک جذبہ بے نام کو سینے سے لگائے
آیا ہے کوئی قافلہ یادوں کے نگر سے
کچھ پھول سے ٹوٹے ہیں میری تار نظر سے
ہاں تجھ سے بچھڑنے کا سماں یاد رہے گا
اس دن درودیوار تھے کچھ خاک بسر سے

میرے پیارے والد نور بجنوری کا انتقال 2، اکتوبر کی رات 1996 میں ہوا۔ وقت رخصت زبان پر کلمہ اور چہرے پر ایک ملکوتی مسکراہٹ اور لافانی طمانیت چھائی ہوئی تھی۔ بالکل میری ماں عابدہ خاتون کی طرح جو صرف گیارہ ماہ پہلے وفات پاگئی تھیں۔

لے گئی خواب اڑا کر ہمکو
دیکھتی رہ گئی ساری دنیا
کھلا وہ اک دریچہ گھنے درختوں میں
وہ سبز پوش ہوا پھر بلا رہی ہے مجھے

رعنا پروین
دختر نور بجنوری
House 504, Gali- 15
Sector1/10-2,Islamabad,
Pakistan

آئیڈیل ٹیچر۔ڈاکٹر سبطین سیدہ

ڈاکٹر شیخ نگینوی

ڈاکٹر سبطین سیدہ کا تعلق صدیوں سے علم وادب کا گہوارہ رہے شہر امروہہ سے ہے آپ کی ولادت محلہ شفاعت پوتہ امروہہ میں 2/جولائی 1971 کو سید محمد سبطین کے گھر پر ہوئی۔گھر میں بااخلاق تعلیمی ماحول ملا اور شہر کی ادبی فضائیں میسر آئیں ،تو ذہن کا بچپن سے ہی تعلیم کی طرف مائل ہونا فطری تھا۔آپ ایک کے بعد ایک تعلیمی پائیدانوں پر چڑھتے ہوئے پوسٹ گریجویٹ تک پہنچ گئیں اور اردو، ہندی میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔حصولِ علم کا سلسلہ یہیں پر تمام نہیں ہوا۔اپنے والد سید محمد سبطین کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے آپ نے اردو ادب میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

موصوفہ 25 اکتوبر 2000 کو امروہہ کے یہی محلہ بچدرہ کے رہائشی آفتاب احمد نقوی کے صاحبزادے اور روز نامہ انقلاب کے ضلع نمائندے سید حسنین نقوی کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئیں چونکہ شوہر کا عملی میدان بجنور شہر ہے۔لہذا شادی کے چند ماہ بعد ہی آپ بجنور میں رہائش پذیر ہوگئیں۔فی الحال آپ یوپی پرائمری ایجوکیشن بورڈ کے اسکول میں اردو معلمہ کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہی ہیں۔معیاری شعری ونثری ادب کا ذوق رکھتی ہیں۔خانگی ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی انجام دینے کے ساتھ اپنی مصروفیتوں سے وقت نکال کر مطالعہ میں غرق

ہو جاتی ہیں۔ مختلف اردو ہندی جرائد میں آپ کے ادبی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اور آپ متعدد ادبی سیمناروں میں مقالے پیش کر کے اپنی علمیت اور ادبی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکی ہیں۔

حالانکہ ڈاکٹر سبطین سیدہ نے ہندی ادب میں بھی ایم اے کیا ہوا ہے، تاہم اُن کا اوڑھنا بچھونا اردو زبان ہی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اردو اُن کی گھٹی میں شامل رہی ہے۔ سرکاری ملازمت میں آنے سے قبل انھوں نے آلِ احمد گرلس انٹر کالج امروہہ میں اردو لیکچرار اور بعد ازاں بجنور گرلس انٹر کالج میں بحیثیت پرنسپل اپنی خدمات بخوبی ذمہ داریوں کے ساتھ دیں۔

بجنور گرلس انٹر کالج کی ملازمت کے دوران ہی آپ کو روہیلکھنڈ یونیورسٹی بریلی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ اس کے بعد ایل ایم ڈگری کالج سیوہارہ بجنور میں اردو لیکچرر کے عہدے پر فائز ہوئیں۔ وہاں ایک آئیڈیل ٹیچر کے طور پر اپنی شناخت قائم کی اس کے بعد ڈاکٹر سبطین سیدہ نے سٹی ڈگری کالج نگینہ میں اپنی خدمات انجام دینی شروع کی۔ یہاں آپ وائس پرنسپل، چیف پراکٹر اور این۔ ایس۔ ایس کی پروگرام آفیسر کے عہدے پر بہت محنت و جانفشانی سے اپنے فرائض انجام رہتی رہی۔

فی الحال آپ مظفر نگر ضلع کے ایک قصبہ کے اسکول میں اردو معلّمہ کی حیثیت سے مقرر ہیں۔ ڈاکٹر سیدہ بچوں کو اردو تعلیم ہی نہیں دیتی۔ بل کہ انھیں اخلاقی تربیت بھی دیتی ہیں۔ ساتھ ہی ان میں دینی جذبے کے فروغ کے لیے بھی کوشاں رہتی ہیں۔ متعدد جرائد و رسائل میں مضمون نگار کی حیثیت سے چھپنے کے ساتھ ہی ڈاکٹر سبطین سیدہ جدید لب و لہجے کے نمائندہ شاعر اور اردو ہندی ادیب نشتر خانقاہی کی فن اور شخصیت سے متعلق تحقیقات پر مبنی ایک کتاب بھی تصنیف کرنے میں مصروف ہیں اور توقع ہے کہ یہ کتاب عنقریب منظر عام پر آجائے گی۔

❖❖❖

اُردو ادب کے سائنسداں: اظہار آثر

ڈاکٹر سیدہ سبطین نقوی

بجنور ضلع، جہاں علم وادب اور صحافت کے میدان میں اپنی مردم خیزی کے لیے ہندوستان کے ساتھ ساتھ بیرونِ ہند میں بھی مشہور ہے، وہیں اس ضلع کا قصبہ کرتپور اپنے شعر وسخن، میدانِ ادب اور اپنے باذوق باشندوں کی وجہ سے خاصی شہرت کا حامل ہے۔ سرزمین کرتپور میں ابرار کرتپوری اور عشرت کرتپوری جیسے مایۂ ناز شاعر وادیب پیدا کیے، تو اظہار آثر جیسے ایک عظیم فنکار کو بھی جنم دیا، جس نے نہ صرف اپنی شاعری کے ذریعہ شائقینِ ادب کی شعور کی تسکین کی؛ بلکہ بے شمار ناول، افسانے، سائنسی اور ادبی مضامین، انشایئے اور تنقید، اسٹیج اور ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھے۔

اظہار اثر نے 15/جون 1928 کو قصبہ کرتپور میں جناب مختار احمد کے گھر میں آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے صرف میٹرک تک تعلیم حاصل کی، لیکن اپنے غیر معمولی ذوقِ مطالعہ اور فطری ذہانت کی بدولت نہ صرف اُردو بلکہ انگریزی و ہندی ادبیات میں بھی دسترس حاصل کی۔ یہ بات حیران کن ہے کہ اظہار اثر نے میٹرک تک تعلیم پائی، لیکن جدید سائنسی علوم پر اُن کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ اس میدان میں انھوں نے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کرنے والوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ابتداء میں شاعری کے وسیلے سے اظہارِ جذبات کیا۔ پانچویں کلاس میں پہلی غزل کہی۔ ہمت افزائی ہوئی تو باقاعدہ شعر گوئی کا سلسلہ شروع کردیا۔ 1943 میں لاہور جا کر حضرت احسان دانش

سے باقاعدہ اصلاح لینا شروع کردی۔ 1950 میں دہلی لوٹے اور یکے بعد دیگرے ماہنامہ ''چلمن''، ''بانو'' اور ''آریہ ورت'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے، لیکن تنخواہ اتنی قلیل تھی کہ گزراوقات مشکل تھی۔ آریہ ورت کی ادارت کے دوران جناب اظہار اثر نے اپنا پہلا نفسیاتی ناول تخلیق کیا۔ قسط وار شائع ہونے والے اس ناول نے شائقین کی دنیا میں دھوم مچادی۔ یہ ناول کتابی شکل میں بھی اور اپنے زمانے کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب بن گیا۔ اس کی بے پناہ کامیابی نے اظہار اثر کے قلم کو مزید جلا بخشی اور ناول، افسانے، سائنسی، ادبی مضامین، انشائیے، تنقید اور اسٹیج وریڈیو کے لیے ڈرامے وغیرہ لکھنا شروع کردیئے اور اسی کو اپنی روزی روٹی کا وسیلہ بنالیا۔

اظہار اثر کا ذہن تجسّس پسند تھا۔ جو کچھ نئے سے نئے کی تلاش میں انھیں بے چین رکھتا تھا۔ رومانی، سماجی، ماورائی کہانیوں اور ناولوں کے ساتھ ہی موصوف جاسوسی ادب تخلیق کرنے لگے۔ سائنسی مزاج اور مطالعے نے یہ کمال دکھایا کہ اُن کے تحیر آمیز جاسوسی ناول اس درجہ مقبول ہوئے کہ خود اپنے جاسوسی رسائل ''انوکھا جاسوس'' اور ''محل'' نکالنے لگے۔ اسی کے ساتھ اُن کا نام ابن صفی اور اکرم الہ آبادی جیسے بڑے جاسوسی مصنّفین کے ساتھ لیا جانے لگا۔ اپنی حیات میں موصوف نے ۶۰۰ر سے زائد جاسوسی ناول لکھے جو معیاری ذوق رکھنے والے قارئین کے حلقوں میں بھی نہایت دلچسپی سے پڑھے جانے لگے۔

اظہار ثر نے اپنی تخلیقی کاوشوں کو عام آدمی تک پہنچانے کے لیے اپنی زبان سادہ اور سلیس رکھی۔ انھوں نے ہندی اور اُردو دونوں ہی زبانوں میں سائنسی ادب تخلیق کیا۔ ناولوں کے ساتھ انھوں نے بے شمار مضامین بھی لکھے، جو برصغیر کے مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے۔ اُن کے مضامین کا ایک مجموعہ اُردو اکیڈمی نے شائع کیا، جس پر انہیں ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس سب کے باوجود انھوں نے شاعری کا سلسلہ بھی جاری رکھا، جو اُن کی روحانی تسکین کا وسیلہ تھی۔ اُن کے دو شعری مجموعے ''بشارت'' اور ''لاشریک'' شائع ہوئے، جو دنیائے اُردو ادب میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں۔ اظہار اثر نے اپنی تقریباً 83 سالہ زندگی کے 53 سال سے زائد تخلیق ادب میں

گزارے اور اپنے عہد کے مصروف ترین قلم کاروں میں شمار ہوئے۔ باوثوق طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جس مقدار میں اظہار اثر نے ادب تخلیق کیا اُتنا برصغیر کے کسی قلمکار نے نہیں کیا۔

اظہار اثر کے تعلق سے یہ بات بھی کم حیران کن نہیں ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مصروف ترین قلمکار ہونے کے باوجود بھارتیہ شاستریہ، نرتیہ کلا میں بھی مکمل دسترس رکھتے تھے۔ اسی فنی مہارت کی بناء پر مشہور قلمکار فاروق ارگلی نے اپنے ایک مضمون میں اظہار اثر کے لیے لکھا تھا کہ: ''اگر یہ (اظہار اثر) ادیب اور شاعر کی حیثیت سے مشہور نہ ہوئے ہوتے تو پھر کتھک، کتھا کلی اور بھارت ناٹیم کے ماہر اظہار جی مہاراج ہوتے''۔ انہوں نے دس بارہ سال تک باقاعدہ فنِ رقص کی تربیت حاصل کی اور اپنی زبردست پرفارمنس کی بدولت کافی شہرت حاصل کی۔ نیز درجنوں شاگردوں شاگرداؤں کو رقص کی تعلیم دی۔

اظہار اثر نہایت خوش پوش اور باحوصلہ شخص تھے۔ 83 سالہ زندگی کے آخری دنوں میں بھی موصوف نہایت چاق و چوبند اور پھرتیلے بنے رہے۔ مثبت اندازِ فکر کے حامل اظہار آثر نہ اپنی کامیابی پر خوش ہوتے تھے اور نہ ناکامی پر رنجیدہ۔ دوسروں کے کام آنے میں وہ دلی مسرت محسوس کرتے تھے۔ جمالیاتی ذوق اُن کے مزاج کا خاصہ رہا۔ اُردو کا یہ عظیم فنکار 15 اپریل 2011 کو نہایت خاموشی کے ساتھ اس دنیائے فانی کو خیر باد کہہ گیا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور اُن کی قبر کو نور سے بھر دے۔

اظہار آثر کی اہم تصنیفات

بشارت (مجموعۂ غزلیات)، لاشریک (مجموعۂ منظومات)، موت کی وادی، ناگن، فرعونہ، آدھی زندگی، مشینوں کی بغاوت (نفسیاتی ناول)، دو آنکھیں، مہرباں کیسے کیسے، پتھر کے پھول، بیس ہزار سال بعد (سماجی رومانی ناول)، گھر (تصوراتی ناول)، آج کی سائنس (سائنسی مضامین)۔ ان کے علاوہ 600 سے زائد جاسوسی اور 300 کے قریب سماجی ناول، 400 سے زائد افسانے مختلف موضوعات پر لاتعداد مقالے و مضامین، ٹوٹا ستارہ، تیسری آنکھ، (سائنسی فکشن پر ریڈیو سیریز، اماں اینڈ فیملی اور چور صاحب (ٹی وی کے لیے مقبول ڈرامے) غالب انسٹی ٹیوٹ کے ہم سب گروپ کا ڈرامہ،

یادِ جوش وفراق، انارکلی کی واپسی، نیز اسٹیج کے لیے کئی یک بابی ڈرامے۔ حکومتِ ہند کے محکمۂ درسی کتب (NCERT) کے لیے سادہ زبان میں سائنسی معلومات کی کتاب۔

اظہار اثر کے بعض اشعار:

عمر بھر زہر پیا تیرے لبوں کو چھوکر	ہم نے چھوٹی سی خوشی کی بڑی قیمت دی ہے
پڑھ رہا ہوں ترے بدن کا ورق	یہ بھی اللہ کا صحیفہ ہے
تھا جن کے دل میں درد وہ انسان بن گئے	جو بچ گئے تھے صاحب ایمان بن گئے
مذہبی بارود ہے، کہنے کو گیلی ہے بہت	شہر بھر کے واسطے ماچس کی اِک تیلی بہت
تیرا بدن ہے چاند سے اُتری ہوئی کرن	میرا وجود اُٹھتی ہوئی لہر کی طرح
ایک بے نام سی خواہش نے پجارن بن کر	عمر بھر ہم کو جلایا ہے چراغوں کی طرح
کس طرف جاتا کوئی سب راستے مسدود تھے	یعنی ہر منزل پہ میرے نقشِ پا موجود تھے
ہر حسیں چیز کو تخلیق کیا ہے ہم نے	ہم نے سوچا ہے تو وہ جسم غزل تو ہوگا
تخلیقِ کائنات کا دیتا جواب کون	ہم آج تک سوال سے آگے نہیں بڑھے
میں گنہگار، سبھی سنگ بدست	شہر میں حشر بپا ہے مجھ سے
کچھ ایسے سخت جان نہ تھے ہم بھی دوستو	ہم شیشگی کے خوف سے پتھر بنے رہے
میں تو افلاک سے آگے کا پرندہ ہوں اثر	بالِ جبریل بھی شامل ہے مرے شہپر میں

اعزازات وانعامات:

• اُترپردیش اُردو اکیڈمی ایوارڈ 1975 • انٹرنیشنل پوئٹس اکیڈمی ایوارڈ 1975 • دہلی اُردو اکیڈمی ایوارڈ (برائے سائنسی ادب) 1977 • انٹلکچول انٹرنیشنل فورم انڈیا ایوارڈ (برائے اعلیٰ ادبی خدمات) 1998 • عبارت وکاس پریشد ایوارڈ (برائے صحافتی اور سماجی خدمات) 2001۔

ڈاکٹر سبطین سیدہ
نئی بستی، بی:24، بجنور (یوپی)
موبائل: 8958341848
Email: sibtainsaiyeda12@gmail.com

عالمی شہرت یافتہ دانش جاوید

ڈاکٹر شیخ نگینوی

پیدائشی نام: جاوید اختر۔ قلمی نام: دانش۔ فلمی نام: دانش جاوید۔ بات شروع ہوتی ہے 12 مارچ 1970 کی ایک صبح جب بہن بھائیوں میں تیسرے نمبر پر پیدا ہونے والے ایک بچے کے حصے میں خواب، خواہشیں، وسائل اور مسائل سب کا سب تیسرے نمبر پر آنے لگتا ہے مگر بچے کی ضد ہے جو کچھ بھی چاہئے وہ اول نمبر پر چاہئے، کچھ ضد، کچھ تقدیر کی مہربانی اور کچھ بہت اچھے اور بہت سچے مگر بہت قابل استاد کم والد قیام بجنوری کی رہنمائی اور سراپا محبت وایثار، ماں کی دعائیں اور روحانی استاد افسر جمشید کا انوکھا پیار، ان سب نے مل کر پیدائش کے وقت جو جاوید اختر تھا اسے دانش جاوید بنا دیا اور دانش جاوید نے اتنا سارا حوصلہ پاتے ہی خوابوں کے پیچھے اتنی تیز دوڑ لگائی کے سب پیچھے رہ گئے۔

پیدائش بجنور شہر کے ایک غیر فلمی مگر مکمل علم اور مذہبی گھرانے میں ہوئی، قرانی تعلیم قاری عبدالستار سے حاصل کی، اسکے بعد رشتے کی ایک خالہ کے سپرد کر دئے گئے (جو محلّہ مردھگان کے سرکاری گرلز اسکول میں پڑھاتی تھیں) پہلی سے پانچوی کلاس تک وہیں بڑی مستقل مزاجی سے پڑھائی کی اسکے بعد مختلف اسکولوں سے گزرتے ہوئے بجنور انٹر کالج سے انٹر پاس کیا، اسکے بعد کچھ تعلیم کی چاہ اور کچھ والد محترم کا خوف علی گڑھ مسلم یونیورسٹی لے آیا۔

اونچائی سے گھبراؤ تو لوٹ آنا
اڑتے اڑتے تھک جاؤ تو لوٹ آنا
راہ کی راحت غیر کی چاہت ٹھیک نہیں
گھر سے باہر گھر پاؤ تو لوٹ آنا

دانش جاوید

لیکن جو لوگ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور علیگڑھ مشن سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ سرسیدؒ کا یہ چمن اڑنے کی خواہش رکھنے والوں کے دست و بازو کو نہ صرف قوت بخشتا ہے بلکہ ایک کھلا آسمان بھی عطا کرتا ہے چنانچہ دانش جاوید کے اندر موجود ایک فنکار کو بھی اے ایم ۔یو۔ میں اڑنے کے لیے ایک کھلا آسمان ملا جہاں دانش جاوید نے اپنی فنی اڑان کی ابتدا کرتے ہوئے شاعری اور افسانہ نگاری کی شرعات کی اور کیا خوب کی۔

مصوّر تجھ کو حاصل ہے یقین کوئی تو جادو
تصوّر سے بھی بہتر ہے میری تصویر کا چہرہ

پڑھائی پوری کرنے کے ساتھ ساتھ تصور کو لفظوں کی تصویر میں ڈھالتے ڈھالتے دانش جاوید علی گڑھ سے دہلی ہوتے ہوئے ایک دن ممبئی آگئے اور ممبئی آکر خیالی تصویروں کو وقت کے مالک نے پردہ سیمیں عطا فرما دیا، پہلا ٹی۔وی۔سیریل 1995 میں دوردرشن پر ''کتنے دور کتنے پاس'' کے نام سے ٹیلی کاسٹ ہوا، پہلی فلم ''سنیاسی میرا نام'' 1998 میں آئی اور اسکے بعد پچھلے 21 سالوں میں نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیاں کے ٹی وی چینلوں پر انگنت ٹی وی سیریلوں کے ہزاروں ایپی سوڈ نشر ہوئے اور سیلاب ،نرگس ،چھنکار، پیاہنا ،ہوائیں ،تو نصیب ہے کسی اور کا،کوئی تو ہو جیسے بڑے کامیاب سیریلوں اور ''سنیاسی میرا نام'' سے ''چھوٹے سرکار اور'' چاند تمہارے لیے'' جیسی انٹرنیشنل فلموں کی کامیابی نے دانش جاوید کو شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا اور انھوں نے 2005 کے سال میں ''ہوائیں'' کے لئے ''بیسٹ اسکرپٹ رائیٹر'' کا را پا نیشنل ایوارڈ جیتا۔

سال 2009 میں دبئی کے انٹرنیشنل ٹی وی چینل اے۔آر۔وائی۔ کے چیئرمین اقبال

گاندھی صاحب کے بے حد اسرار پر دانش جاوید نے اے۔آر۔وائی۔چینل جوائن کرلیا اور دبئی منتقل ہو گئے اور مسلسل 8۔9 برس دبئی سے لیکر امریکا اور کینیڈا تک اپنی پیشوارانہ صلاحیتوں کا لوہا منواتے رہے اور اپنی لیڈرشپ میں اے۔آر۔وائی۔ کو خلیج سے لیکر امریکا، انگلینڈ اور آسٹریلیا تک نمبر ایک چینل بنا کر ہی دم لیا۔یہی وہ زمانہ تھا جب دانش جاوید نے باقائدہ عالمی مشاعروں میں شرکت کی اور دیکھتے ہی دیکھتے خلیج، پاکستان اور ہندوستان کے اکثر عالمی مشاعروں میں شرکت شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے خلیج، پاکستان کے اکثر عالمی مشاعروں کامیاب ناظم بن گئے۔

لیکن سال 2012 آتے آتے دانش جاوید کو ممبئی فلمی دنیا ایک بار پھر ستانے لگی یا یوں کہئے کہ انکے اندر کا آزاد پرندہ نوکری کے پنجرے سے رہائی مانگنے لگا، چنانچہ انھوں نے ایک بار پھر وقت کی آواز پر لبیک کہا اور سامان سفر باندھ کر ممبئی کا رخ کیا۔ممبئی نے پھر انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔واپس لوٹتے ہی فلمی دنیا نے انھیں ”فلم رائیٹرایسوی ایشن“ کا نائب صدر منتخب کرلیا اور نائب صدر منتخب ہوتے ہی انھوں نے فلم اور ادب کو جوڑنے کے اپنے برسوں پرانے خواب کو تعبیر دینے کا کام شروع کیا اور نتیجہ یہ کے 1955 میں ساحر لدھیانوی کے بعد (تقریباً 60 سال بعد) 2016 میں دانش جاوید صاحب نے ”فلم رائیٹرایسوی ایشن“ کے بینر پر سالانہ عالمی مشاعرے کی شروعات کی۔

آج دانش جاوید نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں فلم اور ٹی وی اسکرپٹ رائٹنگ، صحافت اور شاعری کے حوالے سے ایک معتبر اور معروف نام بن چکے ہیں۔ان کے ہی کلام سے تعارفی سطور اختتام کرتا ہوں۔

سرخ ڈورے نہیں نہ خونِ جگر ہے شاید
میری آنکھوں میں گئی رت کا سفر ہے شاید
غیر کے در پہ جھکا ہے میری مرضی کے خلاف
میرے کاندھوں پہ کسی اور کا سر ہے شاید

دانش جاوید

دبستانِ بجنور کا شاعر قیام بجنوری

جاوید دانش

مداروں، محورِ گردش میں رہنا
بجز اِس کے قیام اپنا نہیں ہے

جب کوئی کسی کا تعارف لکھتا ہے تو ابتداء پیدائش، جائے پیدائش یا پھر پیدائش کے حالات اور واقعات سے کرتا ہے مگر میرا دل چاہتا ہے کہ قیام بجنوری صاحب (یعنی میرے والد) کے تعارف کا آغاز میں ان کی انتہا یعنی ان کے انتقال کے دن سے کروں۔

لے گئی سُوئے فلک شبنم کو مرکز کی طلب
حیف، اِن قطروں کو تو بے بال و پر سمجھتا تھا میں

قیام بجنوری

بات 26 اپریل 2008، صبح 11 بجے کی ہے، میں دوبئی، میڈیا سٹی کے اپنے آفس میں بیٹھا، روز مرّہ کے کام کو نبٹانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور یہ کوشش ناکام اس لئے تھی کہ اسی روز قبلہ قیام صاحب کی angioplasty (یعنی شاعر کے دل سے چھیڑ چھاڑ) کا وقت، دہلی کے مشہور cardiologist ڈاکٹر جمال نے شام 6/ بجے طے کیا تھا۔ میرے بھائی بہن، دوست احباب، سب دہلی میں تھے مگر میں قبلہ قیام صاحب کے حکم کی زنجیروں میں جکڑا ہوا، اپنی تمام تر

بے چینیوں اور گھبراہٹوں کے ساتھ، ہر سوچ سے خالی، دماغ اور جذبات سے لبریز دل لئے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا (قیام صاحب کا حکم تھا کہ تم دہلی نہیں آؤ گے کیوں کہ دوبئی میں ان کے پوتے کا سب سے پہلا اسکول شروع ہوئے ابھی صرف دس دن ہی گزرے تھے) میری بے چینی کی انتہا یہ تھی کہ کبھی بچوں کو فون کر کے لالچ دیتا کہ دادا کے لئے دعا کرو، ایک ہفتہ تک روز تمہیں دوبئی کے سب سے اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلاؤں گا تو کبھی ڈاکٹر جمال کو اور چھوٹے بھائی کو دہلی فون کرتا تھا کہ یار آپریشن آج نہیں کل یا کسی اور دن کرالینا۔ پریشانی کے اس عالم میں اچانک میرے فون کی گھنٹی بجتی ہے اور میں عجلت میں فون اٹھاتا ہوں۔ ہندوستان کا نمبر دیکھ کر گھبراہٹ میں ہرے رنگ کی بجائے لال رنگ کا بٹن دب جاتا ہے...... جھنجلا کر call back کرتا ہوں۔ ہندوستان سے میرا کوئی دوست، عالمِ اسلام کے تابندہ ستارے، مولانا انظر شاہ کاشمیری کے انتقال کی خبر سناتا ہے۔ ایک صدمہ سا لگتا ہے اور میں اسی کیفیت میں قبلہ قیام صاحب کو فون لگا دیتا ہوں اور اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے سوال کرتا ہوں...... 'کہیں آپ کو گھبراہٹ تو نہیں ہو رہی ہے'...... دوسری طرف قبلہ قیام صاحب کا قہقہہ سنائی دیتا ہے (جیسے انہوں نے میری گھبراہٹ کا اندازہ لگا لیا ہو)...... اور پھر وہ میرے سوال کا ایسا جواب دیتے ہیں جو مشعلِ راہ بن کر، مجھے، میری آخری سانس تک راستہ دکھاتا رہے گا، انہوں نے کہا...... ''گھبرائے وہ جس کی تیاری نہ ہو''

میں گنہگار نہیں تیری طرح اے واعظ!
تو نے دیکھی ہے مرے دامنِ تر کی صورت

اللہ اکبر............ ایسے جیسے کوئی مکمل زادِ راہ لے کر، کسی طویل سفر پر اس یقین کیساتھ نکلے کہ منزل ہر حال میں اس کی قدم بوسی کرے گی۔ ٹھیک اسی طرح قیام الدین قیام بجنوری صاحب اسپتال گئے اور اور وہیں سے 26 / اپریل 2008 کی رات گیارہ بج کر پینتالیس منٹ پر سفرِ آخرت کو روانہ ہو گئے اِنّا للہ و اِنّا الیہِ راجعون۔

اک مسافر ہوں چلا جاؤں گا سب کچھ چھوڑ کر
موت سے پوچھو میرے پیچھے کہاں تک آئے گی

ہمارے زمانے کی طرح، پرانے زمانہ میں نہ تو birth certificate بنتے تھے اور نہ ہی عام طور پر یومِ پیدائش منائے جاتے تھے اس لئے بچوں کی ولادت کا دن اس دن طے کیا جاتا تھا جس دن ہائی اسکول کا فارم بھرا جاتا تھا۔ اسی طرح کا ایک یومِ پیدائش قبلہ قیام صاحب کے certificates میں بھی موجود ہے مگر بقول خود قیام صاحب...... ان کی پیدائش علامہ اقبالؔ کے انتقال سے ایک برس پہلے ہوئی۔ (قبلہ قیام صاحب، علامہ اقبالؔ کے ایسے عاشق تھے کہ انہوں نے اپنی پیدائش کے سال کو علامہ اقبالؔ کی موت کے ساتھ یاد رکھا) تو اس حساب سے ان کی پیدائش کا سال 1937 ٹھہرا۔ حالانکہ قیام صاحب کی جائے پیدائش بجنور ہے لیکن ان کے والدِ ماجد جناب حسام الدین صاحب کا تعلق دھام پور کے قریب قصبہ نیندرو کے معروف زمین دار قاضی ثناء اللہ کے خانوادے سے تھا اور قانون کے مشہور جانکار قاضی قدرت اللہ، حسام الدین صاحب کے والد اور قبلہ قیام صاحب کے دادا تھے۔

چھ بہن بھائیوں میں دوسرے نمبر پر مگر بھائیوں میں سب سے بڑے قیام صاحب کی تعلیم و تربیت کا خاص انتظام کیا گیا۔ آپ نے قرآن اور دین کی ابتدائی تعلیم، اس وقت کے مشہور اور جید قاری فاروق صاحب سے حاصل کی۔ دنیاوی تعلیم کی ابتداء، کنگ جارج میموریل مسلم ہائی اسکول، (آج کے بجنور انٹر کالج، بجنور) میں ہوئی۔ اسی زمانہ میں قیام صاحب نے ہاکی کھیلنا شروع کی اور اپنے بچپن کے دوستوں فرقان صاحب (مدینہ پریس والے)، حفیظ انصاری صاحب، ماسٹر یامین خاں، پنڈت مہرشی، رن وجے بھان سنگھ اور ماسٹر توحید صاحب کے ساتھ 'National Club' کی بنیاد رکھی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کلب کا قد، بجنور کے سب سے پرانے اور مشہور کلب...... 'Official Club' کے برابر جا پہنچا۔ ہاکی کھیلنے والے جانتے ہیں کہ اس کھیل میں سب سے مشکل اور سب سے عنقاء پوزیشن لیفٹ ہاف کی ہوتی ہے اور قبلہ قیام صاحب اپنے وقت اور اپنے علاقہ کے سب سے کامیاب لیفٹ ہاف مانے جاتے تھے اس لئے 'آفیشل کلب' اور اس کے ممبران (چمن لال شرما، راجیشور پرساد وشنوئی، مہندر ناتھ کھنہ اور سریندر ناتھ) نے بارہا چاہا کہ قیام صاحب نیشنل کلب چھوڑ کر آفیشل کلب کے ساتھ آ جائیں

لیکن قیام صاحب جیسے صاحب کردار شخص نے نہ تو اپنا کلب ہی چھوڑا اور نہ ہی پرانے ساتھیوں کا ساتھ، البتہ اپنے پرانے دوست چمن لال شرما (جو بعد میں ہندوستان کے اسپورٹس ڈائرکٹر بنے) کو بہت اصرار پر، گاہے بہ گاہے خاص خاص ٹورنامنٹس میں آفیشل کلب کے لئے لیفٹ ہاف کھیلنا شروع کیا اور نہ صرف اپنے ضلع بلکہ Region اور صوبہ میں بھی شہرت کی بلندیوں کو پہنچے۔ اسی زمانہ میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ڈپٹی پروکٹر مختار احمد صاحب نے کسی میچ میں قیام صاحب کو کھیلتے دیکھا اور ان کے والد جناب حسام الدین صاحب سے بذاتِ خود بجنور آکر کہا کہ آپ اپنا یہ لڑکا مجھے دے دیجئے اور انہوں نے اپنا لڑکا قیام الدین، مختار صاحب کو دے دیا...... اور اس طرح قبلہ قیام الدین صاحب اپنی ہاکی کے ساتھ علیگڑھ روانہ ہو گئے۔ آپ علیگڑھ میں B.Com اور M.Com کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے لئے کھیلتے بھی رہے اور کئی ٹرافیاں اور کئی Inter University Championships اپنی ہاکی کے دم پر اپنی مادرِ درسگاہ کو جتائیں۔ ہاکی کے علاوہ قیام صاحب A.M.U. Atheltic Club کے بھی مستقل ممبر رہے اور Inter University میں بقول سیّد مشیر حیدر صاحب (اس وقت کے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اتھلیٹک چیمپین) قیام صاحب نے کئی سال 100 میٹر، 200 میٹر اور 400 میٹر چیمپین شپ میں کسی دوسرے اتھلیٹ کا چراغ نہیں جلنے دیا۔

خاک ہو کر بھی یہ کہتا ہے مرا جوشِ جنوں
دشتِ وحشت میں بگولوں کی طرح اڑتا پھروں
میں پرندہ، بے نشیمن، اڑتے رہنا ہے مجھے
دے نہ دھوکا منزلوں کا اے فضاءِ نیلگوں

قیام بجنوری

قیام صاحب نے اردو اور فارسی کی تعلیم اپنے والد کے بہت قریبی دوست اور بجنور کے استاد شاعر جناب منشی ولایت حسین صاحب سے حاصل کی اور قیام صاحب کی ذہانت، محنت اور منشی ولایت حسین صاحب کی خاص توجہ نے رنگ دکھایا اور قیام صاحب دیکھتے ہی دیکھتے نہ صرف اردو اور

فارسی داں ہو گئے بلکہ اقبالیات پر ایسی دسترس حاصل کر لی کی خود منشی ولایت حسین صاحب، علامہ اقبالؔ کی شاعری کے رموز واسرار سمجھنے اور سمجھانے میں قبلہ قیام صاحب کی مثالیں دینے لگے۔

حقیقتِ اَزَلی لا الٰہ الااللہ
بلندیِ اَبدی لا الٰہ الااللہ
خودی کو دیکھ تُو فطرت کے آئینہ میں قیام
خود آگہی ہے خودی لا الٰہ الااللہ

قیام بجنوری

انھیں دنوں جب قبلہ قیام صاحب کا تعلیمی سفر، نویں یا دسویں پڑاؤ پر تھا، تب کنگ جارج میموریل ہائی اسکول نے ایک self composed poetry compitition کا اعلان کیا (ان دنوں تقریباً ہر کالج و اسکول میں اردو شاعری کے فروغ کے لئے ایسے مقابلوں کا انعقاد ہوتا تھا) اور مصرعہ طرح رکھا گیا......

وہ قطرہ نیساں تو بن جا
جس قطرہ پہ دریا ناز کرے

منشی ولایت حسین صاحب کے حکم پر قیام صاحب نے بھی طبع آزمائی کی اور نہ صرف یہ کہ بھرپور غزل کہی بلکہ قیام صاحب کی پہلی غزل نے انعام بھی جیتا۔ اس غزل کی اصلاح، منشی ولایت حسین صاحب نے ہی کی تھی اور اردو اور فارسی کی طرح شاعری میں بھی قبلہ قیام الدین قیامؔ بجنوری کے علم و فضل کی ابتدائی نوک و پلک، جناب منشی ولایت حسین صاحب نے ہی سنواری۔

بہت تلاش کے باوجود بھی وہ طرحی غزل مکمل تو مجھے دستیاب نہیں ہو سکی البتہ طرح کا شعر اور مطلع مجھے اپنے محترم چچا اور قیام صاحب کے چھوٹے بھائی جناب نسیم الدین صاحب کی یاد داشت میں ضرور محفوظ ملے۔ آیئے آپ کو گوش گزار کرتا ہوں......

اک سیدِ رمیدہ کو کیوں کر
نخچیر وہ تیر انداز کرے

ترکش میں نہ ہو سُوفار کوئی
چلّہ بھی نہ جس سے ساز کرے
ہے علم تو بحر بے پایاں
ساحل پہ کھڑا موجوں کو نہ گن
وہ قطرۂ نیساں تو بن جا
جس قطرہ پہ دریا ناز کرے

قیام بجنوری

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم و تربیت، ہاکی اور دیگر کھیلوں کے ساتھ ساتھ قبلہ قیام صاحب کا مشغلہ لوح و قلم بھی جاری رہا۔ آپ نظم کے ساتھ ساتھ نثر میں بھی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا لوہا منواتے رہے۔ اس وقت کے بڑے اردو اور ادبی رسالوں ...... شمع، بیسویں صدی اور آل انڈیا ریڈیو کے مشہور رسالہ 'آواز' میں قیام صاحب کے افسانے چھپتے رہے اور مشہور ہوتے رہے۔

قیام صاحب کے بچپن کے ۲ دوستوں نے ان ہی دنوں کے متعلق مجھے ایک نہایت دلچسپ بات بتائی...... عظمت علی صدیقی مرحوم اور نثار احمد فاروقی (فاروقی چشمہ والے رام کا چوراہا بجنور اللہ انہیں صحت دے) کے مطابق، قبلہ قیام صاحب کے اکثر افسانے ان کے دوستوں کے نام سے بھی ان بڑے رسالوں میں چھپا کرتے تھے اور مداحوں کے سیکڑوں خطوط ان لوگوں کو موصول ہوا کرتے تھے۔ 1961 میں قیام صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے M.Com پاس کیا اور بجنور واپس آگئے اور اپنے اردو اور فارسی کے استاد منشی ولایت حسین صاحب کے اسرار پر آپ نے انہی دنوں ادیب ماہر اور ادیب کامل کے امتحانات بھی درجہ اوّل میں پاس کئے اور 1961 میں پڑھائی سے فارغ ہوتے ہی قیام صاحب کو اتر پردیش حکومت میں آڈیٹر جیسے اعلیٰ عہدہ پر ملازمت ملی اور پہلی پوسٹنگ ضلع الموڑا میں ہوئی۔

1962 میں قبلہ قیام صاحب کی شادی بجنور کے مشہور حکیم اعظم علی صاحب کی بیٹی اور مشہور سیاستداں (اس وقت پنجاب کے گورنر) حافظ محمد ابراہیم صاحب کی بھانجی، قاضی شہر، قاضی

احسن صاحب کی بھتیجی کے ساتھ بہت دھوم دھام کیساتھ ہوئی۔

لیکن فطرت کی تمام تر خوبصورتیوں اور پہاڑی علاقہ ہونے کے باوجود قبلہ قیام صاحب کے اندر موجود اک کھلاڑی اور اک شاعر کو ان کی دلچسپیوں کا سامان الموڑا میں نہیں ملا لہٰذا جلدی ہی قیام صاحب نے اپنا تبادلہ ضلع سہارنپور میں کروالیا۔ کھیل اور شاعری کی طرح ان کی ذہانت اور ایمانداری کے چرچے اتر پردیش حکومت میں کچھ اس طرح ہوئے کہ سہارنپور سے لکھنؤ تک دھوم مچ گئی اور نتیجہ یہ نکلا کہ قبلہ قیام صاحب نے اپنے 34 برس لمبے Carier میں جب چاہا، جہاں چاہا انہیں پوسٹنگ ملی اور انہوں نے یہ 34 سال اپنے گھر یعنی ضلع بجنور کے آس پاس سہارنپور، مظفرنگر، بلند شہر اور مرادآباد میں کام کرتے ہوئے گزار دئے اور 1995 میں کھیل اور شاعری کی طرح ایک کامیاب اور ایماندار کیرئیر گذار کر رٹائرمنٹ لیا اور بجنور واپس آگئے۔ دولت بھلے ہی بہت سی نہ کمائی ہو مگر ایمانداری اتنی کمائی کہ آج ان کے رٹائرمنٹ کے 21 سال بعد اور انتقال کے 8 سال بعد بھی ان کے محکمہ اور ان کے شہر یعنی بجنور میں ان کی ایمانداری کی مثال دی جاتی ہے......

میں کوئی وقت نہیں ہوں کہ بدل جاؤں گا
میرا کردار سدا ایک رہا ہے یارو

قیام بجنوری

کردار نہ سہی مگر گذرتے وقت کے ساتھ ساتھ قیام صاحب کی شاعری اور افکار ضرور بدلتے بھی رہے اور ترقی پذیر بھی ہوتے رہے۔ ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سناتا ہوں..... واقعہ شاید 1980 یا 1981 کا ہے تب میں عمر کے دسویں یا گیارہویں پڑاؤ پر تھا۔ ان دنوں بجنور میں تقریباً ہر دوسرے یا تیسرے مہینے، طرحی نشست اور مشاعرے ہوا کرتے تھے اور میں اکثر قیام صاحب کی انگلی تھامے، اپنی عمر اور اپنی عقل سے بڑی محفلوں میں جایا کرتا تھا۔ کچھ اشعار سمجھ میں آتے تھے اور کچھ نہیں بھی آتے تھے مگر اپنے والد قیام صاحب کو ملنے والی ڈھیروں داد اور 'واہ واہ' مجھے نہ جانے کیوں اتنی خوشی دیتی تھی جتنی آج اپنے اشعار پر ملنے والی داد سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔ بہر حال

میں آپ کو طرحی مشاعرے کا واقعہ سنا رہا تھا...... محلہ مردگان، بجنور میں 'قومی ایکتا' کے سلسلہ میں ایک طرحی مشاعرہ کا انعقاد کچھ لوگوں نے کیا اور ایک مصرعہ طرح رکھا گیا، شاعر کا نام مجھے نہ تب معلوم تھا اور نہ آج معلوم البتہ مصرعہ قیام صاحب کی گرہ کے ساتھ آج تک یاد ہے۔

خیر مقدم کو دیر و حرم آگئے

میرے نزدیک یہ قومی یکجہتی پر ایک عام سا مصرعہ ہے مگر اس وقت مجھے اس مصرعہ نے اس لئے چونکایا کیوں کہ یہ مصرعہ قیام صاحب کے فلسفہ' حقانیت کے ایک دم خلاف تھا۔ قبلہ قیام صاحب، علامہ اقبالؔ کے مندرجہ ذیل فلسفہ کے قائل تھے......

اس دور میں، مئے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کے تراشیدہء تہذیبِ نوی ہے
غارتگ گرِ کاشانہء دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارہء دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کا ملا دے

قیام صاحب کو جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹانا ممکن تھا مگر قیام صاحب کے افکار کے اظہار میں کسی مصلحت یا کسی خوف سے تبدیلی ناممکن تھی۔ مگر مصرعہ طرح کی مجبوری یہ تھی کہ کسی بھی زاویہ سے لگائی گئی گرہ، مفہوم کو قومی یکجہتی یا

Nationalism سے دور لے جانے میں قاصر تھی۔ ایسے وقت میں میرا اور مجھ جیسے قبلہ قیام صاحب کے تمام مداحوں کا شوقِ سماعت یہ جاننے کے لئے بیقرار تھا کہ مصرعہ طرح کے مفہوم کی مجبوری قبلہ قیام صاحب سے کیا کراتی ہے؟...... آخر کار مشاعرہ کی شام شروع ہوئی۔ بڑے بڑے شعراء اکرام نے قومی یکجہتی کی باتیں کیں، اپنے طے شدہ وقت پر قیام صاحب اسٹیج پر تشریف لائے اور جیسے ہی آپ نے اپنی گرہ پڑھی، تو بلا مبالغہ، قیام صاحب کی گرہ پورے مجمع پر کسی بم کی طرح پھٹی۔ سامعین کھڑے ہو کر بہت دیر تک واہ واہ چلاتے رہے۔ شعر بار بار سنا گیا اور میری آنکھوں نے یہ منظر ہمیشہ کے لئے اپنے ذہن میں قید کر لیا۔ آیئے، آپ کے گوشِ گذار کراتا ہوں......

خیر مقدم کو دیر و حرم آگئے

کیا کہا ...... کفر و ایمان باہم آگئے

اور اس دن ایک بیٹے نے اپنے روشن باپ سے سیکھا کہ اگر آپ حق پر ہیں تو کوئی مجبوری یا کوئی مصلحت آپ کی فکر کے پاؤں میں بیڑی نہیں پہنا سکتی۔

قبلہ قیام صاحب کی شاعری، جس کی ابتداء، منشی ولایت حسین صاحب کی دیکھ ریکھ میں ہوئی تھی، اسے باقاعدہ استاد مظفر نگر میں ملا، قیام صاحب کے مظفر نگر قیام کے دوران آپ کی ملاقات مظفر نگر اور آس پاس کے حلقوں میں علم عروض اور ادب کے مشہور استاد انیس مظفر نگری صاحب سے ہوئی اور استاد انیس صاحب نے، میرے استاد قبلہ قیام صاحب کو اپنی شاگردی میں قبول فرمالیا اور اس طرح مجھ جیسے بے ادب کو بھی مرزا داغ دہلوی جیسے عظیم شاعر کا شجرہ ادب نصیب ہوا۔

قبلہ قیام صاحب کے استاد، جناب انیس مظفر نگری صاحب، ان کے استاد، جناب علم مظفر نگری صاحب، ان کے استاد، علامہ سیما اکبر آبادی صاحب، ان کے استاد، جناب داغ دہلوی صاحب اور ان کے استاد، جناب ابراہیم ذوق صاحب۔ اس کے علاوہ قبلہ قیام صاحب کو علم و فضل سے بھرپور اپنے ہم عصروں کا ساتھ بھی خوب ملا۔ بزرگ دوستوں میں مولوی احمد رضا صاحب، حکیم اختر زیدی صاحب، قمر مراد آبادی صاحب، یامین خاں شوق صاحب، بینا بجنوری صاحب اور ساتھیوں میں قبلہ افسر جمشید صاحب رحمت اللہ علیہ، نشتر خانقاہی صاحب، ظہیر عالم راہی

صاحب، ارشد کمال صاحب، مظاہر حسین صاحب، شکیل بجنوری صاحب، سید اسرار احمد، ماسٹر یعقوب بدایونی صاحب اور ظفر ایوّبی صاحب کا نام قابلِ ذکر ہے۔

آیئے اب قبلہ قیام صاحب کی شاعری پر گفتگو کرتے ہیں حالانکہ قیام صاحب کے ابتدائی کلام میں بہت تھوڑے سے وقفے کے لئے جمالیاتِ مجازی اور غزل کا روایتی رنگ نظر آتا ہے، مثلاً......

زینتِ جانِ چمن عارضِ گلگوں نا فروش
اور شعلوں کی طرح ان پہ مچلتے آنسو
اب کے سیلاب سرابوں میں بھی آیا ہوگا
ورنہ یوں آنکھ میں ہرگز نہیں آتے آنسو

قیام بجنوری

اور قیام صاحب کی ابتدائی شاعری میں غزل کے روایتی رنگ کا ہونا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیوں کہ قیام صاحب کے پورے شجرۂ ادب (انیس مظفرنگری سے داغ دہلوی اور ابراہیم ذوق تک) نے روایتی غزل کی بھرپور شاعری کی ہے......

اب کیا بتاؤں میں ترے ملنے سے کیا ملا
عرفانِ غم ہوا مجھے، دل کا پتہ ملا

علامہ سیماب اکبرآبادی

تری صورت سے نہیں ملتی کسی کی صورت
ہم جہاں میں تری تصویر لئے پھرتے ہیں

داغ دہلوی

کیا جانیے اسے وہم ہے کیا میری طرف سے
جو خواب میں بھی رات کو تنہا نہیں آتا

ابراہیم ذوق

لیکن کچھ ابتدائی غزلوں کو چھوڑ کر اگر قیام صاحب کی شاعری کا ایماندارانہ تجزیہ کیا جائے تو ایسا نظر آتا ہے جیسے وقت نے قیام صاحب کی ادبی ارتقا کے لئے مرزا داغ کے ایک شاگرد علامہ سیماب اکبرآبادی کے سلسلہ کو ضرور چنا، مگر خود قیام صاحب، مرزا داغ کے دوسرے شاگرد علامہ اقبالؔ کے فکر و فلسفہ اور انداز و اسلوب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔

اسمِ اعظم

اسم تیرا، اسمِ اعظم ، ذات بے ہم تا صفات
بے نیاز و لا مکان و بے امان و باثبات
وہ اساسِ کائناتِ دو جہاں ہے تیری ذات
اک اشارہ پر ترے رک جائے نبضِ کائنات

قیام بجنوری

قیام صاحب کی شاعری، فکر فلسفہ کی شاعری ہے۔ قیام صاحب کے اندر بیٹھا شاعر اپنے آس پاس ہونے والی ہر واردات کو دینِ حق کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اپنے زمانہ اور آنے والی نسلوں سے امید کرتا ہے کہ غیر حق کتنا بھی حسین ہو مگر ایک دھوکا ہے اور اس دھوکے سے بچ کر منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے۔

سربکف

سربکف رہتے تھے جو اب ہو گئے کیوں سر بہ جیب
وہ فراخِ سرمدی یہ جوگیانہ ہے نشیب
اس چمن میں ہے کہاں وہ تیری شاخِ آشیاں
اک حسیں دھوکا ہے لیکن یہ فضاءِ دیدہ زیب
راہ کا پتھر تو پتھر ہے مگر یہ منزلیں
ہر قدم پر دے رہی ہیں کیوں مسافر کو فریب

وقت اور صفحات کم ہیں اور قیام صاحب کی شخصیت اور فن پر ادراکانہ تبصرہ لامتناہی ہے

لہٰذا اس سے پہلے کہ میں اپنی بات ختم کروں، آیئے میں آپ کو قبلہ قیام صاحب کی شخصیت کے ایک اور پہلو سے متعارف کراتا چلوں......

ایک کھلاڑی، ایک شاعر، ایک ادیب اور ایک آڈیٹر ہونے کے علاوہ قیام صاحب ایک ایسے صوفی باشریعت بھی تھے جو اپنی ہر سانس کو رضاءِ الٰہی کے مطابق دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی سحر گاہی اور ان کے ذکر و اذکار نے خدا جانے انہیں کس کس راز کا محرم بنا دیا تھا......

نعرہ تھا کوئی سرحدِ ادراک کے پرے
تابِ سخن نہیں ہے کسی میں جو سن سکے
اک راز بن گیا ہوں دو عالم میں بالیقیں
صبحِ ازل کی بات بتا دی گئی مجھے

الحمد للہ...... قبلہ قیام صاحب نے اک بھرپور زندگی جی، اپنے پیچھے اپنی نیک نامی، اپنی ایمانداری، اپنی انوکھی اور بھرپور شاعری کے علاوہ نیک، لائق (میرے علاوہ) اور ایصالِ ثواب کرنے والے چار بیٹے اور چار بیٹیاں چھوڑے جو ہر روز اپنے ماں و باپ کی مغفرت کے لئے دعا کرتے ہیں اور آپ سے بھی دعا کی درخواست کرتے ہیں...... اللہ تعالٰی قیام صاحب اور ہماری والدہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین......

دانش جاوید، نائب صدر
فلم رائٹرس ایسوسیئیشن، ممبئی (ہندوستان)
09702891685

ماہرِ تعلیم اور باصلاحیت ادیب اور شاعرہ
ڈاکٹر شبانہ نذیر

ڈاکٹر شیخ نگینوی

دہلی کے منظر نامہ میں اگر ہم مسلم لڑکیوں کی تعلیم کی بات کریں تو سرِفہرست جس شخصیت کا نام آتا ہے وہ ہے ڈاکٹر شبانہ نذیر۔ یہ ڈاکٹر شبانہ نذیر اور کوئی نہیں وہ ہی ہیں جو 1977 ،تک شبانہ سروش تھیں یعنی ضلع بجنور کے لائق فرزند محترم رفعت سروش کی بیٹی۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر وہ ماہر تعلیم ہیں جنہوں نے اپنی قوم کی تعلیم کو اپنا مقصد بنالیا ہے اور لڑکیوں کی تعلیم میں خصو صاً دلچسپی رکھتی ہیں۔ دلّی کے محکمہ تعلیم کی ایک جانی پہچانی آفیسر جو کہ اپنی صلاحیت اور خلوص نیت کے سبب اندرا ایوارڈ اور اسٹیٹ ایوارڈ سے نوازی جاچکی ہیں۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر کی ولادت میرٹھ میں اپنے نانا حکیم سید مجتبیٰ علی کے یہاں .17 جنوری 1954 کو ہوئی۔ جب رفعت سروش صا حب ممبئی ریڈیو سے منسلک تھے تعلیم کے ابتدائی تین سال وہیں گزارے اور پھر رفعت صاحب کے دہلی کے تبادلے کے ساتھ دہلی آگئیں اور بقیہ تعلیم وہیں مکمل کی۔ دہلی یونیورسٹی کے مشہور لیڈی شری رام کالج سے اعلیٰ تعلیم کی شروعات کی۔ ایم اے (اردو) و ایم اے (انگلش)، بی ایڈ۔ ایم ایڈ اور پھر پی ایچ ڈی اس کے علاوہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ احمد آباد سے principals

effective class سے leadership programme. اور کینیڈا کی کوئین یونیورسٹی سے teaching میں ڈپلوما کیا۔ اپنی ملازمت اور ازدواجی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے اتنی تعلیم حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔ جب 1977 میں ان کی شادی ناصر نذیر سے ہوئی جو دہلی کے ایک معزز سید خاندان کے فرزند ہیں وہ صرف ایم اے (اردو) اور بی ایڈ تھیں۔ باقی تعلیم انہوں نے اپنی ازدواجی زندگی ہی میں پوری کی ساتھ ہی شبانہ سروش سے شبانہ نذیر ہوگئیں۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر کو اقبال میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی نگینہ کی جانب سے صدیقہ بیگم سیوہاروی نیشنل ایوارڈ، اردو اکادمی دہلی اور انجمن ترقی ہند کی جانب سے بیسٹ پرنسپل ایوارڈ اور یوپی اور دہلی اردو اکادمی نے ان کی کتاب اردو اوپیرا پر ایوارڈ دیا گیا تھا۔ انھوں نے ''نظرِ رفعت سروش'' کتاب بھی مرتب کی ہے۔ آپ دو مرتبہ دہلی اردو اکادمی منتظمہ کمیٹی کی رکن بھی رہ چکی ہیں۔

ڈاکٹر شبانہ نذیر نے اپنے تحقیقی مقالہ کے لئے ''اردو اوپیرا'' کو چنا جو خود اپنے میں اہمیت کا حامل ہے۔ ''اردو اوپیرا'' کتاب کے اجرا کے موقع پر نامور ناقدین پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر شارب ردولوی نے اسے بہترین تحقیقی کتاب کہہ کر نوازا۔ اسلم چشتی نے اپنے مفصل مضمون میں کہا تھا۔

''اردو اوپیرا'' ڈاکٹر شبانہ نذیر کا تحقیقی مقالہ ہے جو شاید پہلی بار اس موضوع پر مفصل طور پر لکھا گیا ہے۔ اس میں 1947 کے جھو کے منتخب اوپیرا کا تذکرہ ملتا ہے۔ ڈاکٹر شبانہ کا یہ کام قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر نے اوپیرا کے بارے میں جو معلومات قاری کو دی ہیں وہ مزید تحقیق کے در کھولتی ہیں''۔

ڈاکٹر شبانہ نذیر کے شعری مجموعہ ''گزرگاہِ خیال'' کی بھی بھرپور پزیرائی کی گئی۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر کو شاعری ورثے میں ملی ہے لیکن انکے رنگ و سخن کو دیکھ کر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ انکی شاعری صرف وراثت کا کھیل نہیں ہے اس میں ان کی ہی سرشت اور تخیل کا بڑا دخل ہے۔ ان کا مقصد شاعری سے شہرت، ناموری یا معاش کمانا نہیں ہے۔ مصنوعی شہرت اور کاروبار سے کوئی سروکار نہیں ہے اس لیے مشاعروں میں شرکت کرتی ہیں تو کسی تام جھام کے ساتھ نہیں بلکہ سنجیدگی اور پروقار

انداز میں۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر اسلم پرویز صاحب نے کہا تھا۔''شبانہ کے ہاں ایک ادبی ذوق اسکول اور کالج کے زمانے سے ہی تھا۔ جو ان کے ذات میں انکی شخصیت کے نشونما کے ساتھ پنپتا اور پھلتا پھولتا رہا جس کی بدولت آج وہ سنجیدہ اور صاف ستھری شاعری کرنے کے قابل ہیں۔''

ڈاکٹر شبانہ نذیر کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں!

اے شبانہ خار زار زندگی ہے اور ہم
چل پڑے جب، پاؤں کے چھالوں سے گھبراتے نہیں

جو ملے تجھ سے ملے، ہے یہ شبانہ کی دعا
اے خدا غیر کا احساں مجھے منظور نہیں

دنیا ہے یاں تو ملنا ہے ہر آدمی کے ساتھ
لیکن مزاج ملتا نہیں ہر کسی کے ساتھ

آب وآتش، خاروگل، روشن سحر تیرہ شبی
ہر قدم ہے ایک تصادم، زندگی جس کو کہیں

یہ بہاریں ہیں اگر ایسی بہاروں کو سلام
پھول کھلنے بھی نہ پاتے تھے کہ گلشن جل گیا

اسکے علاوہ شبانہ ایک حساس دل کی مالک ہیں اور سوشل ورک ان کو بہت عزیز ہے۔ اپنی انفرادی حیثیت سے وہ جتنا سماج کو دے سکتی ہیں اس کے لئے وہ ہر لمحہ تیار رہتی ہیں۔ قوم کی نئی نسل کی کاؤنسلنگ اور گائیڈیشن اور گائڈینس میں بھی پیش پیش رہتی ہیں۔

رفعت سروش ایک جائزہ

ڈاکٹر شبانہ نذیر

رفعت سروش منفرد ادیب، شاعر، ڈراما نگار، انشا پرداز، نثر نگار اور براڈ کاسٹر 2 جنوری 1926 کو اتر پردیش کے مردم خیز علاقہ نگینہ، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام تھا سید شوکت علی ولد سید محمد علی اور والدہ کنیزہ فاطمہ۔ ان کے دادا سید علی کا شمار نگینہ کے کھرے سیدوں میں ہوتا تھا۔ رفعت سروش کی ابتدائی تعلیم نگینہ کے مکتب میں ہوئی۔ تیسری جماعت تک نگینہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ موانہ، ضلع میرٹھ چلے گئے۔ 1935 میں میٹرک اور 1949 میں بمبئی سے ہندی وِدّاپیٹھ کا بھاشا رتن امتحان پاس کیا جو بی اے کے مساوی ہے۔

رفعت سروش بہت ذہین تھے اور اسی لیے انھیں بچپن سے ہی وظیفے ملنے لگے تھے، جن کی وجہ سے بغیر کسی دشواری کے تعلیم جاری رہی۔ ان کی ذہنی تربیت میں ان کے بڑے بھائی سید ممتاز علی کا بڑا تعاون رہا۔ ان کی سرپرستی میں رفعت سروش نے خوش خطی سیکھی، نثر و نظم کو پڑھنا اور سمجھنا اور بامحاورہ اُردو لکھنا سیکھا۔ بچپن میں مسجد کے صحن میں وقت گزارنا ان کو بے حد پسند تھا۔ وہ اس پاکیزہ ماحول سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ گل بوٹے بنانا، مسجد کے میناروں کے لیے نئے نئے نقشے بنانا رفعت سروش کا محبوب مشغلہ تھا۔

سید ممتاز علی کے علاوہ ان کے دوسرے بڑے بھائی اشتیاق علی کی صحبت بھی ان پر اثر

انداز ہوئی۔ سید اشتیاق علی ''شوق'' اور ان کے دوست اختر عباس نخشب جار چوی کو شعر گوئی کا شوق تھا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو شعر سناتے۔ داد و تحسین کا ماحول بنا اور انھیں کی دیکھا دیکھی رفعت سروش نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا۔ اپنی اسکولی تعلیم کے بارے میں رفعت سروش نے لکھا ہے:

''ایم بی اسکول صرف چھٹی کلاس تک منظور شدہ تھا اور چونکہ مجھے یو پی بورڈ سے وظیفہ ملتا تھا اس لیے منظور شدہ اسکول میں ہی پڑھنا لازمی تھا۔ چنانچہ میں نے جی ایچ پی ہاؤس میں داخلہ لیا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر گووند سنگھ میرے گزشتہ تعلیمی ریکارڈ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔''

اسی اسکول کی تعلیم کے دو باتیں پیش آئیں۔ ایک بار آپ کے ٹیچر جوہری صاحب نے ایک سوال کلاس میں کئی لڑکوں سے پوچھا۔ جواب نہیں ملا تو انھوں نے رفعت سروش کی طرف رُخ کر کے کہا: ''تم ہی بتاؤ Poet of the class۔'' یہ جملہ رفعت صاحب کو نئی زندگی بخش گیا۔ دوسرا واقعہ کو خود ان کی زبانی سنیے!

''ایک دفعہ ایک ڈپٹی کلکٹر ہمارے اسکول میں معائنہ کرنے آئے۔ انھوں نے تقریر کی کہ ہر طالب علم کے ذہن میں ایک مقصد ہونا چاہیے کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے۔ پھر طلبہ سے سوال کیا۔ اکثر لڑکے خاموش رہے اور بولتے بھی کیا، ہمارا طریقۂ تعلیم تھا ہی کیا۔ بقول نظیر اکبر آبادی، کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا۔ جب یہ سوال مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے بے ارادہ بے ساختہ کہا کہ ''میں بڑا شاعر بننا چاہتا ہوں۔''

خدا کی کرنی دیکھیے کہ ان کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور وہ بڑے شاعر بن گئے۔

نگینہ کے شوکت علی اور موانہ سے واپس آئے شوکت علی میں بڑا فرق تھا۔ وہ دبا دبا، سہما سہما محروم سا لڑکا اب کینچلی بدل چکا تھا۔

سر پر باریک مشین نہیں پھرتی تھی بل کہ گھونگھرالے انگریزی بال رکھ لیے تھے۔ صاف اور نفیس لباس پہننے لگے تھے۔ ٹوپی پہننا گوارا نہیں تھا مگر ابا کی نافرمانی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لیے ٹوپی کتابوں کے بیچ میں رکھ لی جاتی تھی۔ گھر قریب آتے ہی ٹوپی سر پر رکھ لیتے تھے۔ کبھی کیرم کی بازی لگتی تو کبھی شعر و شاعری کی محفل بجتی۔ میٹرک کے دوران سیّد شوکت علی نے جدید طرز پر

نظمیں لکھنی شروع کر دیں اور یہ نظمیں ''ہمایوں'' اور ''شاہکار'' جیسے رسائل میں چھپنے لگیں، مگر سیّد شوکت علی کو اپنے نام سے قدامت کی بو محسوس ہوئی اور یوسف ظفر اور قیوم نظر کی طرز پر دو لفظی نام اختیار کر لیا۔ ''رفعت سروش'' اس نام سے جو پہلی نظم چھپی وہ تھی ''گلاب کا پھول''۔

یوسف ظفر نے جب نظم چھاپی تو سمجھے کسی عمر رسیدہ شاعر کا کلام ہے۔ کیوں کہ کلام پختہ تھا۔ گلاب انسان کی زندگی کا سمبل اور نظم زندگی سے موت تک کا سفر بیان کرتی ہوئی:

کِھلا ہوا ہے جھاڑیوں میں پھول اک گلاب کا
اٹے ہوئے غبار میں ہیں جس کے عارض و جبیں
کچوکے دے رہے ہیں خار خنجروں سے پے بہ پے
لہو لہان ہے تمام اس کا جسمِ نازنیں

اور نظم کا آخری بند ہے:

ہر ایک شے کو دیکھتا ہے یوں نگاہِ یاس سے
کہ جیسے دہر میں کوئی نہیں ہے اس کا ہمنوا
سہے ذرا سی جان اُف یہ ظلم و جور تابہ کے
ہوا میں جھولتا ہوا وہ گر گیا، بکھر گیا
کِھلا ہوا ہے جھاڑیوں میں پھول اک گلاب کا

درحقیقت رفعت سروش کا مزاج بچپن سے نہ تو شاعرانہ تھا اور نہ ہی عاشقانہ۔ ان کا مزاج تو مصورانہ تھا۔ انھیں ڈرائنگ کا بچپن سے شوق تھا۔ ابتدا انگیوں اور چادروں کے نقوش سے ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ شوق اتنا بڑھا کہ بغیر کوئی اسکیل بنائے صرف تصویر سامنے رکھ کر دو گنی، تین گنی تصویر بنا لیتے تھے۔ درجہ پانچ میں ہی تھے جب شہنشاہ شاہجہاں کی تصویر بنائی جس کی خوب تعریف ہوئی اور انعام بھی ملا، مگر جب بڑے بھائی سیّد امتیاز علی کو معلوم ہوا تو انھوں نے سختی سے منع کر دیا کہ جاندار چیز کی تصویر بنانا گناہ ہے اور بس یہ خوفِ خدا ایسا دل پر چھایا کہ پھر کبھی مصوری نہیں کی۔ کی تو صرف بیل بوٹو کی حد تک۔ درحقیقت یہ خوفِ خدا ہی انسان کو انسان بنائے رکھتا ہے۔

یادِ خدا میں جی نہ لگا ہے یہ اور بات
خوفِ خدا تو دل میں رہا ہے تمام عمر

یہ خوفِ خدا بچپن سے ایسا دل میں سمایا کہ ہمیشہ نیک اور سچی زندگی گزاری اور الفاظ سے تصویر کشی کرتے رہے اور پھر شروع ہوا تلاشِ معاش کا سلسلہ، چاند پور میں ڈرائنگ کے ٹیچر بنے۔ جلد ہی بڑے بھائی کے کہنے پر یہ ملازمت چھوڑ دی اور انھیں کے کہنے پر دلی چلے آئے۔ مختلف ملازمتیں کیں اور دلی کے قیام کے دوران ادبی ماحول ملا۔ ارشد مختار، حسن عسکری عرف ابن سعید، اختر الایمان، جمیل الدین عالی، رضی الدین، اطہر حسن اور مجاز وغیرہ اور یہ وہ زمانہ تھا جب خوب چھپ رہے تھے۔ ملازمت کی طرف سے بھی بے فکری تھی۔ ان کا کلام اکثر رسائل میں موجود ہوتا تھا۔

دسمبر 1945 میں آل انڈیا ریڈیو بمبئی میں ملازمت کی۔ انتالیس سال ریڈیو سے وابستہ رہے تیرہ سال بمبئی میں اور چھبیس سال دہلی میں۔ 31 جنوری 1984 کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ آل انڈیا ریڈیو میں رفعت صاحب نے بڑی فعال زندگی گزاری۔ مختلف پروگراموں کے انچارج رہے۔ ''گجرا''، گیتوں بھری کہانی، اور آخر میں ''اُردو مجلس'' یہ آخری پروگرام ان کی پہچان بن گیا۔ ضیا فتح آبادی نے اپنے مضمون ''کردار کا غازی'' رفعت سروش میں لکھا ہے:

''اردو مجلس سے ایک آواز ہر روز دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہو کر ہندوستان کے طول وعرض میں گونج جاتی ہے۔ اس آواز نے گزشتہ تیس برس سے اُردو کے نام کو پھیلایا اور زندہ رکھا۔ یہ جانی پہچانی آواز اُردو کے ممتاز اور مقبول شاعر رفعت سروش کی ہے۔ دراصل رفعت سروش کا ہی دوسرا نام ہے ''اُردو مجلس'' رفعت سروش اور اُردو مجلس، اُردو مجلس اور رفعت سروش دونوں لازم وملزوم بن گئے ہیں اور ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اُردو مجلس کو بنانے سنوارنے میں رفعت سروش کی انفرادیت کا ہاتھ ہے یا رفعت سروش کی ادبی سرگرمیوں کا سرچشمہ اُردو مجلس ہے۔ بہر حال رفعت سروش اور اُردو مجلس ہاتھوں میں ہاتھ

ڈالے اس منزل ارتقا کی طرف رواں دواں ہیں جو بقائے اردو کی ضامن ہے۔"

آل انڈیا ریڈیو سے رفعت سروش کی لمبی وابستگی رہی اور ذوالفقار بخاری سے شروع ہو کر متعدد لوگوں کے ساتھ کام کیا، اور سب نے ان کا لوہا مانا۔ جناب منظور الامین نے اپنے مضمون رفعت سروش میرا ہمنوا میں لکھا ہے۔

''رفعت برسہا برس ریڈیو سے متعلق رہے اور ذہنی طور پر آج بھی ہیں۔ براڈ کاسٹنگ ان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ ساتھ ہی ایک چیز اور بھی ہے۔ وہ ہے شعر وادب رفعت سروش ایک دیانت دار انسان ہیں۔ وہ بے ایمانی، جھوٹ اور ناانصافی کو برداشت نہیں کر سکتے...... ایک ہی جگہ کام کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ رفعت اپنا کام پوری لگن اور تندہی سے کرتے ہیں۔ اپنے تخلیقی کام میں وہ خلل برداشت نہیں کر سکتے اور ایسا ہو تو بھڑ جاتے ہیں۔ ویسے جہاں تک بھڑنے کا تعلق ہے بقول ان کے وہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ بلا وجہ بھڑے تو بھڑتے ہی چلے گئے۔ وہ معاملے کو رفع دفع بھی کر دیتے ہیں۔ رفعت سروش میں خود اعتمادی ہے۔ یہ جذبہ خود اعتمادی کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس کی مدد سے انسان بامِ رفعت تک جا پہنچتا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے ''ریڈیائی آدمی'' میں لکھا ہے: ''رفعت سروش اور ریڈیو کا رشتہ اتنا استوار ہو چکا ہے کہ ریڈیو کو دیکھیں تو رفعت سروش کا اور رفعت سروش کو دیکھیں تو ریڈیو کا خیال آجاتا ہے۔ گویا رفعت سروش ریڈیو کے اندر ہیں اور ریڈیو خود رفعت سروش کے اندر ہے۔'' من تو شدم تو منی شدی''

یہ تو تھیں رفعت سروش کی منصبی ذمہ داریوں کی باتیں۔ اب رہا میدانِ شعر وادب ریڈیو اسٹیشن میں قدم جمانے کے بعد زندگی ڈھرے پر آنے لگی تھی۔ پہلی فرصت میں انھوں نے اپنا پہلا شعری مجموعہ ''وادیِ گل'' چھپوایا جو 1963 میں منظر عام پر آیا۔ اور پھر اس کے بعد 1966 میں ''ذکر اُس پری وش کا'' اور پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ کیا نظم، کیا غزل، کیا ڈراما، کیا بیلے، کیا اوپرا۔ کیا کیا نہیں لکھا؟ کیا کیا نہیں چھپوایا؟ ہمارے رفعت سروش صاحب، میں نصرت ظہیر صاحب نے

لکھا تھا:

''اردو ادب کا کوئی علاقہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں رفعت سروش نے کچھ نہ کچھ زمین نہ قبضہ رکھی ہو۔ شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، اوپرا، تحقیق، تنقید۔ آپ ہی بتایئے اس کے بعد بھی ادب میں کوئی صنفِ سخن باقی رہ جاتی ہے۔ ہاں ایک صنف سخن ہے ادبی سیاست، جس میں رفعت صاحب نے زور آزمائی نہیں کی''۔

اس ادبی سیاست سے بے نیاز رفعت سروش اپنے قلم کا جوہر دیکھاتے رہے۔ مصوری کا وہ شوق جو بچپن سے دل میں سمایا ہوا تھا اب الفاظ کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ مخمور سعیدی نے انھیں ''لفظوں کا صورت گر'' قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ رفعت سروش کی شاعری کا خاص وصف ہے لفظوں سے تصویریں بنانا۔ اس ہنر کا استعمال جس خوبی سے رفعت صاحب کے یہاں نظر آتا ہے وہ خال خال ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ دراصل رفعت سروش لفظوں سے صرف منظر پیش نہیں کرتے بل کہ منظر کے ساتھ ایک پسِ منظر بھی اُبھرتا ہے۔ ایک ایسا پسِ منظر جو ہمیں ان حالات میں لے جاتا ہے جن سے دوچار ہونے کے بعد شاعر کے لفظوں میں وہ تاثیر پیدا ہوگئی کہ وہ لفظ نہ رہ کر جیتی جاگتی تصویریں بن گئے۔ ملاحظہ ہو یہ نظم:

ایک چھپر کا گھر، نیم کے سائے میں
اونگھتا ہے دُھندلکے میں لپٹا ہوا
شام کا وقت ہے اور چولھا ہے سرد
صحن میں ایک بچہ برہنہ بدن
باسی روٹی کا ٹکڑا لیے ہاتھ میں
سر کھجا تا ہے، جانے ہے کس سوچ میں
اور اُسارے میں آٹے کی چکی کے پاس
ایک عورت پریشان خاطر، اُداس
اپنے رُخ پر لیے زندگی کی تھکن

سوچتی ہے کہ دن بھر کی محنت کے بعد
آج بھی روکھی روٹی ملے گی ہمیں
تم حقارت سے کیوں دیکھتے ہو اے
دوست یہ میرے بچپن کی تصویر ہے

اس نظم کی اثر انگیزی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔

رفعت سروش نے زندگی کے ہر رنگ کا بھر پور مزہ لیا۔محرومیاں ملیں تو خوشیاں بھی جھولی بھر بھر کر ملیں۔خوش گوار ازدواجی زندگی پائی،سلیقہ شعار،ہنر مند اور مہمان نواز شریکِ حیات صبیحہ سروش ملیں۔ان دونوں کی رفاقت مثالی تھی۔ادبی حلقوں میں دونوں ایک ساتھ نظر آتے تھے۔بچوں کی پرورش اور دیگر گھریلو ذمہ داریاں دونوں مل کر بخوبی نبھاتے رہے۔

رقصاں ہیں نوید کی آنکھوں میں مستقبل کے روشن خاکے
جاوید،شبانہ،شاہینہ،سب مل کر ہنستے ہوں جیسے

اور پھر وہ دن آیا کہ یکم دسمبر 1987 کو صبیحہ سروش کا انتقال ہو گیا۔رفعت صاحب تنہا ہو گئے جب یہ تنہائی کا کرب ناقابلِ برداشت ہوتا چلا گیا تو پھر رفعت صاحب نے قلم اٹھایا اور الفاظ سے منظر کشی شروع کر دی اور وہ نظمیں،غزلیں اور مرثیے رقم کیے کہ ہر آنکھ نم ہو گئی۔

نہ کسی کی جدائی سہ رہا تھا تڑپ اٹھا

بقول ڈاکٹر شارب ردولوی: رفعت سروش اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے کسی ذاتی سانحے پر اتنی بڑی تعداد میں نظمیں اور غزلیں لکھی ہوں۔اگر کبھی شخصی مرثیے کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو ان کا مقام منفرد ہوگا۔رفعت سروش کی شاعری کی بڑی خصوصیت پیکر تراشی ہے۔جو نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے۔نظم ملاحظہ فرمائیں،صبیحہ:

صباحتوں کا لطیف پیکر
نزول صبح بہار جیسے
نظر نظر تابناک منظر

گھنیری زلفوں کے ریشمی سائے
پُر فسوں خوابناک منظر
اداؤں میں شوخیوں کی بجلی
وہ زندگی کی سی بے قراری
شگفتہ لہجے کی سحر کاری
سماعتوں پر لطیف نغمے کا کیف طاری
وہ ایک عورت تھی شوخ پیکر

غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

شہر شور و شر تنہا، گھر کے بام و در تنہا
تم نہیں ہو لگتا ہے عالم بشر تنہا
شہر کے گلی کوچے پوچھتے ہیں رہ رہ کر
اے سروش بکھرتے ہو کیوں اِدھر اُدھر تنہا

رفعت سروش کی تخلیقی کاوشوں میں بڑا تنوع عمر کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ اتنا تنوع بہت کم اردو شعرا کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور اہم پہلو جو ان کی شاعری میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے وہ ہے انسان دوستی اور مثبت زاویۂ نظر۔ اگر ایک جملے میں کہنا چاہیں تو بے جھجک کہہ سکتے ہیں کہ رفعت سروش انسان کی عظمت کے شاعر ہیں۔ ان کا یہ وصف اجمالی طور پر مختصر نظم اور غزلوں کے علاوہ ان کے منظوم، ڈراموں اور طویل نظموں میں نمایاں ہے۔ ان کے کئی منظوم ڈرامے انسان کی اور زمین سے اس کی محبت کے بارے میں ہے۔ ۔زمینِ آدم، تو ایک تمثیلی نظم ہے۔ ڈراما، نئی صبح، بھی اسی رنگ میں ہے چند مصرعے ملاحظہ فرمائیں:

میں آدمی ہوں میں آدمی ہوں تمام مخلوق سے ہوں افضل۔
میں آفرینش کا شہکار حسیں کرّوبیوں سے اجمل
زمیں کی جنت کی نعمتوں کو میں اپنے دامن میں بھر چکا ہوں

میری شجاعت نے ایک تلوار سے ہزاروں قلم کیے ہیں
مہیب جنگل، اوران کے سائے میں پلنے والے درندے وحشی
زمین سے سر اٹھانے والے تمام موذی
میں فاتحِ عظمتِ زمیں ہوں
میں فاتحِ عظمتِ زمیں ہوں

اسی طرح ان کے منظوم ڈرامے ''عروج آدم'' میں جس کا موضوع انسان کی خلائی پرواز ہے، انسان کی عظمت کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ یوری گگارین کے روپ میں جب پہلی بار دائرہ زمیں کو پھلانگ کر خلا میں داخل ہوتا ہے اور شاعر کی تخیل کے مطابق وہ چند تاروں سے ہم کلام ہوتا ہے تو مہ وانجم اسکی عظمت کو سلام کرتے ہیں اور اسے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس نظم کی اختتامیہ میں شاعر راکٹ اور انسان کی خلائی پرواز کو ترقی کے نئے باب کی ابتداء تصور کرتا ہے:

ابھی تو ہے ابتدا رہ ورسمِ عاشقی کی
ابھی اڑیں گیں ہزار راکٹ
زمیں سے آسماں کی جانب
سکون تخلیق اگر میسر ہو آدمی کو
اگر نہ الجھے زمیں کے کانٹوں سے اس کا دامن
اگر نہ ہو اس کے ذہن پر خوف جنگ طاری
اگر منظم ہو قوتیں علم وجستجو کی
تو کوئی دن میں وہ اپنے قدموں سے دست وحشت میں
ساز چھیڑے گا زندگی کا حسیں
خوابوں کے پھول لیجایگا ستاروں کی انجمن میں
خوشا وہ لمحہ قریب تر ہے

کہ کہکشاں اس کی رہگزر ہے
سفر جو باقی ہے مختصر ہے

انسانی عظمت کی جھلک ان کے ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں:

سمٹے تو مشت خاک ہے یہ آدمی کی ذات
بکھرے تو پھر یہ عرصہ لیل ونہار ہے
گردِ سفر ہے آج نجومِ فلک مقام
ہے کا روانِ علم وعمل کتنا تیز گام
کچھ آج رنگ میلا فضا کے آنچل کا
ضرور آدمِ خاکی ادھر سے گزرا ہے
اس وادیٔ حسیں کو بھی ہے تیرا انتظار
جس وادیٔ خلا میں ستارے کریں خرام

بقول پروفیسر قمر رئیس:

''رفعت سروش کی بیشتر نظموں میں ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کا استعمال ایسی لطیف اشاریت کے ساتھ ایسی تہ داری کے ساتھ کرتے ہیں کہ وہ ان کے باطنی اور داخلی جذبات کو ان کی ساری پیچیدگیوں کے ساتھ ان کی تہوں کو دوسروں تک پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔رفعت سروش کے یہاں لفظ معانی کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔وہ بجے سجائے انداز میں اپنی بات کہتے ہیں۔ان کے یہاں پروپیگنڈے اور فارمولوں کی شاعری نہیں ہے۔ بلکہ ان کا شعر تجرباتِ زندگی کی آنچ میں تپ کر دمکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ان کے یہاں غم بھی ہے اور مسرّت بھی مگر مایوسی اور ناکامی نہیں۔ پوری شاعری میں کہیں بھی مایوسی اور شکست کا گمان تک نہیں گزرے گا ہمیشہ پرامید، ہمیشہ روشن مستقبل کے خواہاں نظر آتے ہیں''

رفعت سروش نے جب برش چھوڑ کر قلم اُٹھایا، جب رنگوں کی لفظوں سے مصوری شروع کردی تو پھر اسی احتیاط سے کی جس احتیاط سے مصور رنگوں کو استعمال کرتا ہے۔ان کے مختلف شیڈ بناتا ہے اسی طرح شاعر نے الفاظ کا استعمال کرنا شروع کردیا۔قلم کی اہمیت کو سمجھا، لفظ کی قیمت

پہچانی اور اس کا اظہار بھی کیا اور کہا کہ لفظ انسان کی بڑی قوت ہے اور زندگی کو بہتر اور حسین سے حسین تر بنانے کے لیے اس عظیم قوت کا تخلیقی استعمال قلم کار کا اہم فرض ہے:

یہ اِک لکیر جو رقصاں ہے میرے ہاتھوں میں
جو میری نوکِ قلم پر چمکتی رہتی ہے
اس اِک لکیر سے لکھی گئی کتابِ حیات
عطا ہوئی ہے مجھے کیسی بے بہا سوغات
میں لفظ لفظ اُجالا، میں حرف حرف کرن
مری صدا میں معانی کا بولتا ہے چمن

(یہ اِک لکیر شاخِ گل)

قلم کی طاقت کو تسلیم کرنے والا شاعر ہی یہ کہہ سکتا ہے:

قلم میں گر نہ ہو قوّت کہ ذہن کو بدلے
تو کیوں نہ پھینک دیں یہ مصلحت کے سارے قلم

کیا خوبصورت شعر ہے! صرف لفظوں کا مصوّر ہی یہ کہہ سکتا ہے۔ مختلف رنگوں کو بے ترتیب بکھیر دینا تو مصوری نہیں ہے بلکہ رنگوں کا سلیقے سے استعمال ہی خوبصورت پینٹنگ پیش کر سکتا ہے۔ اسی پس منظر میں ملاحظہ ہو:

نہیں ہے فن، لغت کے خوبصورت لفظ چُن لینا
ہنر مندی تو ہے افکار تازہ کی حنا بندی

(سخنوی)

اگرچہ سروش ایک ترقی پسند فن کار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں اور ان کی شعری اور ادبی زندگی کا بڑا حصہ اسی نظریۂ زندگی سے وابستہ رہا ہے، لیکن انھوں نے کبھی غزل سے غزل کی روح کو جدا نہیں کیا۔ غزل کی چاشنی کو برقرار رکھا۔ کبھی اسے سیاست اور نعرے بازی سے آلودہ نہیں کیا۔ شعر و ادب کی اعلیٰ و مثبت قدروں سے ان کا ذہنی رشتہ ہمیشہ استوار رہا ہے۔ ان کے یہاں

سادگی تو ہے مگر اس درجہ سادگی نہیں جو شعر کو سپاٹ کردے، اسکو بے مزہ کردے، اس کے برعکس ان کے شعروں میں ہمیں منفرد قسم کی پرکاری اور دل آویزی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں نغمگی ہے اور اکثر گلوکار جب ان کی غزلیں گاتے ہیں تو اس خوبی کا اعتراف کرتے ہیں۔

عام طور پر ترقی پسند شعرا کا امتیاز یہ رہا ہے کہ انھوں نے نرم اور مدھم سُر میں بات کہنے کے بجائے اُونچے سُر میں راگ الاپا ہے مگر ان کی غزل کا امتیاز یہ ہے کہ وہ نرم، سبک، مدھم سُر اور سرگوشیوں میں بات کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ذیل میں دیے اشعار ان کے اسی ہنر کی نشان دہی کرتے ہیں:

لکھ لکھ کے مٹا دیوے ہے تو نام یہ کس کا
سچ کہیو سروش آج کسے یاد کرے ہے

پھر خط کے انتظار کی لوٹوں گا لذتیں
پھر نامہ لکھ رہا ہوں تری بے رُخی کے نام

نگاہ مل کے جھکی ، جھک کے پھر اُٹھی ، لیکن
اس ایک لمحے میں صدیاں گزر گئیں جیسے

پھول۔ رخسار کو ، آنکھوں کو کنول ہی کہیے
اور جب کہیے بہ اندازِ غزل ہی کہیے

حسن آوارہ ہے ، بیگانہ ہے ، آرائش ہے
اس کی تعریف میں بے ربط غزل ہی کہیے

دفن ہر قبر میں ہے حسرت وامید کی لاش
کوئی مرقد ہو اسے تاج محل ہی کہیے

طالب علمی کے زمانے سے رفعت صاحب کو جن مضامین میں دلچسپی تھی وہ مصوری کے علاوہ تھے جغرافیہ اور تاریخ اور اسی دلچسپی نے ان سے یہ شعر کہلوایا:

تاریخ اپنی آنکھیں مجھے دے کہ اے سروش
ہے مجھ کو عہدِ رفتہ کے آثار کی تلاش

اور اسی تلاش، اسی جستجو نے ان سے کئی ایسی تخلیقات کرائیں جن کا تعلق تاریخ سے تھا حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو شعر وادب کا موضوع بنانا کوئی آسان کام نہیں ہے مگر رفعت سروش صاحب تاریخ کے کینوس سے وہ واقعات چنتے ہیں جو آج بھی اہمیت کے حامل ہیں اور پھر ان واقعات اور شخصیات کو وہ شعری پیکر عطا کرتے ہیں کہ مانو وہ جی اُٹھے ہوں اور قاری کو ایسا لگتا ہے کہ یہ سب ہماری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے۔ ان کی نظم 'پانی پت' اسی کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی تاریخ پر گہری نظر کا واضح ثبوت ہے یہ طویل نظم جس میں سیاسی، تہذیبی اور سماجی واقعات اُجاگر کیے گئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ صوفیائے کرام کا بھی ذکر کیا ہے۔ نظم کے دو بنیادی کردار ہیں تاریخ اور پانی پت۔ یہ دونوں واقعات اور کرداروں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

نظم کا آغاز پانی پت کے مکالمے سے ہوتا ہے۔ یہ نظم ایسی ہے جس میں حقائق بھی ہیں اور تخیل کی رنگ آمیزی بھی۔ ابدی قدروں کی عکاسی بھی ہے اور فکر کی گہرائی اور گیرائی بھی۔ یہاں شاعر نے تاریخی واقعات کی جزئیات اور دیگر تفصیلات کو مورخ پر چھوڑ دیا ہے اور اپنی شاعرانہ بصیرت اور تخلیقی صلاحیت کو کام میں لاتے ہوئے تاریخ کے بین السطور کی سیر کرانے کی کوشش کی ہے۔ انھیں خصوصیات کی بنا پر یہ نظم اُردو شاعری کا ایک قابلِ قدر سرمایہ ہے۔

اِک شہر ہوں، پانی پت مرا نام
دل میں ہے ازل سے میرے کہرام
تاریخ کی دُھول میں اٹا ہوں
ہریانہ میں اِک طرف پڑا ہوں

اور پھر مہابھارت کی جنگ کو حوالے سے:

یدھشٹر
بھائیو! ہم ہیں اِک خون کے رُوپ رنگ
ہم نہیں چاہتے خون سے اپنے جنگ
ایک ہیں، ایک دادا کی سنتان ہیں
ہستنا پور کی آن ہیں شان ہیں

یدھشٹر کے نہ چاہتے ہوئے بھی جنگ ہوئی جس کا شاہد پانی پت ہے:

پانی پت: پھر رن وہ پڑا کہ توبہ توبہ
وہ خون بہا کہ توبہ توبہ

اور پھر کرشن جی ارجن کو تلقین کرتے ہیں:

گانڈیو سنبھلو، پارتھ اُٹھو
دویدھا کے بھنور سے، آج نکلو
آیا ہے سمے، اٹھاؤ ہتھیار
چپ بیٹھ کے ظلم سہنا بے کار

بہر حال جنگ ہوئی، اور تاریخ کے اوراق پلٹتے چلے گئے۔ پھر تاریخ حضرت شیخ شرف الدین بو علی شاہ قلندر کی عظمت کے گیت گاتی ہے:

ہند کی عظمت کا منظر ہے نظر کے سامنے
اور دَورِ بوقلندر ہے نظر کے سامنے
صوفیا میں شیخ شرف الدین ہیں زندہ مثال
آدمی خود کو مٹا دے، پھر بنے گا باکمال

اس نظم میں اُن حملہ آوروں کا بھی ذکر ہے جو ہندستان کو لوٹنے کی غرض سے آئے اور پھر بابر پر کئی معرکوں کے بعد یہ راز عیاں ہوا کہ:

اگر ہندوستان کو فتح کرنا ہے
تو دریاؤں، پہاڑوں اور زمینوں کو نہیں
اس ملک کے افراد کے دل جیتنے ہوں گے

اوپیرا رفعت صاحب کا مخصوص میدان ہے۔ 'شاہجہاں کا خواب' اُردو کا وہ پہلا اوپیرا ہے جس نے ہر خاص و عام سے دادِ تحسین حاصل کی۔ اوپیرا وہ صنف ہے جو سماعت اور بصارت دونوں کو تسکین پہنچاتی ہے۔ پروفیسر قاضی عبدالستار لکھتے ہیں:

''اوپیرا کی تعمیر میں پابند نظم جن مشکل مقامات سے گزرتی ہے، ان میں شاید ڈائیلاگ نگاری ایسا موڑ ہوتا ہے جہاں بڑے بڑوں کی شعریت کے آئینے چٹخ جاتے ہیں، چور چور ہو جاتے ہیں۔ اس پتھریلے موڑ سے رفعت سروش کا قلم بہ سلامت گزر گیا۔''

اوپیرا 'شاہجہاں کا خواب' آگرہ کے ہوٹل کلاکس شیراز میں پانچ ماہ تک لگاتار پیش کیا گیا اور پھر دلّی کے تاریخی میلے 'پھول والوں کی سیر' میں بھی پیش کیا گیا۔

'شاہجہاں کا خواب' کا پہلا سین شاہجہان کے دورِ اسیری کا ہے۔ وہ ایک مایوس اور مجبور انسان کی طرح تاج کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ تاج کے پاس جائے مگر جا نہیں سکتا، آخر کار مایوس ہو کر کہہ اٹھتا ہے:

شاہجہاں: جہاں آرا! کوئی صورت بتاؤں جلد مرنے کی طلسمِ زندگی کے دشت وایواں سے گذرنے کی جہاں آرا اس کی عظمت یاد دلاتی ہوئی کہتی ہے:

جہاں آرا: ہزاروں حکمراں دنیا میں یوں با کروفر گزرے
نہ باقی ہے فسانہ ان کی ہیبت اور رعونت کا
مگر وہ آپ ہیں جس نے دلوں پر حکمرانی کی بنایا
جاوداں اِک نقش انساں کی محبت کا

شاہجہاں: جہاں آرا! نہ دہراؤ فسانہ عہدِ رفتہ کا
کہ اب اک گوشہ زنداں ہے اور مجبور کی قسمت

الغرض 'شاہجہاں کا خواب' ایک میاب اوپیرا ہے، پیش کش تکنیک دونوں اعتبار سے 'جہاں آرا' رفعت سروش کا وہ اوپرا ہے جس کی بنیاد جہاں آرا کی داستان محبت پر ہے۔ یہ بحث نہیں ہے کہ یہ محبت حقیقت ہے کہ افسانہ، مگر پیش بے حد حسین ہے، اوپیرا میں جہاں آرا کا کردار بہت مضبوط دِکھایا گیا ہے۔ جب بلند اختر کو زہر کا پان دیا گیا تو وہ برداشت نہیں کر پاتی:

جہاں آرا: ہے یہ محل! کہ زنداں! زنجیر ہر قدم پر
دُشمن کو بھی نہ دینا شہزادی کا مقدر

جہاں آرا: ہے یہ محل ! کہ زنداں ! زنجیر ہر قدم پر
دُشمن کو بھی نہ دینا شہزادی کا مقدر
سرِ دربار گری یہ بجلی
مغلیہ آن کے کاشانے پر
ہم سمجھتے ہیں کہ یہ موت بلند اختر کی ،
زندگی سے بھی حسین تر ہے ، مگر

اس کا اعلان ہے یہ:

مغلیہ شان ہے اب روبہ زوال
مغلیہ شان ہے اب روبہ زوال

بہت حسین شاہکار، لاثانی اور لازوال ۔ایک ایک اوپیرا پورا پورا مقالہ لکھنے کے قابل ۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو کے ادارے آگے بڑھیں اور یہ اوپیرا پھر اسٹیج کی زینت بنیں۔

وقت کا رہوار اپنی رفتار ست نہیں کرتا، رُکنے کا تو سوال ہی نہیں، ہوتا یہ ہے کہ وہ انسان جو وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتا رہتا ہے ایک موڑ پر آ کر کہہ اُٹھتا ہے: ع

اے وقت کے رہوارذر ادھیر ے چل

مگر کہاں ۔ریل کا شدید حادثہ، کینسر، دل کا مرض اور آخر میں یہ سانس کا عارضہ ۔مگر قلم کی رفتار میں جمود نہیں آیا ۔30 نومبر 2008 کو رفعت سروش صاحب نے اس دُنیائے فانی کو خیر باد کہا اور پیش ہے 8 نومبر 2008 کو کہی اُن کی نظم:

معمول آج کا دن بھی کٹا
آج بھی شعلۂ امید بجھا رکھ ہوا
جھنجھنا تا ہی رہا تارِ نفس
رات آئی ہے ۔مگر نیند تو کیا آئے گی

ہاں نئے خوابوں کی یورش ہوگی

خواب ۔ !جن کی کوئی تعبیر نہیں ملتی ہے

رفعت سروش کو روشن مستقبل کا یقین تھا، آنے والی نسلوں پر بھروسہ تھا۔ایک نظم میراث:

رات ڈھلنے لگی

نیند آنے لگی

انگلیوں سے قلم چھوٹ جانے کو ہے

موت آواز دینے لگی ہے مجھے

کوئی ہے اس قلم کو جو نسلِ آدمی کی میراث ہے

مجھ سے لے کر نئی نسل کو سونپ دے

اور آخر کار اُن کو نیند آ ہی گئی............ابدی نیند!!

اچانک گردشِ خوں رُک گئی موجِ نفس ٹھہری

سکوتِ مستقل نے سلب کرلی دل کی بے تابی

ہزاروں اَن کہے افسانے لب پر جم گئے اس کے

ابد کی نیند بن کر رہ گئی پہروں کی بے خوابی

51 دہلی اپارٹمینٹ 15c/xxii

دواریکا، نئی دہلی ۔ 77

9650330332

❖❖❖

معین شاداب

نئی نسل کی نمائندہ اور معتبر آواز

ڈاکٹر شیخ نگینوی

سرزمینِ بجنور کو یہ اختصاص حاصل ہے کہ یہاں ہر عہد میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے اپنے اپنے میدان میں شہرت اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ شعروادب کی بات کریں تو قائم چاند پوری، ڈپٹی نذیر احمد، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا اکبر شاہ خاں علامہ تاجور نجیب آبادی سجاد حیدر یلدرم، اختر الایمان، قرۃ العین حیدر، گیان چند جین، نہال سیوہاروی، نشتر خانقاہی اور ہلال سیوہاروی جیسی بڑی شخصیتوں کی ایک طویل کہکشاں روشن ہے اور اس ضمن میں اور بھی بہت سے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ضلع بجنور کے موجودہ شعری منظرنامے پر نظر ڈالیں تو آج بھی ایک بڑی تعداد ایسے شعرا اور ادیبوں کی ہے جو اس ضلع کے روشن ماضی کی روایت کو پوری ذمے داری کے ساتھ آگے بڑھا رہے ہیں۔ انہیں قلم کاروں میں ایک چمکتا ہوا نام معین شاداب کا ہے۔ معین شاداب کی شخصیت کے یوں تو کئی حوالے ہیں۔ مثلاً پیشے کے اعتبار سے وہ صحافی ہیں اور پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں سے وابستہ ہیں۔ بحیثیت ناظمِ مشاعرہ انہوں نے پوری دنیا میں اپنی پہچان بنائی ہے۔ نثر نگار بھی ہیں اور مختلف ذرائع سے ان کی نگارشات منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں۔ جب کہ شاعر کے طور پر معین شاداب کا نام بھرپور توانائی کے ساتھ ابھرا ہے۔ معین شاداب کا نام یوں تو صحافت، نظامت اور ان کی نثر نگاری کے حوالے سے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن

شاعری کے معاملے میں انہوں نے عالم گیر سطح پر ادب کے سنجیدہ قارئین اور سامعین کو جس طرح اپنا گرویدہ بنایا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ سرزمینِ ضلع بجنور اپنے اس لائق فرزند پر فخر کرتی ہے۔

معین شاداب نے چھوٹی سی بستی میں رہتے ہوئے اپنی ترقی کے راستے تلاش کیے اور اپنی شخصیت کی اس انداز سے تعمیر تشکیل کی کہ آج ان کا نام صرف اپنے یا اپنی بستی کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے ضلع کے لیے افتخار کا باعث بن گیا ہے۔ نا مساعد حالات میں آگے بڑھتے جانا یقیناً مشکل ہوتا ہے۔ مسابقے کے اس عہد میں منزل کی تلاش بے حد دشوار گذار ہے۔ بڑی تگ ودو اور جدّ وجہد کرنی پڑتی ہے۔ معین شاداب نے اپنی صلاحیت اور محنت سے یہ تمام مراحل کامیابی کے ساتھ طے کیے۔ معین شاداب کے حق میں ایک اچھی بات یہ ضرور تھی کہ جس خانوادے میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اس کا ماحول علمی رہا ہے۔ گھر کے لوگ تعلیم یافتہ اور باذوق ہیں۔ داداجان منشی عبدالحکیم نے ملازمت کے سلسلے میں تقسیم وطن سے قبل کے ہندستان کے مختلف بڑے شہروں کا دورہ کیا تھا جن میں کراچی، لاہور، کوئٹہ، ڈھاکہ، آگرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس دوران ان کی کئی قابلِ ذکر ادیبوں اور شاعروں سے صحبتیں رہیں۔ والدِ محترم حافظ حنیف اختر نے بھی نگینہ، نہٹور، آگرہ، کلکتہ، ڈھاکہ وغیرہ شہروں میں تعلیمی اور معاشی سلسلے سے قیام کیا اور اہلِ علم اور باذوق شخصیتوں سے ربط رہا۔ گھر میں رسائل اور اخبارات پابندی سے آتے تھے۔ معین شاداب کے ادبی ذوق کو ابھارنے اور رشوق کو مہمیز کرنے میں اس تمام ماحول کا یقیناً دخل رہا ہوگا۔ ورنہ روانہ شکار پور جیسے مواضعات میں اس قسم کے ماحول کی توقع ذرا کم ہی کی جاسکتی ہے۔

معین شاداب نے روانہ سے ہی آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ بعد میں نزدیکی بستی راجہ کا تاج پور سے ہائی اسکول پاس کیا اور انٹر میڈیٹ میں مسلم قدرت انٹر کالج، سیوہارہ میں داخلہ لیا۔ گریجویشن کے لیے شہرِ جگر مرادآباد کا رخ کیا، جہاں مہاراجہ ہریش چندر کالج سے بی اے اور اس کے بعد ایم اے (اردو) کیا۔ اس دوران انہوں نے مرادآباد کے کئی ہندی اور اردو اخبارات میں جز وقتی ملازمت بھی کی۔ مرادآباد میں معین شاداب کے ادبی سفر کو نئی سمت ملی اور ان کی شناخت بنی۔ ایم اے کرنے کے بعد کچھ برسوں کے لیے ان کا تعلیمی سلسلہ موقوف ہوگیا البتہ

کچھ عرصے بعد وہ ایم فل (اردو) کرنے کے لیے گلابی شہر جے پور چلے گیے اور یم فل کرنے کے بعد وطن لوٹ آئے۔ لیکن ایک بار پھر تعلیمی استعداد بڑھانے کے لیے دہلی کے لیے رختِ سفر باندھ لیا اور وہاں جا کر دہلی یونی ورسٹی میں بی ایڈ میں داخل ہو گیے۔ بی ایڈ کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے جامعہ ملیہ میں اندراج کرایا اس طرح انھوں حصولِ تعلیم کے لیے کئی اسکول کالجوں اور کئی یونی ورسٹیوں کی خاک چھانی اور نئے تجربات اور ماحول سے اپنی شخصیت کو سنوارا۔

پہلے مرادآباد اور پھر کچھ عرصہ جے پور مقیم رہنے کے بعد معین شاداب ڈیڑھ دہائی سے زائد عرصے سے دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔ وہ آج کل سہارا انڈیا پریوار سے وابستہ ہیں، جہاں اردو نیوز چینل عالمی سہارا میں نیوز اینکر اور پروڈیوسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وہ دوردرشن نیوز اور دوردرشن اردو میں بھی نیوز ریڈر، اناؤنسر اور وائس اوور آرٹسٹ کے طور پر کام کر چکے ہیں الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ معین شاداب پرنٹ میڈیا سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ روزنامہ راشٹریہ سہارا نئی دہلی، روزنامہ اخبار مشرق دہلی، روزنامہ جدید ان دنوں دہلی، روزنامہ آئینۂ عالم مرادآباد، ہندی روزنامہ یگ بندھو مرادآباد، اور ہندی روزنامہ بجنور ٹائمس بجنور سمیت مختلف روزناموں ہفت روزوں اور ماہناموں میں وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا چکے ہیں۔ گذشتہ دنوں اتر پردیش اردو اکادمی نے ان کی صحافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں صحافت ایوارڈ سے سرفراز کیا ہے۔ روہیل کھنڈ یونیورسٹی بریلی، راجستھان یونیورسٹی جے پور، دہلی یونیورسٹی دہلی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے تعلیمی مراحل طے کرنے والے معین شاداب کو مہاراجہ ہریش چندر پی جی کالج مرادآباد کی سلور جوبلی تقریبات کے موقع پر 'بیسٹ ٹیلنٹ آف کالج ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ یہ اعزاز انہیں اس وقت کے گورنر سورج بھان کے ہاتھوں تفویض کیا گیا۔ گذشتہ برس حکومتِ دہلی کی طرف سے انہیں اردو اکادمی دہلی کی گورننگ کونسل کا رکن نامزد کیا گیا ہے۔ وہ اکادمی ایکزیکیوٹو کونسل کے ممبر بھی ہیں۔

معین شاداب ملک اور اور بیرون ملک کے مشاعروں اور دیگر ادبی تقاریب میں شریک ہو کر بجنور کا نام روشن کر رہے ہیں۔ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، پاکستان سمیت کئی

ممالک اور ریاستوں کے ادبی سفر کا موقع ملا۔ اپنی شاعری اور نظامت کی بنیاد پر وہ مکہ مکرمہ، مدینہ شریف، جدہ، دوبئی، قطر، بحرین، کراچی، حیدر آباد، سندھ، لاہور وغیرہ کا دورہ کر چکے ہیں۔

معین شاداب نے اپنی شاعری میں نئے موضوعات اور عصری مسائل کو جس خوب صورتی سے اٹھایا ہے اس کی مثال ممکن ہے ان کے ہم عصروں میں مل جائے لیکن ان کے ہم عمروں میں کم ہی ملتی ہے۔ ان کا انداز بیان اور طریقۂ اظہار بدلتے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری لوگوں کو نئے پن کا احساس کراتی ہے۔ نئی علامتوں اور تازہ استعاروں کا استعمال ان کی شاعری کو نئی ترقی پسندی کا اعلانیہ بنا دیتی ہے۔

معین شاداب کی شاعری نئی غزل کی ایک ایسی آواز ہے جو روایت سے منسلک رہتے ہوئے اپنے لیے نئی فضا کی تلاش کر رہی ہے۔ انہوں نے ایک خاص انداز میں زمانے کی نبض پر بھی ہاتھ رکھا ہے اور غزل کی کلاسیکیت کا بھی احترام کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کسی کے ساتھ گزارا ہوا وہ اک لمحہ
اگر میں سوچنے بیٹھوں تو زندگی کم ہے

دل سے اتر جاؤں گا یہ معلوم نہیں تھا
میں تو اس کے دل میں اتر کر دیکھ رہا تھا

کب آئے گا بتا وہ حیات آفریں مقام
جب میں اٹھاؤں گا تری انگڑائیوں کا بوجھ

یہ کس کی سانسوں کو خوشبو گراں گزرتی ہے
یہ کون گملوں میں تیزاب ڈال دیتا ہے

اس زاویے سے پیڑ لگایا ہے بھائی نے
آتا نہیں ذرا سا بھی سایہ میری طرف

اپنی اولاد سے تعظیم کی امید نہ رکھ
اپنے ماں باپ سے جب تو نے بغاوت کی ہے

کہیں بھی آگ لگے اس کا نام آتا ہے
اسے چراغ جلانے کی عادتیں تھیں بہت

مشہور شاعر اور صحافی اشہر ہاشمی نے اپنے سہ ماہی جریدے 'درون' کے اگست تا اکتوبر 2007 کے شمارے میں معین شاداب کی 20 غزلیں خصوصیت کے ساتھ شائع کی تھیں۔ خصوصی مطالعے کے عنوان سے دی گئیں ان غزلوں کی اشاعت کا جواز پیش کرتے ہوئے اشہر ہاشمی نے اداریے میں جو کچھ لکھا تھا وہ زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ ملاحظہ کریں:

''نئے دیوار اور نئے در کی آرزو بہت فعال سرگرم جاگتے ذہنوں کا ہمیشہ سے شیوہ رہا ہے۔ معین شاداب اسی ذہن کے عصری نمائندوں میں ہیں۔ وہ آنکھوں سے اوجھل منظروں اور سماعت سے دور آہٹوں کی آرزو اور بے تابی کو اپنی فکر کی بنیاد اور فن کی اساس بنا کر شعرگری کے ہنر کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اردو غزل میں یہ سادہ، سلیس اور سچی آواز نئی نسل کی سب سے نمائندہ اور معتبر آواز ہے۔ معین کے لہجے کی شادابی ان کے باطن میں موجود مثبت قدروں کے احترام کے موجزن سمندر کا استعارہ ہے۔ روایتوں کا پاس، رواج پر اتراہٹ، چاہتوں کا احساس ان کی غزلوں میں نمایاں فکر کی پرچھائیاں ہیں۔ نرم و نازک لیکن بولتے ہوئے لفظوں کے انتخاب میں یہ احتیاط معین شاداب کی نسل کے بہت کم شعرا میں نظر آتی ہے۔ ان کے شعروں میں ایک نمایاں وصف ایک ہلکے طنز کا ہے مگر اس میں بھی سفاکی کی جگہ انسانی ہمدردی اپنے ہونے کا پتہ دیتی ہے۔''

اشہر ہاشمی خود بہت عمدہ شاعر اور ذہین صحافی ہیں۔ شعر و شاعری کے عالمی منظرنامے پر ان کی گہری نظر ہے۔ انہوں بہت ایمانداری کے ساتھ نئی نسل کے اس فنکار کی شاعری کا محاسبہ کیا ہے اور ان کی یہ رائے بڑی اہم ہے۔ اشہر ہاشمی کے اس تبصرے سے معین شاداب کے شعری اوصاف کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا۔ بلاشبہ ان کی رائے کے مطابق معین شاداب اپنے ہم عصروں میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔ اشہر ہاشمی کے علاوہ اور بھی کئی صاحبانِ قلم نے معین شاداب کی فکر و فن کا اعتراف کیا ہے۔

معین شاداب کے کئی ایسے اشعار ہیں جو ان کی شناخت کا روشن حوالہ بن گیے ہیں:

کسی کے ساتھ گزارا ہوا وہ اک لمحہ
اگر میں سوچنے بیٹھوں تو زندگی کم ہے
گم اگر سوئی بھی ہو جائے تو دل دکھتا ہے
اور ہم نے تو محبت میں تجھے کھویا تھا
دل ایک ہے تو کئی بار کیوں لگایا جائے
بس ایک عشق بہت ہے اگر نبھایا جائے
موجوں سے لڑتے وقت تو میں اس کے ساتھ تھا
ساحل پہ اس کے ہاتھ میں کوئی اور ہاتھ تھا
اس سے ملنے کی خوشی بعد میں دکھ دیتی ہے
جشن کے بعد کا سناٹا بہت کھلتا ہے
تم شرافت کہاں بازار میں لے آئے ہو
یہ وہ سکہ ہے جو برسوں سے نہیں چلتا ہے
آپ کے ساتھ یہ برتاؤ بھی ہوسکتا ہے
سچ اگر بولے تو پتھراؤ بھی ہوسکتا ہے
لائق فائق گھر میں بیٹھے رہ جاتے ہیں
اور ایسے ویسوں کو تمغہ لگ جاتا ہے

معین شاداب ضلع بجنور کے شعروادب کو بھی اپنی تحریروں کا موضوع بناتے رہتے ہیں۔ جو اپنے وطن سے ان کے قلبی لگاؤ اور عقیدت کا ثبوت ہے۔ بجنور کے شعری منظرنامے اور یہاں کے شعرا اور ادیبوں پر ان کے مضامین باصرہ نواز ہوتے رہتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب میں گوہر نورپوری پر ان کا ایک مضمون شائع کیا جارہا ہے جو بڑا معلوماتی ہے۔

❖❖❖

گدڑی کا لعل: گوہر نور پوری

معین شاداب

لعل گدڑیوں میں ہی ملتے ہیں۔ یہ مقولہ ملک زادہ منظور احمد نے اس وقت دہرایا تھا، جب وہ اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے مطالبہ کی مہم چلا رہے تھے۔ یہ بات انھوں نے گوہر نور پوری کے لئے کہی تھی۔ نور پور ضلع بجنور کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ جو مراد آباد اور بجنور کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ اور یہاں تعلیمی اور ادبی رجحان آج بھی ارتقا کی تلاش میں ہے۔ شعر و ادب کے لئے نامساعد حالات اور ہم مذاق لوگوں کے فقدان کے درمیان ایک گوشۂ گمنام میں خود تشہیری سے گریزاں طبیعت کے مالک گوہر نور پوری واقعتاً گدڑی کا لعل کی مثال بن جاتے ہیں۔ لیکن ملک زادہ کی یہ گوہر شناسی ایک ادبی سچائی تھی۔

گوہر نور پوری 12 دسمبر 1936 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ لیکن ان کا نسبی تعلق نور پور سے ہی ہے۔ ان کا بچپن چاند پور میں اپنے ننیہال میں گزرا۔ وہیں ایک مکتب میں انھوں نے اردو عربی اور گلستاں تک فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ معاشی معاونت کیلئے والدہ کے ہمراہ احمد آباد کا رخ کرنا پڑا۔ شعر کی طرف ان کی طبیعت شروع سے ہی راغب تھی۔ اسکول کے زمانہ میں ہی تک بندی کرنے لگے تھے اور ساتھیوں سے واہ واہی لوٹتے۔ احمد آباد میں مولانا حاذق اندوری کی صحبت میسر آئی تو ذوق شعر پروان چڑھنے

لگا۔لیکن طبیعت کی بے نیازی اور مزاج کی خاموشی کے سبب اپنے ذوق کے اظہار کی جرأت نہ کر پاتے۔ بالآخر جذبہ شوق کا پیمانہ چھلک ہی پڑا اور پھر یہ سلسلہ بخوبی چل نکلا۔ چاند پور لوٹ کر گوہر نورپوری باقاعدگی کے ساتھ شعری نشستوں اور مشاعرہ میں شرکت کرنے لگے۔ وہاں کے ادبی ماحول میں آپ نہ صرف پہچانے جانے لگے، بلکہ اس کی ضرورت بھی بن گئے۔

1952 میں انہیں چاند پور چھوڑ کر اپنے آبائی وطن نورپور میں سکونت اختیار کرنی پڑی۔ نورپور کا ماحول طبیعت کے بالکل ناموافق تھا۔ کوئی ہم مذاق یا ہم خیال میسر نہ تھا۔ چنانچہ وہ ایک عجیب سے احساس میں مبتلا ہو گئے۔ سوچتے کہ اب ان کے ذوق کا حشر کیا ہوگا۔ لیکن انھوں نے ہمت نہیں ہاری، اور چند ہی دنوں کی کوشش سے ذاکر حسین ذاکر، اشتیاق حسین مہر اور صادق نورپوری وغیرہ کو اپنا ہم ذوق اور ہم خیال بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور نورپور میں شعری محفلوں کی بنیاد پڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں شعری ماحول پھلنے پھولنے لگا اور فضا سازگار ہوتی چلی گئی۔ نئے لکھنے والے بتدریج منظر عام پر آنے لگے۔ جس نورپور میں گوہر نورپوری کو اپنے ذوق کا دم گھٹتا نظر آرہا تھا۔ آج اسی نورپور میں کئی ستارے آسمان شعر و ادب کو آب و تاب بخشنے میں مصروف ہیں۔ ان میں زبیر نورپوری، شاہد انجم، نفیس پرویز، ریاض حنفی، جوہر نورپوری، عبدالغفار دانش نورپوری، ثمر نورپوری اور علی اکرم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ گویا نورپور کا موجودہ ادبی منظر نامہ گوہر نورپوری کا ہی رہین منت ہے۔ گوہر نورپوری نے 1959 سے 1964 تک کا عرصہ عروس البلاد ممبئی میں گزارا۔ ممبئی میں آپکی ملاقات استاد شاعر منیر الہ آبادی سے ہوئی اور آپ ان کے تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ گوہر نورپوری نے نورپور میں بزم منیر قائم کی جو استاد محترم کے تئیں ان کی سعادت مندی کا ثبوت ہے۔ گوہر نورپوری انتہائی متین، سنجیدہ، منکسر المزاج، خاموش طبع، خوددار اور متواضع انسان تھے۔ ناموافق حالات میں بھی جیتے رہنے کا فن ان کو آتا تھا۔ اور شاعری کو کبھی انھوں نے اپنی تشہیر کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بلکہ خلوص اور لگن کیساتھ اردو ادب کی خاموش خدمت کی۔ روزنامہ انقلاب، اردو ٹائمز اور پرتاپ سمیت ملک کے کئی موقر رسائل اور اخبارات میں آپ کا کلام شائع ہوا۔ 1967 میں انھوں نے نعتیہ شاعری پر مبنی کتابچہ 'حسن تخیل' کے نام سے

شائع کیا تھا۔ان کا شعری مجموعہ عنقریب اشاعت کے مراحل طے کرے گا۔

گوہر نور پوری کی شاعری کا بنیادی وصف کلا سیکی رچاؤ ہے۔انکی غزلیں روایت کی خوشبو میں رچی بسی ہوتی ہیں۔فکر میں رنگینی اور انداز بیاں میں رعنائی ہے۔ان کے شعروں میں حسن وعشق کی جلوہ سامانیوں کے ساتھ ساتھ حوادث روزگار کی عکاسی بھی نظر آتی ہے۔عصر آگہی کے وجدان سے روشن ان کے اشعار اس بات کے شاہد ہیں کہ انھوں نے ذات وحیات کے ساتھ ساتھ کائنات کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے۔گوہر نور پوری روایت کے پاسدار ہیں۔انکے سخن کا اچھا خاصہ حصہ واردات عشق سے ہے۔لیکن ایک خاص رکھ رکھاؤ' سادگی اور صحت مند تکلف کے ساتھ۔محبوب کی بے وفائی' ہجر' محرومی' اداسی' اور اس نوع کے کچھ اور غم اور عشق کی مختلف کیفیتیں محبت کرنے والوں کا عام مسئلہ ہے۔گوہر نور پوری کا بھی ان سے سابقہ پڑا ہے۔لیکن امید کا دامن وہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے' حوصلہ نہیں ہارتے' بلکہ رجائیت کی شمع روشن رکھتے ہیں۔عزم کا مظاہرہ کرتے ہوئے غم پر غم کھانے کو رہنا وقار سمجھتے ہیں۔ یہ بات بھی ان کے جذبوں کے کھرے پن کا ثبوت ہے کہ ان کی شاعری میں محبوب کے تئیں احترام واکرام اور نگہ داری ووابستگی کی ایک خاص فضاء ملتی ہے۔

گوہر نور پوری کی شاعری میں غم زندگی بار بار روشن ہوتا ہے۔ان کی اپنی زندگی بھی غموں سے خالی نہ تھی۔غم کو انھوں نے سرمایہ حیات سمجھا' اس سے لذت حاصل کی اور زندگی کا نیا حوصلہ دریافت کیا۔اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کو اظہار کی زبان بخش کر انھوں نے اپنے ہی جیسے ان گنت لوگوں کی روئیداد بیان کردی ہے۔ان کی شاعری زندگی کے مختلف رنگوں کے درمیان گزر۔تے ہوئے روشن خطوط چھوڑتی جاتی ہے۔

گوہر نور پوری صرف غم ذات میں الجھ کر نہیں رہ جاتے بلکہ معاشرہ کے درد کو بھی انھوں نے ایک لے بخشی ہے۔سماج کے زخموں سے اپنی غزلوں کو روشن کیا ہے۔ان کی شاعری کو اپنے گردو پیش سے بھرپور سروکار ہے۔عہدہ حاضر کی سفاکیوں اور فتنہ سامانیوں کو انھوں نے پوری توانائی سے موضوع بنایا ہے۔

گوہرنورپوری نے اگست 1994 میں ایک غزل لکھی، جس کا مقطع ہے:

لکھتے لکھتے جس کو گوہر تھک گئی ہیں انگلیاں

وہ کہانی کتنی جلدی مختصر ہونے کو ہے

تقریباً چھ سوا چھ ماہ کے اندر یہ کہانی واقعی مختصر ہوگئی۔ 13 رفروری 1995 کو سخن کے اس گوہر آب دار کو موت کے اندھیروں نے نگل لیا۔

گوہرنورپوری نے جو کچھ بھی کہا دل پذیر انداز میں کہا۔ وہ ایک سچے فنکار تھے؛ جنھوں نے شہرت اور صلہ کی پرواہ کئے بغیر ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ اپنے محسوسات اور مشاہدات کو شعری قالب میں ڈھال کر زمانے کے حوالے کر دیا۔ گوہرنورپوری نے نورپور کو شعروادب کا گلشن بنایا۔ اور ایک سچے باغباں کی طرح تمام عمر اس کی باغبانی کرتے رہے ۔ مجھے یہ لکھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہے کہ آج نورپور میں شعروادب زندہ ہے تو گوہرنورپوری کی وجہ سے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انکو جو مقام ملنا چاہیے تھا وہ نہیں ملا۔ قائم چاندپوری، ڈپٹی نذیراحمد، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا اکبرشاہ خاں، علامہ تاجور نجیب آبادی، سجاد حیدر یلدرم، اخترالایمان، قرۃ العین حیدر، گیان چند جین، نہال سیوہاروی، نشتر خانقاہی، اور ہلال سیوہاروی، جیسی قدآور شخصیات کو جنم دینے والی سرزمیں ضلع بجنور کی ادبی روایات کی توسیع میں گوہرنورپوری نے اپنے حصے کی ذمہ داری کو بخوبی نبھایا ہے۔

معین شاداب

پوسٹ باکس نمبر 9787

جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 25

09990525374

سالک دھامپوری اوران کافن

ڈاکٹر شیخ نگینوی

معروف صحافی وادیب سالک دھامپوری نے ابتدائی تعلیم دھامپور میں حاصل کی۔ ممبئی کے ماہم آرسی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ ادیب ماہر اور ادیب کامل جامعہ اردو علی گڑھ سے امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔ ان کو زمانہ طالب علمی سے ہی لکھنے کا شوق رہا۔ الجمیعۃ میں سیاسی مضامین شائع ہوئے۔ نور، بتول، الحسنات وحجاب (رامپور) میں کہانیاں شائع ہوئیں۔ جماعتِ اسلامی سے وابستگی کے سبب 21/ماہ (4/جولائی 1975ء تا 24/اپریل 1977ء) ایمرجنسی کے دوران ضلع جیل بجنور، سینٹرل جیل بریلی اور سینٹرل جیل نینی الہ آباد میں نظر بند بھی رہے۔ 8/سال تک جماعت اسلامی ہند کے ہندی اخبار کانتی میں بحیثیت اسسٹنٹ ایڈیٹر کے کام کیا۔ اس کے بعد اردو سے ہندی ترجمہ کا کام شروع کیا۔ سب سے پہلی کتاب انجم بک ڈپو دہلی کی محمد بن قاسم کا ترجمہ کیا۔ 6/سال ہفتہ وار بھور میل میں ایڈیٹر کے بطور کام کیا۔ 1984ء میں اپنا ہفتہ وار اخبار جائزہ نکالا تھا، جو قانونی گرفت میں آکر بند ہوگیا۔

چار سال اردو ماہنامہ دعوت وعزیمت دہلی کے مدیر رہے۔ اس کے علاوہ راشٹریہ سہارا، قومی آواز، انقلاب، جدید خبر، صحافت، اخبارِ مشرق، جدید میل، ہمارا سماج، ہندوستان ایکسپریس، نئی دنیا اور دیگر اخبارات میں مضامین لکھتے رہے ہیں۔ اردو سے ہندی میں ترجمہ کرنے کا مستقل کام ہے اب تک تقریباً دو سو سے زیادہ کتابیں ہندی زبان میں ترجمہ کر چکے ہیں اس کے

علاوہ تفسیر سنائی، فقہ الحدیث کا ہندی ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔ نسیم حجازی کے 10 رمشہور تاریخی ناول اور مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ قرآن اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کی تلخیص کا ہندی ترجمہ بھی کر چکے ہیں۔

سالک دھامپوری کی سب سے پہلی تحریر ''یہ بیکری والے'' روزنامہ انقلاب میں شائع ہوئی تھی۔ یہ تحریر انھوں نے 1965ء میں لکھی تھی۔ اسی طرح جس بچے کے ایما پر انھوں نے قلم اٹھایا، اسی کے کہنے سے سب سے پہلی کہانی ''ماں کے آنسو'' لکھی تھی جو روزنامہ اردو ٹائمز میں شائع ہوئی تھی۔

ممبئی کے قیام کے دوران انقلاب اور اردو ٹائمز میں بے شمار بچوں کی کہانیاں شائع ہو چکی ہیں۔ دلچسپ واقعہ ہے کہ اردو ٹائمز میں ڈاکٹر نوری صاحب کا مضمون رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ شائع ہوا تھا، ان کے مضمون پر اپنے زمانہ طالب علمی میں ایک تنقیدی مضمون شائع کرایا۔ ڈاکٹر نوری اس سے بہت متاثر ہوئے، کیونکہ وہ بہت مناسب تنقید تھی۔ وہ سالک صاحب کو کوئی عالم دین اور پختہ عمر کا شخص سمجھ کر ان سے ملنے ماہم آئے، وہاں وہ اپنے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ رہتے تھے اور جب وہ آئے تو وہ ہاف پینٹ کے ساتھ بنیان پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہ کیا یہاں سالک دھامپوری رہتے ہیں۔ انھوں نے ہاں کہہ کر ان کو اندر بٹھایا۔ پھر کپڑے بدل کر ان کے سامنے جا بیٹھے۔ انھوں نے کہا: ''بھئی سالک دھامپوری کو تو بلاؤ'' انھوں نے کہا کہ میں ہی سالک دھامپوری ہوں۔ تو ڈاکٹر نوری یہ سن کر کرسی سے اچھل پڑے۔ بڑی حیرانی سے معلوم کیا کہ وہ تنقیدی مضمون تم نے ہی لکھا تھا۔ جب سالک صاحب نے ہاں کہی تو شاباشی دی اور پوچھا..... ''کہاں پڑھتے ہو؟'' تو انھوں نے کہا کہ ''ماہم آرسی اسکول میں۔''

وہ عام طور پر سلگتے ہوئے عصری مسائل پر بے باکی اور جرأت کے ساتھ قلم اٹھاتے رہے ہیں۔ زندگی کا بیشتر حصہ جدوجہد میں گزرا۔ ظلم و جبر کے خلاف لڑنے اور قلم سے شمشیر کا کام لینے کا ہنر انھیں خوب آتا ہے۔ انھوں نے حق گوئی اور بے باکی کو اپنا وطیرہ بنایا اور ملی تنظیموں سے جب بھی کوئی لغزش ہوئی اس پر بروقت متنبہ کیا۔

سالک دھامپوری گزشتہ چار دہائی سے صحافت سے وابستہ ہیں اوران کا قلم آب رواں کی طرح جاری ہے۔ ان کے احباب کا حلقہ نہایت وسیع ہے، جن میں متعدد ممتاز شخصیات بھی شامل ہیں۔ وہ لگی لپٹی کے بغیر سپاٹ لہجے میں بڑی بات کہہ گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ میدان مزاح نگاری کے بھی شہسوار ہیں اور طنز ومزاح پر مشتمل مضامین کا ایک مجموعہ چائے کی دکان کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کے طنزیہ مضامین کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں کسی نہ کسی سنجیدہ مسئلہ کی عکاسی کی گئی ہے۔ وہ اپنے ہر کالم میں معاشرے کے کسی ایسے ناسور کی جراحی کرتے نظر آتے ہیں جس پر یا تو نظر جاتی ہی نہیں یا جاتی بھی ہے تو اس پر کالم نویسی کا خیال تک نہیں آتا۔

سالک دھامپوری اصل میں ہندی زبان کے آدمی رہے ہیں، لیکن اخبارات میں لکھتے رہنے اور مطالعہ کے ذوق نے ان کو اردو زبان کا ادیب بھی بنا دیا۔ سالک دھامپوری صاحب اردو زبان میں لکھتے ہی نہیں ہیں بلکہ ان کو اردو زبان سے جنون کی حد تک دلچسپی ہے، اسی لیے وہ اردو زبان کے فروغ کے لیے کام کرنے والی دو تنظیموں یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن سے بھی وابستہ ہیں۔ ان تنظیموں کی جانب سے اردو کے فروغ کے لیے جو بھی خدمات انجام دی جاتی ہیں، سالک دھامپوری ان میں برابر مصروف رہے ہیں۔

آج کل وہ فری لانس کے طور پر اردو اخبارات میں مضامین لکھتے ہیں۔ ماہنامہ جرائم میں کئی سال سے مسلسل ہر ماہ موجودہ مسائل اور سیاست پر مبنی طنز ومزاح پر مشتمل مضمون لکھ رہے ہیں۔ جماعت اسلامی ہند کی طلبہ ونگ ''ایس آئی او'' کے ہندی ماہنامہ ''رفیق منزل'' میں بھی ہر ماہ ایک دعوتی فیچر لکھتے رہے ہیں۔

سالک دھامپوری کو شعر وشاعری سے بھی دلچسپی ہے اور ان کا ارادہ شعری مجموعہ مرتب کرنے کا ہے لیکن جب ان سے معلوم کیا گیا کہ کیا آپ مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں، تو انھوں نے بڑی صفائی سے بتایا کہ..... ''مشاعروں میں بالکل شرکت نہیں کرتا البتہ اپنی کوئی غزل یا نظم کبھی کبھی اخبار ورسائل کو بغرضِ اشاعت ضرور بھیج دیتا ہوں۔

اردو میں لکھنے کی ابتداء حالانکہ اوائل عمر سے ہی ہے، مگر سنجیدہ اور ملی وسماجی موضوعات

پر لکھتے لکھتے اچانک سالک دھامپوری نے طنز و مزاح کے میدان میں طبع آزمائی کو کیوں اختیار کیا...؟ یہ ایک اہم سوال ہے، جو ان کی زندگی کے کسی سربستہ راز کی طرح ہے۔ ہو سکتا ہے ملک و سماج کے ابتر حالات، قائدین ملت کی منافقت، ان کے قول و عمل کے تضاد اور ملک کے سیاسی رہنماؤں کی موجودہ روش اور سیاست کے دیوالیے پن نے سالک دھامپوری کو طنز و مزاح میں طبع آزمائی کرنے پر مجبور کر دیا ہو۔ تازہ مجموعہ ''تکلف بر طرف'' ان کے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔

ضلع بجنور کے درخشاں ستارے

سالک دھام پوری

اس سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ اردو مشاہیر کے معاملے میں ہم اپنے ملک کے بہت سے شہر و اضلاع کے نام لے سکتے ہیں۔ لیکن مردم خیزی کا جہاں تک تعلق ہے، اس کے لیے ہم اتر پردیش میں ضلع بجنور کا نام سرِ فہرست دیکھتے ہیں۔ اردو ادب کی تاریخ پر اگر ایک گہری نظر ڈالیے تو عہد میر وسودا کے عظیم شاعر قائم چاند پوری، ڈپٹی نذیر احمد، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، سجاد حیدر یلدرم، ان کی بیٹی قرۃ العین حیدر، اختر الایمان، پروفیسر گیان چند، علامہ تاجور نجیب آبادی، کوثر چاند پوری، رفعت سروش، حافظ دھاپوری، پروفیسر خورشید الاسلام، پروفیسر اطہر پرویز، قیصر زیدی، نشتر خانقاہی، اظہار اثر اور نہال سیوہاروی کے نام اردو ادب و شاعری میں نظر آتے ہیں۔ بعد میں بھی ضلع بجنور نے بہت سے شاعر و ادیب پیدا کیے۔ اسی سلسلے کے چند شعراء کا تذکرہ میں یہاں کر رہا ہوں۔

جنوں سہس پوری

ضلع بجنور کے مشہور قصبہ سہسپور کے ایک علمی گھرانے میں 1939 کو ایک بچہ کی

پیدائش ہوئی۔ یہی بچہ جب بچپن اور لڑکپن کے ایام سے گزر کر تعلیم وتربیت کے بعد عقل وخرد کی دنیا میں آیا تو جنوں سہسپوری کے نام سے متعارف ہوا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں پھر انٹر کالج میں مزید تعلیم حاصل کی۔ گھر والوں نے اس بچہ کا نام ابن حسن رکھا تھا اس لیے تعلیم کے ابتدائی دور میں اپنے ہم سبق بچوں کے ساتھ گفتگو میں یہ بچہ تک بندی کرنے لگا تھا، اسی تک بندی نے زبان وادب کی خوراک حاصل کی اور پختگی کے دور سے گزر کر معقول قسم کی شاعری ہونے لگی۔

ایامِ طفولیت میں ہی اس قسم کے اشعار جنوں نے کہنا شروع کر دیے تھے:

خبر کیا تھی کہ آنچل بھی ہوا کے رخ پہ اڑتا ہے
ہم اپنی سمت آنچل کو اشارہ کر کے پچھتائے

یا

ان گنت لہرائے آنچل میرے چھونے کے لیے
میری آہٹ پر نہ جانے کتنے دروازے کھلے

جنوں صاحب جوان ہوئے تو ان کے ماں باپ کو ہر ماں باپ کی طرح اپنے بیٹے کی شادی کی فکر ہوئی یہ آج کے ترقی یافتہ یا آزاد معاشرہ کی طرح کا زمانہ نہ تھا جہاں سارے اخلاقی اصول ونظریات شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر نوجوان نسل سارے فیصلے از خود ہی لیتی ہے بلکہ اس زمانے میں ماں باپ ہی کے فیصلے اور رائے وارادوں کی اولاد پابند تھی۔ جنوں صاحب کی شادی کے لیے ان کی والدہ نے جس لڑکی کا انتخاب کیا وہ ان کے لیے بالکل انجان تھی بقول جنوں صاحب کے کہ ”انھوں نے اس لڑکی کو کبھی دیکھا بھی نہیں تھا یہ الگ بات ہے کہ وہی میری کھلی آنکھوں سے دیکھے خوابوں کی تعبیر نکلی اور جب میں نے اس کو پہلی بار شب عروسی میں دیکھا تو برجستہ یہ شعر موزوں ہو کر میری زبان سے نکلا:

یوں فلک پر اک اندھیرا چھا گیا
ماہِ تاباں میرے گھر میں آگیا

جنوں صاحب کی زندگی کے اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شاعر کے لیے شعر

کہنے اور شاعری کے لیے کسی وجہ اور واقعہ کا ہونا ہی بہت بڑی بات ہے۔ جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ کا جب 1979ء میں انتقال ہوا تو جنوں صاحب نے ان کے انتقال پر ایک نظم بطورِ خراجِ عقیدت لکھی تھی جو اس زمانے کے کئی اخبار و رسائل میں شائع ہوئی تھی۔ افسوس کہ وہ نظم ہمیں تلاش کے باوجود نہ مل سکی۔

جنوں صاحب نظریاتی اعتبار سے اشتراکی تھے، وہ سرخ انقلاب سے کافی متاثر تھے، ان کے کلام میں جابجا اس کا رنگ نظر آتا ہے۔ انھوں نے رومانی شاعری بھی کی ہے، ظلم واستحصال کے ماحول میں رہ کر وہ رومانی شاعری سے اپنے آپ کو نہ روک سکے۔ یہی رومانی شاعری کا رجحان ان کو فلمی دنیا تک لے گیا، حالانکہ جنوں صاحب کا کہنا تھا کہ میری رومانی شاعری سے میری اہلیہ بہت دنوں تک بدگمان رہیں، انھیں وہم ہی نہیں بلکہ شک تھا کہ میں بیوی تو ضرور ہوں محبوبہ کوئی اور ہے مگر جلد ہی ان کی بیوی کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔

جنوں صاحب کی زندگی کا یہ ناقابلِ فراموش واقعہ ہے اور اس واقعہ میں بہت سے لوگوں کے لیے ایک سبق بھی ہے، عبرت بھی ہے۔ ان کی رومانی شاعری ان کو بالی وڈ لے گئی۔ وہاں ان کی ملاقات نریش سہگل سے ہوئی۔ نریش سہگل کو جنوں صاحب کی رومانی نظموں نے بے حد متاثر کیا اور انھوں نے ان سے گیت لکھنے کو کہا۔ نریش سہگل نے اپنی آنے والی فلم "اوپر والا جانے" کے لیے گیت لکھنے کو کہا۔ لیکن ابھی پہلے گیت کی ریکارڈنگ ہونے والی تھی کہ گھر سے ایک خط آیا جس میں ان کے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر تھی اور یہ بھی لکھا تھا کہ تمہاری بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ خط لے کر جنوں صاحب اسٹوڈیو گئے، سہگل صاحب نے ان کی بھیگی آنکھوں کی طرف دیکھ کر سوال کیا تو انھوں نے خط ان کو پکڑا دیا۔ انھوں نے جنوں صاحب کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ ممبئی سے سہسپور آ گئے گھر آ کر قبرستان جا کر بچے کی قبر دیکھی، بیوی کو شدید بیمار اور نازک حالت میں پایا، ایسی کیفیت میں وہ سراپا غم بن گئے تھے علامہ اقبال کا یہ مصرعہ ان کے ذہن میں ابھرا ع

اماں ملے شاید اللہ ہو میں

اور پھر اس واقعہ کے بعد ان کی زندگی کا رخ ہی بدل گیا، اشتراکی نظریات سے توبہ کرلی۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات کا مطالعہ شروع کردیا۔ ممبئی سے زیش سہگل کے بار بار بلانے پر ممبئی کا رخ نہیں کیا جبکہ اس کے بعد انھوں نے نہایت عسرت میں زندگی بسر کی۔ بجنور میں جنوں صاحب کو جن شعرا نے سرپرستی کے لائق سمجھا ان میں ڈاکٹر رضوان شاد، ڈاکٹر سراج، واحد جمال کرت پوری، اطہر سمہپوری، راشد سیوہاروی، ابرار منظر ہلدوانی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

جنوں صاحب کا شعری مجموعہ ''سلاسل'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ ''مراحل'' کے نام سے زیرِ طباعت ہے۔ جب ان کا پہلا مجموعہ 'سلاسل' شائع ہوا تو ان کے بعض ہمدردوں نے ان کو کاروباری اعتبار سے مشورہ دیا کہ وہ اس کو ہندی میں شائع کرائیں تو انھوں نے ان کو اپنا یہ شعر سنا دیا:

نہ جانے اور سارے لوگ کیوں آئے تھے محفل میں
جنوں ہم تو یہاں اردو میں باتیں کرنے آئے تھے

وہ اپنی ایک نظم ''اکتفا'' میں کہتے ہیں:

تمہارا جسم کسی کا ہو روح میری ہے
کوئی بھی ظلم یہ رشتہ مٹا نہیں سکتا
تمہاری زلف کے سائے میں کوئی بھی سو لے
تمہارے پیار کی چھاؤں کو پا نہیں سکتا

اپنی ایک نظم ''مشورہ'' میں وہ کہتے ہیں:

مرے قریب نہ آؤ کہ اب پرائی ہو
مرے گلے سے لپٹ کر نہ اشک برساؤ
تمہیں سماج کے ہاتھوں نے جس کو سونپا ہے
سہاگ رات کا مطلب اسی کو سمجھاؤ

دیگر اشعار:

تیری گالی میرے کانوں تک تو پہنچی بعد میں
پہلے تیرے منہ میں رہ کر تجھ کو گندہ کر گئی

سب نے جنوں کی آنکھ میں ڈھونڈا
آنسو دل کے اندر نکلا

بیٹی کا جب جہیز مہیا نہ کر سکا
مفلس کو اپنا نام سکندر برا لگا

ہلال سیوہاروی سے ملاقات

ہلال سیوہاروی طنز و مزاح کے مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی طنزیہ شاعری سے نہ صرف ملکی سیاست بلکہ قائدین اور بدعنوان معاشرہ اور رشوت خور افسران کی زندگی کا بھی اپنی شاعری کے ذریعے پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ گو کہ ہلال سیوہاروی زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، ان کا خاندانی پس منظر ضرور ادبی و شعری ذوق کا حامل تھا۔ ان کے دادا قاضی ظہور الحق کا شمار تو فارسی و اردو کے قادر الکلام شعراء میں ہوتا تھا۔ ان کے والد قاضی فضل حق بھی شعری ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی ذہنی اختراع اور اللہ کی طرف سے اس فن کے نزول سے یہ ثابت کر دیا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بڑے بڑے نامور اساتذہ کی شاگردی ہی سے کوئی شاعر نہیں بن سکتا ہے۔

15 رجنوری 1928ء کو قصبہ سیوہارہ ضلع بجنور میں قاضی ظہور الحق کے فرزند قاضی فضل حق کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ اس بچہ کو تعلیم دلانے کی بے حد کوشش کی گئی مگر وہ ابتدائی درجات سے آگے تعلیم نہ حاصل کر سکا۔ یہی بچہ بڑا ہو کر طنز و مزاح کا ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر ثابت ہوا۔ جس کو لوگ ہلال سیوہاروی کے نام سے جانتے ہیں۔

ہلال سیوہاروی 1946ء میں اپنے قصبہ کے بر لامل میں ایک فٹر کی حیثیت سے ملازم ہو گئے۔ ان کے مزاج اور ان کی زندگی کے کام کے درمیان گو کہ شاعری کا کوئی میل نہیں تھا مگر پھر

بھی وہ ایک اعلیٰ درجہ کے شاعر بن کر ابھرے۔ان کی شاعری صرف قہقہہ ہی نہیں بلکہ خونِ دل میں ڈوبی ہوئی انگلیوں سے لکھا ہوا اس دورِ تشدد وانحطاط کا منظر نامہ بھی ہے جو ہمارے احساسات کے تاروں کو جھنجھنا کر ہمیں منزلِ انقلاب کی طرف جانے کی دعوت دیتا ہے۔

ہلال سیوہاروی کو میں نے سب سے پہلے بمبئی کے ایک مشاعرے میں دیکھا اور پہلی باران کا کلام سنا۔میری عمر اس وقت پندرہ سال تھی میں فورٹ میں ہونے والے ایک آل انڈیا مشاعرہ میں اپنے اسکول کے ساتھیوں کے ساتھ اس لیے گیا تھا کہ مشاعرہ کے پوسٹر میں ضلع بجنور کے ایک شاعر ہلال سیوہاروی کا بھی نام تھا۔ مشاعرہ اس لحاظ سے بے حد کامیاب رہا کہ اسی مشاعرہ میں ہلال سیوہاروی کا نام بحیثیت طنز ومزاح شاعر کے طور پر ہندوستان کے گرد وپیش میں ابھرا۔اس کے بعد تو وہ ترقی کی منازل طے کرتے گئے۔

ہلال سیوہاروی سے میری دوسری ملاقات ان کے مکان پر ہوئی میں دہلی سے گھر گیا ہوا تھا۔ اپنے دوست محمد مرتضیٰ آزاد سے ملنے سیوہارہ گیا تو انھوں نے میری ملاقات ہلال سیوہاروی سے کرائی۔ہم لوگ عصر کے بعد ان کے گھر گئے بڑے تپاک سے ملے۔اس وقت وہ عمر کے آخری دور سے گزر رہے تھے۔لیکن ان کے مزاج اور گفتگو میں وہی شگفتگی اور شیفتگی تھی بات چیت میں بھی مزاح تھا، میں نے ان کو بتایا کہ میں نے آپ کو پہلی بار 1965ء میں بمبئی کے ایک مشاعرے میں سنا تھا وہ کہنے لگے کہ ہاں وہ میرا پہلا بڑا مشاعرہ تھا۔

میں نے کہا ہلال صاحب آپ طنز ومزاح کے شاعر ہیں، زندگی کا بڑا گہرا مطالعہ آپ نے کیا ہے۔سرد وگرم حالات سے گزرے ہیں، کوئی واقعہ اپنی زندگی کا سنائیے۔انھوں نے کہا کہ جب میری شاعری کی شہرت ملک و بیرونِ ملک ہونے لگی اور قومی پریس میں میرے فوٹو شائع ہونے لگے تو بعض حاسدین نے مل مالک برلا صاحب سے میری شکایت کی کہ تمہاری مل کا معمولی فٹر اخبارات میں چھپ رہا ہے۔غیر ممالک جا رہا ہے۔برلا صاحب نے ایک دن مجھے اپنے آفس میں بلایا اور اس بارے میں باز پرس کی۔میں گھبرا گیا کہ شاید وہ نوکری سے نکال دیں گے کہ جاؤ شاعری کرو۔لیکن انھوں نے جو کچھ کہا، اس سے میں حیران رہ گیا۔انھوں نے کہا "بیٹا ہلال! تم

آرام سے شعروشاعری کرو۔مل آنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، تمہاری تنخواہ تمہیں گھر مل جایا کرے گی۔تمہاری شاعری کے ذریعہ تمہاری نہیں بلکہ میرے مل کی اور میری بھی پبلسٹی ہورہی ہے۔''

دوسرا واقعہ انھوں نے یہ سنایا کہ سالک میاں ایک دن میں گھر پر اسی کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا، اچانک دروازہ پر جارحانہ قسم کی دستک سن کر گھبرا گیا۔ جا کر دروزہ کھولا تو سامنے چند کرتا پاجامہ اور داڑھی والے لوگوں کو کھڑے دیکھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم تبلیغی جماعت کے لوگ ہیں، تبلیغ کررہے ہیں اور پھر انھوں نے فوراً مجھ سے کہا: ''کلمہ سنایئے۔'' میں نے کہا: ''جناب وہ پرانا والا کلمہ تو یاد ہے اگر آپ لوگوں نے کوئی نیا کلمہ تیار کیا ہے تو وہ آپ بتادیں۔''

ہلال سیوہاروی کی زندگی ایک مثالی زندگی تھی دن بھر کی محنت ومشینوں کے ناگوار گوش گراں شور میں شاعری کی خوشگوار لہریں دو متضاد عناصر ہیں مگر ہلال سیوہاروی کی تخلیق اور ترقی کا انحصار اور بنیاد ہی تضاد تو ہے ہلال صاحب ایک فٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انھیں کسب معاش کے لیے دن بھر سخت محنت کرنا پڑتی تھی مگر ان کا شاعرانہ مزاج اور فنکارانہ فطرت اسی غیر شعوری ماحول میں بھی مصروفِ عمل رہتی تھی۔ وہ ابتدا میں درجہ تین سے زیادہ نہ پڑھ سکے مگر بعد میں شعری ذوق وشوق کے بعد انھوں نے ادیب ماہر اور ہندی وانگریزی کی تعلیم اپنی محنت اور لگن سے حاصل کی۔

ملکی اور ملی مسائل پر انھوں نے برجستہ وار کیا ہے سیاست سے متعلق برجستہ نظمیں کہی ہیں۔ جب ملک میں اندرا گاندھی وزیر اعظم تھیں اور انھوں گیہوں پر ''لیوی'' (ایک قسم کا ٹیکس) لگادی تھی تو ہلال سیوہاروی نے اس آرڈی نینس کے بعد ایک قطعہ کہا تھا جس میں اندرا گاندھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

ہر چیز کو چھو خوشۂ گندم کو نہ چھیڑ
یہ جو چاہے تو تباہی بھی مچا سکتا ہے
جس نے آدم کو نکالا تھا کبھی جنت سے
آج حوا کو بھی کرسی سے ہٹا سکتا ہے

اسی طرح ایک بار ضلع بجنور کے قصبات وشہروں میں بجلی کا بحران ہو گیا تھا، کئی کئی دن تک بجلی نہیں آتی ہے ہر شہر وقصبہ میں اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا تھا۔ اس ماحول سے متاثر ہو کر ہلال صاحب نے بجنور شہر کے ٹاؤن ہال میں ہونے والے مشاعرہ میں ایک قطعہ سنایا تھا:

تم اپنی غریبی کو مٹاتے نہیں خود ہی
کیا کیا نہ ملے تم سہارا نہیں سمجھے
مدت سے جو ہے شہر کی گلیوں میں اندھیرا
تم پھر بھی حکومت کا اشارہ نہیں سمجھے

ہلال صاحب کے کئی شعری مجموعہ شائع ہو چکے ہیں مگر افسوس ان کے وارثان نے ان مجموعوں کی حفاظت نہیں کی کیونکہ ان میں سے کئی اس وقت نایاب ہیں۔ جو مجموعہ شائع ہوئے تھے ان میں ''فریب سحر''، ''فریب نظر''، ''انگوٹھا چھاپ''، ''دھندلا سویرا''، ''اگر برا نہ لگے''۔

ملک کی تعمیر وترقی میں ہلال سیوہاروی محنت کش طبقہ کو اقتدار و دولت مندی اور عیش وآرام کی زندگی گزارنے والے سیاست دانوں کے مقابلے میں زیادہ اہم اور محترم مانتے ہیں۔ کہتے ہیں:

ایک گدھے سے کہا میں نے کہ اچھے ہو
بولا اینٹوں سے لدا پھرتا ہوں کیا اچھا ہوں
میں نے اس سے کہا کہ اس دور میں لیڈر بن جا
بولا اس سے تو سرکار میں گدھا اچھا ہوں
کوئی تعمیر ہو لدتی ہیں مجھی پر اینٹیں
پھر بھی مہنگا نہیں کچھ سستے ہی دام آتا ہوں
اپنے بنگلوں میں بڑے رہتے ہیں لیڈر اکثر
میں گدھا ہو کر بھی اس دیش کے کام آتا ہوں

ہلال سیوہاروی کی مشہور ''جوتا'' نظم کو بھی عالمی مشاعروں میں بڑی داد ملتی تھی۔ ''جوتا'' نظم میں وہ کہتے ہیں:

کیسے ممکن ہے کہ دنیا میں کوئی انساں
بل پہ تقدیر کے تدبیر سے لڑسکتا ہے
جس کی ایجاد تھی پیروں کی حفاظت کے لیے
کیا خبر تھی وہ کبھی سر پہ بھی پڑسکتا ہے

ہلال سیوہاروی کا یہ شعر تو بہت ہی مشہور و معروف ہے جو پورے ملک کی سیاست اور سیاسی افراد پر پوری طرح صادق آتا ہے:

بر باد گلستاں کرنے کو صرف ایک ہی الو کافی ہے
ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا

عبدالرحمٰن رشک کرتپوری

اردو ادب اور شعر و شاعری میں قصبہ کرتپور ضلع بجنور کا ایک خاص مقام رہا ہے۔ اس ادبی اور شعر و سخن کے معاملے میں معروف قصبے نے بے شمار ادیب، شاعر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اپنے یہاں پیدا کیے۔ قصبہ کرتپور کے نام کے ساتھ حفیظ میرٹھی صاحب و ابرار کرتپوری صاحب کا نام وابستہ ہے جو اردو ادب اور شعر و سخن میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

اسی قصبہ کرتپور کے ایک خاص شاعر کا تعارف اس مختصر سے مضمون میں کرانا چاہتا ہوں۔ قصبہ کرتپور میں الحاج محمد حنیف صاحب کے یہاں 29/جون 1949ء کو ایک بچہ کی پیدائش ہوئی۔ اس بچہ کا نام والدین نے عبدالرحمٰن رکھا۔ عبدالرحمٰن ذرا بڑے ہوئے تو انھوں نے خاندان کے ادبی اور تعلیمی میدان میں پرورش پائی اور اس طرح انھوں نے خالص ادبی ماحول میں اپنے آپ کو پایا۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عربیہ انصار العلوم میں حاصل کی، اس کے بعد قصبہ کے مسلم انٹر کالج سے عبدالرحمٰن نے انٹر پاس کیا۔ زمانہ طالب علمی سے ہی شعر و شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا تھا، کالج کی سالانہ میگزین میں اردو شعبہ کی ادارت کی ذمہ داری ملی اور اس طرح شعر و ادب میں

مہارت پیدا ہوتی گئی۔

اس ادبی فضا میں شاعری کی ابتدا ہوئی اور رفتہ رفتہ قصبہ میں موجود ادبی مجلسوں میں اپنا کلام سنانے لگے اور داد و تحسین حاصل کرتے رہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے عبدالرحمٰن کو رامپور جانا پڑا جہاں رضا کالج میں آپ دو سال زیرِ تعلیم رہے اور رضا کالج سے بی اے کیا۔ اس کے بعد میڈیکل تعلیم کے لیے دہلی کا رخ کیا، جہاں آل انڈیا آیورویدیہ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور یہاں سے بی یو ایم ایس کیا۔ تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ عبدالرحمٰن نے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے شعر و ادب سے اپنا تعلق برابر قائم رکھا۔ جہاں جہاں رہے وہاں شعر و شاعری کے پروگراموں میں حصہ لیا اور اپنا کلام لوگوں تک پہنچایا۔

عبدالرحمٰن صاحب نے 1973 میں قصبہ دھامپور کے محلہ نئی سرائے میں اپنا کلینک کھولا اور بہت جلد وہ یہاں کے ادبی ماحول میں رچ بس گئے ایک ادبی نشست میں عبدالرحمٰن رشک کرتپوری سے میری ملاقات 1974 میں ہوئی۔ میں ان دنوں جماعت اسلامی سے وابستہ تھا اور شہر دھامپور کا امیر تھا۔ کیونکہ میں خود شعر و سخن کا رسیا تھا، ادبی پروگراموں میں حصہ لیتا تھا لہٰذا بہت جلد عبدالرحمٰن رشک کرتپوری سے خاص تعلق قائم ہو گیا۔ کوئی ایسا پروگرام نہیں ہوتا تھا جس کی نظامت رشک کرتپوری کے ذمہ نہ ہوتی ہو۔

اس وقت عبدالرحمٰن صاحب قصبہ کرتپور میں شعر و سخن کی آبیاری کر رہے ہیں۔ قصبہ کرتپور میں کئی ادبی مجلسیں قائم ہیں۔ بزمِ ادب کرتپور کے عبدالرحمٰن رشک کرتپوری صاحب صدر ہیں۔ اور اس بزم کے ذریعہ اردو ادب کی برابر خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ہر سال ۹ رنومبر کو جو کہ علامہ اقبال کا یومِ پیدائش ہے اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی اپیل پر اپنے قصبے میں بڑی دھوم دھام سے یومِ اردو کا جشن بزمِ ادب کرتپور کے پلیٹ فارم سے مناتے ہیں جس میں نہ صرف علامہ اقبال کی شاعری پر مضامین پڑھے جاتے ہیں بلکہ عوام کے ذوق کی تسکین کے لیے ایک شعر و شاعری کا پروگرام بھی منعقد کیا جاتا ہے۔ یوں تو رشک کرتپوری نے اب تک نظم، غزل، رباعیات، قطعات اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ابھی تک آپ کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا

ہے۔آپ کی شاعری اور شعر و نغمہ کا اندازہ آپ کے مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

سہلا ہی رہا تھا میں زبانوں کے دیے زخم
دل چیر گئی اب تیری دزدیدہ نگاہی

جو وقت کو ٹھکرائے گا اے رشک بہر حال
خود اپنے پر ایک روز بلائے گا تباہی

حادثوں کا کوئی ڈر دل میں وہ کب رکھتے ہیں
حوصلے والے طبیعت ہی عجب رکھتے ہیں

سازشی ان کے مکانوں کو جلاتے ہیں مگر
ہم چراغوں سے اجالوں کی طلب رکھتے ہیں

ٹھوکر میں ہماری ہو ہر اک دیر کی شاہی
بن جائیں اگر آج بھی ہم حق کے سپاہی

دنیا کی ہوس دل میں بسا بیٹھے ہیں ہم لوگ
اب ہم کو تباہی سے بچائے گا خدا ہی

آشنا دل کو ہر اک غم کا بناتے رہیے
اور محبت کا فسانہ بھی سناتے رہیے

معین قریشی

کرتپور ہی کی سرزمین کا ایک ادبی شہ پارہ معین قریشی بھی ہے۔ گو کہ فی الحال کافی دنوں سے معین قریشی دہلی میں سکونت پذیر ہیں۔ کرتپور کی کئی ادبی اور معروف شخصیات کرتپور سے باہر مقیم ہیں اور بعض تو اپنے نام کے ساتھ کرتپور نہ لگانے کے باعث کرتپور کی معلوم ہی نہیں ہو پاتیں اس کی سب سے واضح مثال حفیظ میرٹھی کی ہے، وہ اصلاً کرتپور ہی کے باسی تھے۔ ابتدائی اور اس کے آگے کی تعلیم بھی انھوں نے کرتپور ہی میں حاصل کی تھی مگر بسلسلہ ملازمت وہ فیض عام انٹر کالج میں آئے تھے اور پھر یہاں میرٹھ ہی میں ساری زندگی اس طرح بسر کی کہ میرٹھی ان کے

نام کے ساتھ لگے رہنے سے ان کے آبائی وطن کی بات غیر معروف سی ہو گئی۔

معین قریشی کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے، ان کے والد محترم ڈاکٹر تاج الدین قریشی (مرحوم) پہلے مرادآباد اور پھر تلاشِ معاش کی وجہ سے دہلی منتقل ہو گئے تھے۔ معین قریشی کی پیدائش قصبہ کرتپور کی ہے، ابتدائی تعلیم بھی انھوں نے وہاں کے مدارس میں حاصل کی۔ معین قریشی کی پیدائش 1961 کی ہے۔ معین قریشی نے فتح پوری ہائر سیکنڈری اسکول میں آگے کی تعلیم حاصل کی بعدازاں ذاکر حسین کالج سے بی اے پاس کیا۔ 78-1977 کے دوران جمعیۃ العلماء کے اخبار روزنامہ الجمعیۃ میں دو سال ملازمت کی۔ اس ملازمت کو چھوڑ کر معین قریشی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ''پروفیشن ان عربک'' میں داخلہ لیا۔

چار سال جامعہ ہمدرد یونیورسٹی میں بھی ملازمت کی یعنی 1980 سے 1984 تک جامعہ کے ڈپارٹمنٹ آف ٹیکنالوجی میں بطور ٹائپسٹ کلرک کے کام کیا۔ 1985 میں وزارتِ صحت کے ایک ادارے سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (CCRUM) میں ملازمت اختیار کی اور تا حال معین قریشی اسی عہدہ پر کام کر رہے ہیں۔

دہلی کی کئی ادبی، ملی اور سیاسی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ بزمِ احباب اور دیگر ادبی محفلوں کی رونق بنے رہتے ہیں۔ مسلم لیگ دہلی پردیش کے نائب صدر ہیں۔ زمانہ طالب علمی سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور دہلی کے ادبی حلقہ میں برابر شرکت کرتے رہے۔ شعر و شاعری کے علاوہ معین قریشی نے خدمت خلق کے میدان میں بھی کافی سرگرمیاں دکھائی ہیں۔ ''بڑھتے قدم'' کے نام سے 1997 میں آپ نے ایک سماجی و فلاحی تنظیم قائم کی۔ اس تنظیم نے 9 سالوں میں سماجی زندگی کے مختلف شعبوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی سماجی خدمت کے سلسلے میں ''بڑھتے قدم'' کے زیر سرپرستی Grievance Cell کے نام سے مخصوص شعبہ قائم کیا گیا جو آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ عوام کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس سیل کے ذریعہ مظلوم لوگوں کو قانونی معاملات کے مدنظر مفت قانونی صلاح و مشورہ دینے کا اہتمام ہے، اس کے علاوہ یہ سیل بہت سے غریب لوگوں کے لیے عدالتی چارہ جوئی کا بھی مفت انتظام کرتا ہے۔ 1997-1998 کے دوران اوکھلا میں اس بڑھتے قدم کے ذریعے ڈیمولیشن کے سلسلے میں عوام کی شاندار اور بھرپور مدد کی گئی۔

معین قریشی نے شعری میدان میں حمد، نعت، غزل اور قطعات کے علاوہ جو ایک بہت بڑی ادبی اور ملی خدمت انجام دی ہے، وہ ہے ان کی ایک طویل نظم جو کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ 32 صفحات کی اس طویل نظم میں انھوں نے موجودہ مسلمانوں کی زبوں حالی، ان کے ساتھ ہونے والے سرکاری و غیر سرکاری سلوک اور اپنوں اور خود اپنی حالت زار کو منظوم کیا ہے اور اس نظم کو لکھ کر انھوں نے حقیقت میں موجودہ دور میں الطاف حسین حالی کے مسدس کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اگر دورِ جدید کا مسدس کا نام معین قریشی کی اس نظم کو دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ معین قریشی کے اشعار کا نمونہ پیش کرنے سے قبل ان کی اس مشہور نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ حمد و نعت کے انداز میں وہ کہتے ہیں:

تیرے ہی حکم سے سارا نظام آسمانی ہے
تیرے ہی حرف 'کن' کے بعد کی ساری کہانی ہے
سمندر موتیوں مونگوں سے سارے بھر دیے تو نے
وہاں بھی جینے کے تھوڑے سہارے کر دیے تو نے
میں نعت پاک لکھوں یہ خیال خام ہے میرا
اگر کچھ لکھ سکا، سمجھوں گا یہ الہام ہے تیرا
چلو ہمت میں کر کے دیکھتا ہوں نعت کہنے کی
مگر درخواست ہے آقا سے دل کے پاس رہنے کی

ملت کے نام:

کہیں ایسا نہ ہو پھر کھاؤ ٹھوکر لڑکھڑا جاؤ
کسی ڈر سے کسی لالچ سے پھر تم ڈگمگا جاؤ
بڑھانے ہیں قدم آگے تمھیں اب متحد ہوکر
نماز و روزہ سے بھی لیس ہوکر متقی ہوکر
نڈر رہنا مگر شیطان کے ہر وسوسے سے تم
کہ گھبرانا نہیں باطل کے جھوٹے غلغلے سے تم

مسدس کا آخری شعر:

نظم لکھ کر معینؔ خوش نوا خوش فال لایا ہے
کہیں یہ مت سمجھ لینا کہ پھر اقبال آیا ہے

دیگر اشعار:

سارے حرام کام دن کے اجالے میں ہو گئے
بے چاری رات مفت میں بدنام ہو گئی
اتنا تو اعتبار ہے تجھ پر ہمیں معین
جب تو نہیں رہے گا بہت یاد آئے گا

سالک دھامپوری
مقیم حال جامعہ نگر، نئی دہلی-25
موبائل9868966128

❖❖❖

ایک مخلص ادیب: ڈاکٹر وسیم اقبال صدیقی

ڈاکٹر شیخ نگینوی

ضلع بجنور کے نئی نسل کے ادیبوں میں وسیم اقبال ایسا نام ہے، جس نے اپنی ادبی صلاحیت اور حسن اخلاق کی وجہ سے اردو ادب میں بہت کم وقت میں اپنی پہچان قائم کی ہے۔ یکم جولائی 1973 کو نگینہ کے ایک علمی اور زمیندار گھرانے میں پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم نگینہ میں حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انٹر، بی۔اے، ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کیا۔ کرشن گوپال ڈگری کالج نگینہ میں تین سال صدر شعبۂ اردو اور دو سال ایڈیشنل سینئر سپر ٹینڈ ینٹ آف ایگزامینشن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وسیم اقبال کی بہترین انتظامی صلاحیتوں کے پیش نظر کالج منتظمہ کمیٹی کی جانب سے انھیں پرنسپل کے عہدے پر مستقل کرنے کی بھی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر وسیم اقبال نے کالج میں رہتے ہوئے دامے، درمے قدمے سخنے نہ صرف کالج کی بقا کے لیے کام کیا بلکہ اپنی تین سال کی سیلری بھی کالج ویلفیر فنڈ میں میں ڈونیٹ کردی۔ ڈاکٹر وسیم نے اپنی تحقیق کے حوالے سے نئے نئے نکات، معنی و مفاہیم اور پہلو وضع کیے ہیں۔ پروفیسر وسیم بریلوی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر محمود الہٰی، پروفیسر طارق چھتاری، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، پروفیسر محمد انصار اللہ، جناب مخمور سعیدی، جناب عابد سہیل، جناب اسد رضا، ڈاکٹر کاظم علی خاں، محترمہ سلمٰی حجاب وغیرہ نامور اردو داں حضرات نے ڈاکٹر وسیم اقبال کے قلم اور تخلیقات کو سراہا ہے۔ اوراقِ ادب (دو جلدوں میں)، گلدستہ در گلدستہ، (5 جلدوں میں)، گلدستۂ بیت بازی، اردو کی طنزیہ اور مزاحیہ نثر (ایک تنقیدی جائزہ) وغیرہ وسیم اقبال کی اہم تصنیفات ہیں اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ ڈاکٹر وسیم

اقبال کی کتابیں جامعہ اردو علی گڑھ کے ماہر اور کامل کے علاوہ اتراکھنڈ میں نصاب میں شامل ہیں۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف حال ہی میں ایجوکیشن نیکسٹ تنظیم نے انھیں ''فخرِ نگینہ اردو ایوارڈ 2016 '' اور محمد اکرم میموریل سوسائٹی نجیب آباد نے شکیل رحمانی ایوارڈ 2016 کے اعزاز سے نوازا ہے۔دو درجن سے زائد کتابوں پر ان کے تبصرے اردو دنیا، آج کل اور ایوانِ اردو وغیرہ میں شائع ہو چکے ہیں اس کے علاوہ متعدد ریاستی، نیشنل اور انٹرنیشنل سیمیناروں میں بھی ان کی شرکت ہوتی رہتی ہے۔

❖❖❖

پروفیسر ادریس احمد سیوہاروی ایک تعارف

ڈاکٹر وسیم اقبال

سیوہارہ ضلع بجنور میں ایک قدیم قصبہ ہے جہاں بہت سے نامور اشخاص نے ادب، سیاست اور سماجی کاموں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ 932ھ میں بابر کے ہندستان کو فتح کرنے کے بعد یہاں ایران، افغانستان سے بہت سے عالم فاضل حضرات آئے اور سیوہارہ کو ہی اپنا وطن قرار دیا۔ ان حضرات میں ایک شخصیت قاضی حسن زنجانی اور ان کے چچا مولوی عبدالرحیم کی تھی۔ قاضی حسن زنجانی کو بابر نے سیوہارہ کا قاضی مقرر کیا اور ان سے قاضی سلسلہ چلا۔ مولوی عبدالرحیم نے خاندان مولوی یان کی بنیاد ڈالی۔ اس سلسلے میں بھی متعدد عالم فاضل شخصیتیں وجود میں آئیں اور انھوں نے عربی فارسی میں تصنیف وتالیف سے ادبیات کو فروغ بخشا۔

اسی سلسلے کے مولوی حافظ محمد ذکریا صاحب کے یہاں 8اگست 1938 کو ادریس احمد کی پیدائش ہوئی۔ کم سنی میں ہی آپ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا اور آپ شفقت پدری سے محروم ہو جانے کے بعد والدہ محترمہ کے ساتھ نگینہ منتقل ہو گئے۔ یہاں آپ کی بڑی ہمشیرہ کی شادی مولوی شرافت علی کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہاں رہ کر آپ نے کلام اللہ حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی اور 1945 میں والدہ صاحبہ کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئے۔

دہلی میں پرائمری سے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مالی حالات کے پیش نظر پرائیویٹ ادارے میں ملازمت شروع کی اور پھر پرائیویٹ طور پر تحصیل علم کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ اردو اور فارسی میں آنرز کے امتحانات فرسٹ ڈویزن سے پاس کیے اور اسی طرح

آہستہ آہستہ منزل کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے 1970 میں فارسی میں فرسٹ ڈویژن سے ایم اے پاس کیا اور 1972 میں دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ ایسوسی ایٹ کی جگہ پر تقرر ہوا اور یہیں سے 1976 میں .Ph.D کی ڈگری ''سرہند میں فارسی ادب کا ارتقا'' عنوان پر تحقیقی مقالہ تیار کر کے حاصل کی۔ تعلیم سے فراغت کے بعد 1976 میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی میں اسسٹینٹ پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا، 1988 میں آپ ایسوسی ایٹ پروفیسر ہوئے اور 2003 میں پروفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

فارسی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ 1988 میں ''سرہند میں فارسی ادب'' کے عنوان سے پہلی کتاب شائع ہوئی۔ جس میں سرہند میں پیدا ہونے والے شعرا، مورخین، صوفیا کرام کے ادبی کارناموں کو منظر عام پر لایا گیا۔ خاص طور پر حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے خاندان کے دیگر بزرگوں نے دین اسلام کو کس طرح بدعات اور مسیات سے پاک کیا اس کا تذکرہ ہے۔ دوسری کتاب ''ایران کی سماجی اور کلچرل تاریخ کی جھلکیاں'' Glempses of Social and Cultural History of Iran کے عنوان سے انگریزی میں تحریر کی جو نہایت مقبول ہوئی۔

دو کتابیں زیر ترتیب ہیں جن میں ایک ''اقبال کی فارسی شاعری پر مختلف مضامین'' (اردو و فارسی میں) زیر تیب ہے۔ اسی طرح ''ناصر علی سرہندی کا دیوان'' ایڈیٹ کر کے شائع کرنے کے پروگرام پر بھی کام چل رہا ہے۔ ملک و بیرون ملک نیشنل اور بین الاقوامی سمیناروں میں بحثیت مقالہ نگار شرکت فرماتے رہتے ہیں۔ ہندوستان کے ادبی مجلات میں آپ کے تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، جن کی ایک طویل فہرست ہے۔

سماجی خدمات:

پروفیسر ادریس احمد نے ہمدرد یونیورسٹی میں بھی ملازمت کی اور ملازمت کے دوران وہاں کی اسٹاف یونین کے سکریٹری کی حیثیت سے دواخانہ کے ملازمین کے مفادات کی حفاظت اور حقوق کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ کم حیثیت والے ملازمین کے بچوں کی تعلیمی امداد کی غرض

سے تعلیمی فنڈ قائم کرایا جس کے آپ سکریٹری رہے۔

دہلی میں رہائش کا مسئلہ نہایت اہم تھا۔ جب ابوالفضل انکلیو کالونی بنی تو یہاں بے آب و گیا میدان کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ آپ نے بھی یہاں پلاٹ خریدا اور کالونی کی ترقی اور اس میں ضروری سہولتیں مہیا کرانے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ ریزیڈینس ویلفیئر ایسوسی ایشن قائم کی اور اس کے سکریٹری کی حیثیت سے یہاں بجلی، پانی، نالیاں، سڑکیں بنوانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج یہ کالونی بجلی کی روشنی سے جگمگا رہی ہے، اور یہاں جماعت اسلامی، اہل حدیث، مجلس مشاورت کے صدر دفاتر ہیں کئی اخبار یہاں سے شائع ہوتے ہیں۔ معزز شخصیات یہاں رہنے میں فخر محسوس کرتی ہیں۔ آپ کی سماجی خدمات کو ابوالفضل انکلیو کا ہر شخص جانتا ہے اور تسلیم کرتا ہے۔

آپ کی ادبی خدمات پر حکومت ہند اور حکومت ایران نے آپ کو ایوارڈ سے نوازا۔ دیگر ادبی اداروں نے بھی آپ کی ادبی خدمات اعتراف کیا اور اعزازات سے نوازا۔ ''سرہند میں فارسی ادب'' پر نہ صرف یوپی اردو اکادمی نے ایوارڈ سے نوازا بلکہ ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن نے بھی اسی کتاب پر خاص طور پر حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم نے اپنے دست مبارک سے خط لکھ کر مبارکباد دی اور انعام عنایت فرمایا۔ صدر جمہوریہ ہند نے 2008 میں سرٹیفکیٹ آف آنر کا اعلان کیا۔ جس کی تقریب 6 مئی 2011 کو منعقد ہوئی اور اس وقت کی صدر جمہوریہ پرتھا دیوی سنگھ پاٹل نے سرٹیفکیٹ آف آنر سے نوازا۔ اس ایوارڈ کے تحت آپ کو تاحیات پچاس ہزار روپے سالانہ گرانٹ ملتی رہے گی۔ حکومت ایران کی طرف سے آپ کو 22 اپریل 2011 کو سعدی ایوارڈ عطا کیا گیا اور مبلغ -/85000 (پچاسی ہزار) روپے نقد اور سرٹیفکیٹ عطا کیا گیا۔ یہ تمام اعزازات نہ صرف پروفیسر ادریس احمد صاحب کے لیے بلکہ ان کے وطن عزیز سیوہارہ کے لیے بھی باعث افتخار ہیں۔

پروفیسر ادریس احمد کی فارسی، عربی ادب سے دلچسپی اور وابستگی خاندانی ہے۔ خاندان مولویان میں مولوی وحیدالدین وحید صاحب دیوان شاعر تھے۔ مولوی سید حسن صاحب عربی زبان

کے ماہر تھے اور بھوپال کی مجلس علما کے رکن تھے۔ خورشید الاسلام سے آپ کی حقیقی بھانجی منسوب ہیں۔ پروفیسر ریاض الاسلام سے آپ کی اکثر خط و کتابت رہتی تھی وہ اپنی تصنیفات بھی آپ کو ارسال فرماتے تھے۔

آپ کے والد صاحب بھوپال میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کے صاحبزادے فرحان جلیس جامعہ ہمدرد کے شعبۂ فارسی میں پروفیسر ہیں اور یورپ، آسٹریلیا، برطانیہ اور امریکہ میں کانفرنسوں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں مختلف شہروں میں کانفرسوں میں شرکت کرتے رہنا ان کی روزمرہ زندگی میں شامل ہو گیا ہے۔

دیگر ادبی سرگرمیاں:

دہلی یونیورسٹی میں تدریسی خدمات کے ساتھ آپ نے سینٹ اسٹیفن کالج دہلی اور ذاکر حسین کالج دہلی میں بھی مہمان پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی میں چار سال تک مہمان پروفیسر کی حیثیت سے جدید فارسی کی تعلیم دی۔ آل انڈیا ریڈیو سے افغانستان کے لیے نشر ہونے والے پروگراموں میں خبریں، تبصرے، پریس ریلیز نیز مختلف موضوعات پر فارسی دری میں ترجمہ کر کے، تقریباً 20 سال تک خدمات انجام دیں۔ خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران میں مختلف کتب خانوں کے لیے مخطوطات کی فہرست سازی میں استادوں اور ایرانی اسکالرز کے ساتھ بھی آپ نے کام کیا۔

دہلی یونیورسٹی سے شائع ہونے والے مجلّہ ''تحقیقات فارسی'' کے آپ ایڈیٹر بھی رہے۔ اس سے قبل آپ نے بچوں کے ماہنامہ رسالہ ''پھلواری'' کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔

نور پور کا نور ریاض حنفی

ڈاکٹر شیخ نگینوی

ضلع بجنور کا قصبہ نور پور جس کی زرخیز مٹی میں تاریخی حوالے موجود ہیں جہاں کے جیالے مادر وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ نور پور کی عوام کے ذہن صاف اور فرقہ واریت سے پاک ہے۔ ہندو مسلم سکھ سبھی مذاہب کے لوگ شیر و شکر ہو کر رہتے ہیں۔ میل و مروت، رواداری، وضع داری، تمیز، تہذیب یہاں کی عوام کے شعائر میں ہے۔

اسی سرزمین پر ادب اور غزل کے محافظ ریاض احمد انصاری کی پیدائش 1960 میں عبدالرشید اور رئیسہ خاتون کے یہاں ہوئی۔ تعلیم نور پور میں ہی حاصل کی۔ شہباز ندیم ضیائی کے سامنے زانوئے ادب ہوئے۔ اور تخلص ''ریاض حنفی'' رکھا۔ 2015 میں ''تشنگی ہوتے ہوئے'' شعری مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ راشد جمال فاروقی (رشی کیش) ''تشنگی ہوتے ہوئے'' پر اپنی رائے میں تحریر کرتے ہیں ''ریاض کی شاعری اپنی مٹی کی سوندھی خوشبو لٹاتی ہے''۔ بقول شکیل جمالی ''آج جب علاقائی زبانیں دم توڑ رہی ہیں، ادب تخلیق کرنے والے کم ہو رہے ہیں۔ ادب کا قاری گمشدہ ہے، وہاں آپ کسی بھی فنکار سے بہت زیادہ توقعات نہیں کر سکتے۔ ایسے حالات میں ریاض حنفی کی شاعری صحرا میں ایک ابر کے ٹکڑے کی طرح ہے۔ ریاض کا تخلیقی شعور کسی ایک خاص جہت یا ازم کا پابند نہیں ہے بلکہ ان کی نگاہ پوری کائنات پر ہے۔'' ریاض حنفی کا ایک شعر۔

ٹھوکریں کھا کے جو گرتے ہیں سنبھل جاتے ہیں
ایسے اشخاص بہت آگے نکل جاتے ہیں

میرا شہر نور پور

ریاض حنفی نور پور

ضلع بجنور میں قصبہ نور پور کی قدیم آبادی (نیر پور) کے نام سے ایک گاؤں کی شکل میں بان ندی کے کنارے پل کے نزدیک دہلی روڈ پر اس جگہ واقع تھی جہاں سے ایک اور راستہ جدا ہو کر نوگانواں سادات ہوتا ہوا امروہہ پہنچتا ہے کہتے ہیں کہ نور پور کا پہلا نام (نیر پور) بھی اسی ندی میں نیر پانی بہنے کی مناسبت سے رکھا گیا تھا جو بعد میں اپنی ہیئت تبدیل کر کے نور پور ہو گیا۔ اس جگہ کا کچھ حصہ آج بھی کھیڑے کی شکل میں موجود ہے جس کی مٹی میں شامل کنکریٹ دیکھ کر لگتا ہے کہ ضرور یہاں کسی زمانے میں کوئی آبادی رہی ہوگی آج یہاں اینٹوں کا ایک بہت بڑا کارخانہ موجود ہے جسے ہم عرف عام میں اینٹ بھٹہ کہتے ہیں کچھ رہائشی مکانات اور دکانوں کی تعمیر بھی عمل میں آچکی ہے۔ نور پور کب اور کیسے آباد ہوا، اس تعلق سے تاریخ کے اوراق تو قطعی طور پر خاموش ہیں مگر نسل در نسل چلی آ رہی کہاوتوں سے پتہ چلتا ہے کہ 1700 صدی عیسوی کے اوائل میں یعنی غالباً تین سو سال قبل (نیر پور) نام کے اس گاؤں میں طاعون کی مہلک وباء نے اتنی شدت اختیار کی کہ ایک ایک دن میں کئی کئی اموات ہو جایا کرتی تھیں جس کے سبب باشندگان (نیر پور) کو نقلِ مکانی پر مجبور ہونا پڑا۔ انجام کار یکے بعد دیگرے تمام اہل (نیر پور) اک ایسی سرزمین پر آ کر آباد ہو گئے۔ جو ایک خوفناک بن کی شکل میں دور تک پھیلی ہوئی تھی اور جس کے جسم پر لاتعداد گہرے تالاب اور گڑھے موجود تھے سب تو نہیں مگر آج بھی کئی تالابوں کے نام زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ جیسے سیتلا والی، جامن والی، کالا جوہڑا، کھڑکا والی، ہلا والی، ڈوبیلا، دریا والی، ہتے والی اور ٹیٹ کولی

وغیرہ۔ جیسے جیسے (نیر پور) سے نور پور میں تبدیل ہونے والی اس چھوٹی سی بستی نے ارتقائی مراحل طے کئے یہاں پھیلے ہوئے تمام جوہڑ اور تالاب بھوڑ کی سرخی مائل مٹی یعنی اُس ریت سے اٹتے چلے گئے جو نور پور اور موضع ابریم پور (ڈھولہ گڑھ) کے درمیان اونچے اونچے ٹیلوں کی شکل میں دیکھنے والوں کو دعوتِ نظارگی عطا کرتی تھی جسکے بہت سے باقیات ونشانات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں یہاں خونخوار جنگلی جانوروں یعنی شیر اور بھیڑیوں کی موجودگی کے واقعات بھی خوب دوہرائے جاتے ہیں۔ آج بھی تھانے کے سامنے روڈ کے دونوں کناروں پر ایستادہ کدم کے دو تناور درخت اور جونیر ہائی اسکول کے صحن میں کھڑا برگد کا ایک بہت بڑا پیڑ اُسی قدیم زمانے کی یادگار بتائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گھنے جھاڑ جھنکاڑ اور اوبڑ کھابڑ راستوں کے سبب یہ سرزمین کبھی کسی جاگیردارانہ نظام کا حصہ نہیں رہی جبکہ قریبی موضع پپلہ جاگیر، موضع ٹھیری، اور بجنگلہ وغیرہ سید شہادت حسین، سید آل حسن ساکنانِ امرہہ اور گھمنڈی لال ساکن چاند پور کی ملکیت تھے، اور کئی ہزار بگھہ زمین پر ان جاگیرداران کا تسلط قائم تھا جبکہ سرزمینِ نور پور ایک آزدانہ حیثیت رکھتی تھی، نور پور میں سب سے پہلے بسنے والے آدھین چھدا کے آباء واجداد تھے جن کا تعلق خمرا برادری سے تھا جو ایک ٹیلہ نما جگہ پر اسلئے آکر آباد ہوئے تھے تاکہ سیلاب وغیرہ کے خطرے سے محفوظ رہ سکیں نور پور کی سب سے پہلی مسجد بھی اِسی خمرا برادری کی تعمیر کردہ (دومنزلہ مسجد) ہے۔ جو مسجد سے پہلے ایک بیٹھک ہوا کرتی تھی اسی مسجد سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلہ پر پورب اور دکھن کی سمتوں کے درمیان نور پور کا سب سے پراچین مندر (چھوٹا کنواں) شیو مندر ہے جسے شوالہ مندر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مندر برہمن برادری سے تعلق رکھنے والے روشن لال پنڈت کے آباء واجداد کا تعمیر کردہ بتایا جاتا ہے، جو محل والوں کے نام سے جانے جاتے تھے۔

سکھ برادری میں سب سے پہلے نور پور کی سرزمین پر بسنے والے خاندانِ منشی بھوپ سنگھ کے بزرگ، نانک سنگھ کے آباء واجداد اور چودھری موہن سنگھ کے پریوار۔ کے افراد آکر آباد ہوئے، نور پور کی قدیم سماجی اہم شخصیات میں منشی مدار بخش سیٹھ بلاقی بنجارہ جو محل والوں کے نام سے مشہور ہوئے، اور ویدھ جگنندن پرساد بتائے جاتے ہیں۔ (واضح ہو کہ نور پور کی سرزمین پر مسلم بنجارہ

برادری میں سیٹھ بلاقی خاندان اور ہندو برہمن برادری میں پنڈت روشن لال پریوار دونوں محل والوں کے نام سے مشہور ہوئے۔)

آزادی کے بعد نور پور کے پہلے مکھیہ چودھری مہر سنگھ منتخب کئے گئے جو جاٹ برادری کے ایک ذمہ دار فرد تھے، اس کے بعد پردھانی کا دور شروع ہوا جس میں سب سے پہلے پردھان حکیم الدین انصاری دوسرے پردھان چودھری نریندر پال عرف (ننڈو) تیسرے پردھان احمد رضا مکرانی اور چوتھی بار ڈاکٹر کرشن کمار شرما پردھان بنے ڈاکٹر کرشن کمار کے زمانے میں ہی چودھری شیوناتھ سنگھ ایم.ایل.اے. اور محمد صدیق عرف گاما (ٹھیکیدار) کی مشترکہ کوششوں سے نور پور گرام پنچایت سے نگر پالیکا کی شکل میں تبدیل ہوا1989 میں نگر پالیکا کا پہلا چناؤ عمل میں آیا اور قطب الدین انصاری عرف (ٹلّو) نور پور نگر پالیکا کے پہلے چیرمین منتخب ہوئے۔ موجودہ عہد میں یہ خوبصورت قصبہ چالیس بیالیس ہزار کی آبادی پر محیط ہے۔

چناؤ کے بعد اس بستی نے آبادی کے لحاظ سے بہت تیزی کے ساتھ ترقی کی طرف پیش قدمی کی، 2012 میں دوسری مرتبہ نور پور کو اسمبلی سیٹ کا درجہ حاصل ہوا، اور نور پور اسمبلی حلقہ سے لوکیندر چوہان (بی.جے.پی.) ایم.ایل.اے. منتخب کئے گئے یہاں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی یعنی تمام رنگ و نسل اور برادریوں کے لوگ محبت و پیار سے رہتے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے آئے ہیں۔ مختلف اقسام کے پھولوں کا یہ شاندار گلدستہ اسلئے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہاں سے مختلف سمتوں میں سات شاہراہیں یعنی بڑے راستے نکلتے ہیں جن کی بدولت اس قصبہ کو ایک ایسی مرکزی حیثیت حاصل ہوئی جو کم شہروں کے حصے میں آتی ہے، جس کے سبب یہاں ریلوے سہولیات نہ ہوتے ہوئے بھی کسی قسم کی آمد و رفت میں دقت یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، قصبہ نور پور (صدر مقام) ضلع بجنور سے سینتس کلومیٹر کے فاصلہ پر مشرق میں بجنور اور مراد آباد کے درمیان سے کچھ پہلے ہی واقع ہے، اور تحصیل چاند پور میں آتا ہے، اس قصبے کو تاریخی حیثیت 1942 کی تحریکِ آزادی سے اس وقت ملی جب 16/ اگست 1942 کو یہاں تحریکِ آزادی میں حصلہ لینے والے جانبازوں کے ایک جلوس نے پولس تھانے پر (یونین جیک) یعنی

انگلینڈ کا جھنڈا ہٹا کر ہندوستان کا ترنگا لہرانا چاہا جسکی نہ صرف پولس کے ذریعہ مخالفت کی گئی بلکہ مجاہدین پر گولیاں چلا کر ان کے سینوں کو چھلنی کرنا شروع کر دیا گیا، نتیجے کے طور پر آزادی کے متوالوں میں پروین سنگھ موقع پر ہی شہید ہو گئے اور رِکھی سنگھ کو زخمی حالت میں بجنور لے جایا گیا جہاں ان کی زندگی بھی دیر تک وفا نہ کر سکی اور وہ بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ تحریکِ آزادی کے اس جلوس میں تقریباً پندرہ سو جاں نثاروں نے اپنی شرکت درج کرائی تھی موجودہ دور میں پولس تھانہ کے قریبی محلہ کا نام (شہید نگر) شہید پروین سنگھ کے نام پر رکھا گیا ہے اور یادگار کے طور پر ایک شہید اسمارک بھی بنوا دیا گیا ہے، جہاں ہر سال 16/اگست کو (پروین سنگھ کا میلہ) کے نام سے ایک شاندار تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے، جسمیں ضلع بجنور کی مقتدر شخصیات شرکت فرما کر اپنی عقیدت کا اظہار کر تی ہیں مجھے نہیں معلوم کہ یہ شعر کس کا ہے اور کس موقع پر کہا گیا ہے، مگر مجھے اس کا اطلاق یہاں بے حد موزوں لگا :

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے   وطن پر مٹنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

نور پور کی سرزمین پر جنم لینے والی قدیم ادبی شخصیات کے مفصل تذکرہ کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے علیحدہ سے ایک تصنیف کی ضرورت ہے۔ یہاں مضمون کے اختصار کے پیشِ نظر ان ادبی شخصیات کے اجمالی تعارف پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

گوہر نور پوری: ضلع بجنور کا گوہرِ نایاب گوہر نور پوری کا اصل نام فضل الرحمٰن تھا گوہر نور پوری کے نام سے مشہور ہوئے، آپ کی ولادت 12/دسمبر 1936 کو دھلی کے صدر بازار میں ہوئی، والدِ محترم بشیر احمد انصاری کپڑے کی تجارت کے سلسلے میں دھلی رہا کرتے تھے، جب کہ نسبی تعلق نور پور سے ہی ہے، گوہر نور پوری نے اپنے ننھیال چاند پور میں اردو، عربی اور گلستاں تک فارسی کی تعلیم حاصل کی نوعمری میں ہی والد کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ منقطع کر کے تلاشِ معاش میں احمد آباد تشریف لے گئے احمد آباد میں حاذق اندوری کی قربت نے آپ کے شعری ذوق کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا، احمد آباد سے لوٹ کر آپ نے چاند پور کو اپنا مسکن بنایا۔ 1952 میں اپنے آبائی وطن نور پور میں سکونت اختیار کی 1959 سے 1964 تک کا

عرصہ بمبئی میں گذارا جہاں آپ کی ملاقات منیر الہ آبادی سے ہوئی انہیں سے آپ نے شرفِ تلمذ حاصل کیا، مختلف اخبارات و رسائل میں آپ کی تخلیقات برابر شائع ہوتی رہیں، نعتیہ شاعری کا مجموعہ ''حسنِ تخیل'' شائع ہوا، ''کلیات گوہر'' عنقریب منظرِ عام پر آنے والی ہے، 13/ فروری 1995 کو گوہر نورپوری مالکِ حقیقی سے جاملے۔

ذاکر نورپوری: پیکرِ خلوص ذاکر نورپوری 1951 کو نورپور کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے آپ کے والد اشفاق حسین ایک علمی شخصیت تھے۔ آپ نے مقامی اسکول سے مڈل پاس کیا 1953 میں گوہر نورپوری کے سامنے زانوئے ادب تہ کر کے شعری سفر کا آغاز کیا۔ ذاکر نورپوری کو پیش آنے والے ایک تاریخی سانحہ نے انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا تھا اور غالباً یہی جاں گسل صدمہ ان کی موت کا سبب بنا، ہوا یوں کہ ان کا تمام تر شعری سرمایہ جو ایک ضخیم بیاض میں محفوظ تھا، اچانک گھر سے غائب ہو گیا۔ خونِ جگر سے وجود پانے والی تخلیقات کے اس طرح تلف ہو جانے سے ذاکر نورپوری حد سے زیادہ غمگین رہنے لگے تھے۔ اسی کے چلتے 2000 بروز جمعہ کو یہ عظیم شاعر اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

مہر نورپوری: روایتوں کے پاسدار مہر نورپوری کا اصل نام اشتیاق حسین تھا، ادبی شناخت مہر نورپوری کے نام سے پائی، آپ 24/ مئی 1927 کو پیدا ہوئے، والدِ محترم کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ درس و تدریس کے شعبہ میں آپ سرکاری ملازم رہے۔ مختلف مواضعات و قصبات میں آپ نے بحیثیت استاذ بہترین خدمات انجام دیں۔ آپ کو منفرد لب و لہجہ کا ایک نمائندہ شاعر تسلیم کیا جاتا ہے، ابھی آپ کا کوئی شعری مجموعہ اشاعت پذیر بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے 19/ مارچ 1984 کو آپ کا انتقال ہو گیا، اگر اربابِ فکر و فن مہر نورپوری کے کلام کو یکجا کر کے کتابی شکل میں لے آئیں تو یہ مہر نورپوری کیلئے بڑا خراجِ عقیدت ہوگا۔

صادق نورپوری: صادق نورپوری کا اصل نام محمد صدیق تھا۔ دنیائے شعر و ادب میں صادق نورپوری کے نام سے مشہور ہوئے، 1930 کو نورپور کے ایک معزز گھرانے میں

پیدا ہوئے، والد ماجد مولا بخش اپنے وقت کے ایک با اثر انسان تھے، شعری سفر کا آغاز زمانۂ طالب علمی سے ہی 1945 میں اس وقت ہوا جب آپ کی عمر محض پندرہ سال تھی، حکیم کٹھوروی سے اصلاحِ سخن کے ساتھ ساتھ حکمت کا درس بھی لیتے رہے اور حکیم صادق نور پوری کہلائے، نور پور میں شعر و ادب کی بقا کے لئے آپ نے کارہائے نمایاں انجام دئے، مطروحہ مصرعوں پر شعر کہنا اور دوسرے شعرا کو بھی اس تحریک میں شامل رکھنا آپ کا وصفِ خاص تھا 27/مارچ 2004 کو داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

سردار تارا سنگھ: سردار تارا سنگھ 1933 کو ضلع امروہہ کے موضع سرکڑا کمال میں پیدا ہوئے، جو اس وقت ضلع مراد آباد کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ یہیں پر تعلیم کی ابتداء ہوئی، ان کے والد سردار ارجن سنگھ گردوارہ میں ملازم تھے، تارا سنگھ نے 1962 میں ایم.اے کیا اور سکھ انٹر کالج نارنگ پور میں بحیثیت ٹیچر تقرر ہوا 1964 میں نور پور کی سکھ برادری کے مکھیہ سردار بتو سنگھ کی کوششوں سے خالصہ انٹر کالج میں بحیثیت پرنسپل تقرری عمل میں آئی، تارا سنگھ کی مساعیٔ جمیلہ نے خالصہ انٹر کالج کو تعلیمی و تعمیری ترقیات سے ہم کنار کیا، 1992 میں آپ کو صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے ہاتھوں سب سے بڑے علمی اعزاز (راشٹر پتی پرسکار) سے نوازا گیا، آپ کی پہلی کتاب ''منتھن'' (کویتاؤں پر مشتمل) 2000 میں منظر عام پر آئی، دوسری کتاب زیرِ ترتیب ہے، آپ پرنسپل کے عہدے سے ریٹائرمنٹ کے بعد گرو تیغ بہادر کے نام سے اپنا ذاتی اسکول چلانے میں مصروف ہے۔

زبیر نور پوری: زبیر نور پوری کا اصل نام زبیر احمد انصاری تھا، جہانِ شعر و ادب میں زبیر نور پوری کے نام سے پہچانے گئے آپ کی پیدائش 20/جولائی 1954 کو قصبہ نور پور میں ہوئی، والد ماجد کا نام حکیم اللہ انصاری تھا، اوائل عمری سے ہی شعر و سخن کی طرف مائل ہو گئے تھے، گوہر نور پوری سے اصلاحی تعلق قائم ہوا تو باقاعدہ مشقِ سخن فرمانے لگے بعدہٗ آپ نے قیامِ دہلی کے دوران مشیر جھنجھانوی اور قیام ممبئی کے دوران محمود الحسن ماہر کے گراں قدر مشوروں سے بھی استفادہ کیا۔

پہلا شعری مجموعہ کلام ''زندگی کے روبرو'' 2006 میں منظرِ عام پر آیا، دوسرے مجموعہ کلام کو

منظرِ عام پر لانا چاہتے تھے لیکن زندگی نے وفا نہ کی، 21 رجولائی 2015 کو حرکتِ قلب بند ہو جانے کے سبب آپ مالکِ حقیقی سے جا ملے، زبیر نور پوری شعروادب کیلئے خود کو وقف کئے ہوئے تھے، مختلف اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی، زبیر نور پوری کی شعری تخلیقات میں حمد و نعت، نظمیں، قطعات، سلام وغزلیات ایک بڑی تعداد میں غیر مطبوعہ ہیں، اور اشاعت کی منتظر ہیں، خدا کرے زبیر نور پوری کا یہ شعری سرمایہ طبع ہو کر منظر عام پر آجائے۔

ہاشم قیصر: اصل نام محمد ہاشم تھا، ہاشم قیصر کے نام سے ادبی تعارف حاصل کیا، 1959 میں پیدا ہوئے، نور پور میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں میں شامل رہتے تھے، گوہر نور پوری سے مشورۂ سخن لیتے رہے، شعری ذوق کی آبیاری کے حوالے سے ہاشم قیصر ادبی دوستوں میں ایک ادبی دوست سمجھے جاتے تھے، آپ کا انتقال 16 رجون 2012 میں ہوا۔

اس وقت نور پور کے ادبی منظر نامہ پر جو شعراء اپنی شناخت قائم کئے ہوئے ہیں، ان میں:

نفیس پرویز: جو سیاسی سرگرمیوں میں منہمک رہتے ہوئے بھی شاعری جیسی لطیف صنفِ سخن میں تازہ کاری کے لئے جانے جاتے ہیں۔

شاہد انجم: ان چھوٹے مضامین کو شعر بنانے والا یہ شاعر اپنی جدید فکری امیج کے لئے الگ سے شناخت کیا جاتا ہے۔

عبدالغفار صدیقی: دنیائے شعروادب میں دانش نور پوری کے نام سے اپنا تعارف کرانے والی یہ لائق رشک شخصیت بے انتہا مخلص وملنسار، جتنے اچھے صحافی وشاعر اس سے کہیں زیادہ عمدہ انسان، آپ کا پہلا نعتوں پر مشتمل شعری مجموعہ ''نورِ حرا'' منظرِ عام پر آکر مقبولیت کی منازل طے کر چکا ہے، غزلیات پر مشتمل دوسرا شعری مجموعہ ''زیرِ ترتیب ہے، جو عنقریب آپ کے سامنے ہوگا۔

ڈاکٹر شاطر: آسمانِ شعروادب کی اس خوبصورت کہکشاں کا نام ہے جسے انگنت ستاروں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت قائم رکھنے کا فن آتا ہے۔

علی اکرم: جو شعری لوازمات کو اسطرح برت رہا ہے کہ بیک وقت رومانی، سماجی، مذہبی، سیاسی موضوعات سمیٹے اس کی غزل ایک منفرد لہجے کی عکاس بن گئی ہے۔

ماسٹر ہاشم حصیری: جن کا لہجہ سخن فہم حضرات کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کافی حدتک کامیاب نظر آرہا ہے۔

اسرار الحق قاسمی: صحافت اور شاعری کے حوالے سے دو متضاد سمتوں میں اس طرح توازن قائم رکھے ہوئے ہیں کہ کسی ایک کا بھی وقار مجروح نہیں ہونے دیتے۔

ثمر جعفری: اپنے شعری ''تجربات و مشاہدات'' احساسات وجذبات کی بھرپور نمائندگی اردو کے شہر دہلی کی سرزمین پر رہ کر جاری وساری رکھے ہوئے ہیں۔

جوہر نورپوری: دنیائے شعروادب کا وہ خوبصورت اور حسین چراغ ہے جسے تیز ہوا میں جلنے کا ہنر اپنے والدِ محترم گوہر نورپوری سے وراثت میں دستیاب ہوا۔

حکیم سعید: کے شعری تجربات سے عوام وخواص اپنے شعری ذوق کی تسکین کررہے ہیں۔

مولانا عبدالقیوم: جمیل جن کی شاعری نہ صرف متاثر کن ہے بلکہ ان کے اصلاحی لب ولہجہ سے مزید توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

نعیم راجہ: اور اسرار عدیل کا تعلق بھی اس قبیل سے ہے جو ادبی افق پر چمکنے کیلئے اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں راقم الحروف (ریاض حنفی) کا تعلق بھی اسی سرزمین نورپور سے ہے۔

محلّہ حضرت نگر، نزد مدینہ مسجد نورپور

رابطہ: 9759242219

بجنوری صحافت کا آفتاب

ڈاکٹر آفتاب نعمانی

ڈاکٹر شیخ نگینوی

بجنور ضلع نے اردو صحافت کو برصغیر کے مشہور و معروف صحافی دیے ہیں۔ بیسویں صدی میں مولانا مجید حسن، مولانا مظہر الدین شیر کوٹی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا محمد علی جوہر (ہمدرد) علامہ تاجور نجیب آبادی، محمد خلیل بجنوری، (الخلیل) جیراج سنگھ (تحفہ ہند) محمد عثمان فارقلیط (فاران) شمس کنول (گگن) افسر جمشید (یزدان)، نشتر خانقاہی، (روزنامہ خبر جدید) اکبر شاہ خاں (عبرت) اظہار اثر (چلمن) اور اکیسوی صدی میں نعیم کوثر (صدائے اردو) معین شاداب (عالمی سہارا چینل) ارشد ندیم (ہمارا سماج) شمشاد فلاحی (حجابِ اسلامی)، سراج الدین ندوی (تفہیمات)، ڈاکٹر شمع افروز زیدی (بیسوی صدی) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ضلع سطح پر موجودہ دور میں اردو صحافت میں، بجنور شہر میں ڈاکٹر جمیل احمد، حسنین نقوی، مرزا طالب بیگ، عابد رضا، کرت پور میں قاری مہربان، محمد ساجد قاسمی، مولانا کفیل الرحمٰن، نہٹور میں ظہیر ربانی، اسلم صدیقی، دھامپور میں غیاث دھامپوری، شمشاد ندیم، خورشید خاں، قاری راشد حمیدی، ایم اے کنول جعفری، شیرکوٹ میں فصیح اللہ عباسی، عقیل احمد، محمد آصف قاسمی، نور پور میں اسرار الحق قاسمی، چاند پور میں نعیم پرویز، شاہد قاسمی، سیوہارہ سے حسین الدین، افضل گڑھ میں الطاف صابری، محمد اختر صدیقی، نگینہ میں پرویز عادل ماحی، ڈاکٹر شیخ نگینوی، انور محمود، نجیب آباد میں ڈاکٹر آفتاب نعمانی، مرغوب حسین ناصر، مولانا مہتاب نعمانی کے اسم گرامی سامنے آتے ہیں۔ 1893 میں مہر

نیم روز، ضلع بجنور کا پہلا اردو اخبار شائع ہوا تھا۔ اسکے بعد بڑی تعداد میں ہزاروں کا سرکولیشن والے اخبار یہاں سے شائع ہوئے۔ لیکن صد افسوس اکیسوی صدی کی دوسری دہائی میں بجنور ضلع سے ایک بھی اردو اخبار شائع نہیں ہو رہا ہے۔ اور یہاں کے اردو قارئین دہلی میرٹھ، اور لکھنؤ کے اخبارات سے استفادہ کر رہے ہیں۔

ضلع بجنور اردو صحافت کا ایک معتبر نام ڈاکٹر آفتاب نعمانی ہے۔ جن کی ولادت 1968 میں نگینہ میں ہوئی۔ آپکے والد نامور خطیب مولانا شمس الدین چترویدی ثم نگینوی مدرس ہو کر نگینہ سے نجیب آباد منتقل ہو گئے۔ اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ڈاکٹر آفتاب نعمانی کی تعلیم نجیب آباد اور سہارنپور سے ہوئی۔ فروغ اردو کے لئے ہمیشہ سرگرم رہنے والے ڈاکٹر آفتاب نعمانی نے بہت کم عمر 80 کی دہائی سے صحافت کا آغاز کیا۔ گزشتہ 16 برس سے روز نامہ راشٹریہ سہارا کے نمائندہ ہیں۔ سہارا میں بجنور ضلع کی سب سے زیادہ کوریج نجیب آباد کی ہوتی ہے۔ وہ بے باکی کے ساتھ اپنے قلم کو اٹھاتے ہیں، نجیب ٹائمز میگزین، راشٹریہ سنتوش، گیت غزل سنگم کے ایڈیٹر کی ذمہ داری نبھا چکے ہیں۔ نجیب ٹائمز میگزین کے اسوقت بھی ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں۔ کئی اخبارات کے نمائندوں کی سرپرستی بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شناخت خود الگ بنائی ہے۔ پیشے سے طبیب آفتاب نعمانی نے 1985 میں معروف شاعر عقیل نعمانی (بریلی) کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا اور معروف شاعر مہندر اشک نجیب آباد سے بھی انھوں نے اصلاح لی۔ اردو کی محفلیں سجانا، شاعروں اور ادب نوازوں کا اعزاز کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

ڈاکٹر آفتاب نعمانی کے کلام میں روایت کا احترام ہے اور جدت کی بھی پاسداری پائی جاتی ہے۔ آپ اپنی غزلوں میں آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ آپ کا کلام خواص و عام کے دل کی آواز بن جاتا ہے۔ شاعری صحافت اور اردو کی خدمات انجام دینے پر آپ کو فخر اردو اعزاز، بے باک صحافی ایوارڈ، شکلا ایوارڈ، سے بھی نوازہ جا چکا ہے۔ نجیب آباد میں آپ کے اعزاز میں ایک مشاعرہ بھی ''جشن آفتاب'' کے عنوان سے منعقد کیا جا چکا ہے۔ آپ گیت غزل سنگم اکیڈمی کے صدر ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو نجیب آباد سے گزشتہ تیس برس

سے مسلسل پروگرام نشر ہوتے رہتے ہیں۔ نجیب آباد کے شعراء پر ایک مجموعہ ''آفتاب نجیب آباد'' کے نام سے ترتیب دے چکے ہیں۔

❖❖❖

نجیب آباد کا ادبی منظر نامہ

ڈاکٹر آفتاب نعمانی

نجیب آباد مغربی اتر پردیش کا ایک تاریخی شہر ہے اور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس شہر کو شمالی ہندوستان کے مشہور اور قابل تعظیم افغانی پٹھان نجیب خاں نے 1755 میں مالن ندی کے کنارے بسایا تھا۔ عالمگیر ثانی کے دور حکومت میں جیت سنگھ ڈاکو کو مار کر جب نجیب خاں نے گنگا پار کا علاقہ اپنے علاقہ میں ملایا تھا، تب بادشاہ کی جانب سے نجیب خاں کو نجیب الدولہ امیر الامرا کے خطاب سے نوازہ گیا تھا نجیب آباد کو نواب نجیب الدولہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ نجیب آباد بدنام زمانہ سلطانہ ڈاکو کے نام سے بھی مشہور ہے۔ نجیب آباد میں واقع پتھر گڑھ کے قلعہ کا استعمال انگریزوں کی حکومت کے دوران سلطانہ ڈاکو نے کیا تھا۔ تب سے ہی قلعہ سلطانہ ڈاکو کے نام سے مشہور ہو گیا۔

جب ہم نجیب آباد کی تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نجیب آباد علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور اسکی زمین بھی زرخیز رہی ہے۔ نجیب آباد کی دھرتی نے اپنی کوکھ سے جہاں مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی، اختر الایمان جیسے جید ادیب، شاعر ہی پیدا نہیں کیے ہیں بلکہ جہاں شفیق بانو شفیق جیسی افسانہ نگار اور ناول نگار پیدا کی ہیں وہیں کفایت حسین ناز نجیب آبادی، عرفی خاں اور عبد السلام عاصی جیسے معتبر استاذ پیدا کیئے تو اختر صابری، عشرت زماں خاں افسر، اشرف شمیم وارثی، سوز نجیب آبادی عروض داں بھی پیدا کیے۔ اسکے ساتھ ہی مجاہد آزادی شکیل رحمانی، محمد اجمل خاں ایڈووکیٹ، رام اوتار مضطر، مخفی نجیب

آبادی، رشید احمد نجیب آبادی اور ہندی کوی دشینت کمار تیاگی نے بھی نجیب آباد کا نام ملک کے ہر خطہ میں روشن کیا ہے۔

نجیب آباد کی ادبی تاریخ پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آباد نے تین جلدوں میں تاریخ اسلام لکھ کر دنیا کو علم کی روشنی سے منور ہی نہیں کیا بلکہ تاریخ اسلام میں ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جس سے آج تک فرزندان توحید فیضیاب ہو رہے ہیں وہ اردو کے ایک عظیم تاریخ داں، ادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باصلاحیت محقق بھی تھے۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کا 1942 نجیب آباد میں انتقال ہوا۔

علامہ تاجور نجیب آبادی کا اصلی نام احسان اللہ خاں ہے۔ جنھوں نے اردو ادب میں اپنے فن کا لوہا منوایا۔ حفیظ جالندھری سے انکی ادبی نوک جھوک ہوتی رہتی تھی وہ بلا کے ذہین تھے ان کے شاگرد کرپال سنگھ بیدار نے ان کے شعری سرمائے کو نظر میں رکھتے ہوئے کہا تھا۔

اب محفل سخن میں کوئی سحر گر کہاں
شاعر تو سیکڑوں ہیں مگر تاجور کہاں

علامہ تاجور لاہور چلے گئے تھے وہیں اپنی تعلیم مکمل کی اور دین دیال کالج میں پروفیسر ہو گئے اور پاکستان میں 30 جنوری 1951 کو انتقال ہو گیا۔ علامہ تاجور کا کلام۔

خدا مجھ کو تجھ سے ہی محروم کردے
جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں
میں کیا چاہتا ہوں؟ بتاؤں تمہیں کیا؟
میں خود سوچتا ہوں میں کیا چاہتا ہوں

انہوں نے کہا:

تم سنتے ہیں محفل اغیار میں طعنے
وہ تم ہی تھے جو پی گئے سُن کر! نہ ہوا میں

نظمیہ شاعری کے میدان میں اختر الایمان اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی ہے انہیں ان کی شعری مجموعہ ''یادیں'' پر ساہتیہ اکادمی نے اعزاز سے سرفراز بھی کیا ہے اسکے علاوہ انھیں بہترین مکالمے کیلئے فلم فیئر ایوارڈز بھی ملے۔ادب اور نظم دونوں سے ان کی گہری وابستگی رہی ہے ان کے شعری مجموعوں میں گرداب، تاریک سیاہ، آبجو، نیا آہنگ، سروسامان، زمین زمین وغیرہ ہیں۔ان کی ایک خودنوشت ''اس آباد خرابے میں'' عنوان سے 1996 میں کتاب شائع ہو چکی ہے جو کہ بہت ہی مقبول ہوئی۔ان کی نظمیہ شاعری کو معتبر قارئین نے بھی سراہا ہے۔ان پر بہت کچھ تحریر کیا جا چکا ہے اور کئی تحقیقی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں اور کئی رسالوں کے خصوصی نمبر بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اختر الایمان نے بچپن ہی میں نجیب آباد سے ممبئی کا رخ کیا اور وہیں پر اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اور فلمی دنیا سے جڑ کر نجیب آباد کا نام پورے ملک میں روشن کیا

موجودہ دور میں مرغوب علی، اسلام الدین جلیس نجیب آباد، مہندر اشک اردو ادب کی بے پناہ خدمت کر رہے ہیں، جلیس نجیب آباد نصف درجن کتابوں کے مصنف ہیں جن میں شہر خیال، موسم موسم، برگ آفتاب، تذکرہ سیدنا یوسفؑ۔ قحط اور بارشیں اور صبح کرنا شام ہیں ان کی چار کتابوں پر اتر پردیش اردو اکادمی اعزاز سے نواز چکی ہے۔جلیس نجیب آباد کے یہاں شاعری میں ایک معیار ملتا ہے۔نظموں میں بھی انہیں کمال حاصل ہے۔جلیس نجیب آبادی ایک معتبر شخصیت کا نام ہے۔(تفصیلی تعارف دبستانِ بجنور کی جلد اول کے صفحہ 216 پر ملاحظہ فرمائیں)

مرغوب علی جو کہ ڈیڑھ درجن کتابوں کے مصنف ہیں جن میں آدھی رات کی شبنم، انتخاب کلیات ن۔م۔راشد، سفر کہانی، میراجی کی نظمیں، فیض احمد فیض احوال وافکار، پروین شاکر احوال افکار، لفظ شاعری میں چاند، ایک اور بٹوارہ وغیرہ شامل ہیں انکی دو کتابوں پر اردو اکادمی انہیں اعزاز سے سرفراز کر چکی ہے۔ وہ ایک بہترین ادیب، افسانہ نگار اور نقاد بھی ہیں درجنوں کتابوں پر ان کے تبصرہ کتابوں کی زینت بن چکے ہیں۔

مہندر اشک بھی مشاعروں کے حوالے سے ایک معتبر شخصیت کا نام ہے استاذ شعراء میں انکا شمار ہوتا ہے وہ ملک ہی نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی نجیب آباد کا نام روشن کر چکے ہیں۔

انکے دو مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں ''دھوپ اس پار کی'' اور ''گنگا آنسوؤں کی'' شامل ہیں۔ انھوں نے شاعری کے معیار سے کبھی بھی سمجھوتا نہیں کیا ہے بل کہ معیار اور وقار کو بلند رکھا ہے۔ وہ جتنے اچھے شاعر ہیں اس سے کہیں زیادہ مخلص انسان بھی ہیں۔

مزاحیہ شاعری میں عزیز نجیب آبادی بھی اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں انہوں نے مزاحیہ شاعری میں ہر موضوع کو عنوان بنایا ہے۔ ان کے مجموعہ 'ڈنکے کی چوٹ'، 'اور کیا سمجھے؟' منظر عام پر آچکے ہیں عزیز نجیب آبادی نے سماج کی خامیوں اور بے راہ روی کو محسوس کیا اور اپنے مزاحیہ انداز میں عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے انھوں نے اپنے کلام کے ذریعہ تلخ سچائیوں کو بھی مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے جولائی 2016 میں ان کا انتقال ہوا۔

ظفر رحمانی کا بھی استاذ شعرہ میں شمار ہوتا ہے انھوں نے اپنی زندگی کی مصروفیت کے باوجود اردو ادب کی خدمت کی ہے۔ نئی نسل کے شعراء کی انھوں نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ ان کے یہاں بھی شاعری میں معیار پایا جاتا ہے لفاظی سے پرہیز کرتے ہیں۔

فن خطابت میں مولانا شمس الدین نعمانی چترویدی پورے ملک میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ پورے ملک میں ہندو مسلمان سبھی مزاہب کے لوگ ان کا احترام کرتے ہیں اور خطاب کو سنے بھی آتے ہیں انھوں نے اپنی تمام تر زندگی کو اتحاد کے پیغام کیلئے وقف کر رکھا ہے اور نجیب آباد کو بلندی عطا کی ہے۔ انکی تصنیف ''اتم مہا پرش'' پورے ملک میں مشہور ہے وہیں مولانا زبیر عالم نے بھی بہت کم عمر میں خطابت کے میدان میں نجیب آباد کے نام کو روشن کیا ہے۔ مفتی اسرار احمد ''دانش'' کی تصانیف ''نعت وسلام''، ''حیات شیخ عبدالرحیم''، ''یادِ مرشد''، ''آئینۂ حج'' وغیرہ منظر عام پر آچکے ہیں وہ بھی ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

عشرت زماں خاں افسر نجیب آبادی اردو ادب میں وہ میل کا پتھر تھے جس کا ثانی کوئی نہیں ہوا۔ عشرت زماں خاں کے یہاں باقاعدہ اردو کی کلاس لگائی جاتی تھی۔ اردو ادب اور فن شاعری کو سکھایا جاتا تھا۔ انھوں نے بہت سے شاگرد پیدا کیئے ان کے یہاں بہت ہی سادگی خوش اخلاقی اور ملنساری پائی جاتی تھی وہ بلا کے شعر کہتے تھے اور فن عروض میں مہارت بھی رکھتے تھے اتنا

ہی نہیں ان کے دل میں قوم کا درد پنہا تھا وہ جہاں بچوں کو اردو کی تعلیم دلاتے تھے وہیں ان کے روشن مستقبل کی فکر میں لگے رہتے تھے اور اپنی جیب خاص سے سیکڑوں بچوں کو ادیب کا امتحان دلاتے تھے انھوں نے نجیب آباد میں جامعہ اردو علی گڑھ کا سینٹر بھی قائم کیا تھا وہ میونسپلٹی میں ملازم تھے اور اپنی تنخواہ کا زیادہ تر حصہ قوم کے بچوں کا مستقبل سنوارنے میں صرف کرتے تھے۔

مجاہد آزادی شکیل رحمانی نے بھی اردو ادب کی خدمت کی ہے ان کی تین کتابیں ''عکسِ شعور''، ''بام ہنر''، ''ساحل سے سفینہ تک''، منظر عام پر آچکی ہیں وہ ایک بہترین مصور بھی تھے اور ایک بہترین شاعر بھی۔ ان کے یہاں بھی سچائی پائی جاتی تھی وہ جو بھی کہتے تھے صاف کہہ دیتے تھے۔ رام اوتار گپتا مضطر اردو کے بہترین شاعر تھے ان کی دو کتابیں ''سیپیوں کا سمندر''، ''سفیر آخر شب'' منظر عام پر آچکی ہے اور مقبول ہوئی۔

ڈاکٹر جرار حیدر، انور صدیقی، واحد حسین ثاقب صدیقی، کے نام بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے اردو ادب کی خدمت کی اور نجیب آباد کا نام روشن کیا۔

نئی نسل میں سرفراز صابری، مختار احمد شاد، شارق کفیل، اختر ملتانی، ڈاکٹر طیب جمال قاری شاکر رضوی، قاری شعیب نفیس، محمد شیر حسین عرفی، موصوف احمد واصف، ڈاکٹر الیاس انصاری، سہیل شہاب، اکرم جلال آبادی، قاضی وقا جلال آبادی وغیرہ نجیب آباد کے اردو ادب کو زندہ رکھنے میں نمایاں کردار ادا کر رہیں ہے اور اردو ادب کی شمع جلائے ہوئے ہیں۔ نئی نسل میں شارق کفیل جو کہ ایک اچھے ناظم کی حیثیت رکھتے ہیں اور بڑے ہی سلیقے کے ساتھ شعر کہتے ہیں انکے شعروں میں معیار پایا جاتا ہے وہ کہتے ہیں۔

زندگی اب مجھے رہا کر دے
مجھ سے اٹھتا نہیں تیرا غم اب

نئی نسل میں ڈاکٹر رفعت جہاں جو کہ ماہر تعلیمات ہیں وہ اردو ادب میں بڑی کمانڈ رکھتے ہیں انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری حاصل کی ہے اور انھوں نے ہندی غزل ساہتیہ پر اردو غزل کا پربھاو پر کتاب لکھ کر اردو سے محبت ہونے کا سچا ثبوت دیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ

اردو کے مقابلہ پر ہندی کہیں نہیں ٹھہرتی ہے انکی یہ تصنیف زیر ترتیب ہے۔

نجیب آباد ضلع بجنور کا ایک اہم اور تاریخی شہر ہے اور اسکی گنگا جمنی تہذیب پورے ملک میں مشہور ہے ہندو مسلم اتحاد کی پوری دنیا میں مثال دی جاتی ہے کیونکہ یہاں ہر مذاہب کے لوگ بڑے ہی پریم کے ساتھ رہتے ہیں سبھی ایک دوسرے کا احترام بھی کرتے ہیں۔ خدا شہر کو نظر بد سے بچائے۔

ڈاکٹر آفتاب نعمانی
مدیر، نجیب ٹائمس
محلہ واحد نگر، نجیب آباد
9837345127

صحافت کا راجہ۔ اقبال راجہ

ڈاکٹر شیخ نگینوی

صحافت لفظ صحیفہ سے نکلا ہے۔ جس کے لغوی معنی رسالہ یا مقدس کتاب کے ہیں۔ صحیفہ آسمانی کتابوں کو کہا جاتا ہے۔ یہ آسمانی کتابیں خالق کی طرف سے مخلوق کی رشد و ہدایت کی غرض سے نازل کی جاتی تھیں۔ اس لئے زمانہ قدیم میں ہر لکھی ہوئی کتاب کو صحیفہ کہا جاتا ہے۔ صحافت سے بھی صداقت اور ہدایت کی امید کی جاتی ہے۔ صحافت کا مقصد بھی ملک و معاشرہ کی تعمیر و اصلاح ہے۔ ایک کامیاب صحافی، سماج و معاشرہ کا نباض ہوتا ہے۔ اسی لئے صحافی سے امید کی جاتی ہے کہ وہ سماج کو آئینہ دکھائے اور ملک و معاشرے کی خوبیوں، خامیوں کو اجاگر کرے۔ ایک ایماندار صحافی ہر طرح کی ترجیہات تعصبات سے بالاتر ہو کر مختلف موضوعات پر غیر جانب دارانہ طریقے سے اپنے خیالات کا اظہار کرے۔ ایک سچے اور ایماندار صحافی سے یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ وہ سماج کے تمام مثبت اور منفی پہلوؤں کو من و عن قاری تک پہنچانے کی کوشش کرے۔

یہ تمہید اس لئے تحریر کی گئی ہے کیونکہ اخبار ''آئینۂ حالات'' اور اس کے مدیر اقبال راجہ پر پورے طور پر سے سٹیک بیٹھتی ہے۔ اردو کا پہلا اخبار ''جامِ جہاں نما'' 28 مارچ 1822 کلکتہ سے جاری ہوا اور ضلع بجنور سے پہلا اردو اخبار 1888 میں ''تحفۂ ہند'' چودھری جیراج سنگھ اور عبدالوحید نے شروع کیا۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ ضلع بجنور میں اردو صحافت کی جڑیں کافی مضبوط

رہی ہیں۔ لیکن تقسیمِ ہند کے بعد بہت سی سازشوں اور انگلش میڈیم اسکولوں کے فروغ سے اردو کا زوال ضلع بجنور میں بھی شروع ہوا۔ یہاں پچاس فیصد سے زیادہ عوام کی مادری زبان تو اردو رہی لیکن اردو کے قارئین کی تعداد کم سے کم تر ہوتی رہی۔ نتیجتاً اردو اخبار کی اشاعت جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا۔ لیکن ان حالات میں اقبال راجہ نے اردو دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے اردو صحافت کے میدان میں سینہ سپر ہو گئے اور سنہ 2000 میں ایک چھوٹے سے قصبہ سہسپور سے ہفتہ روزہ ''آئینہ حالات'' شروع کیا۔

اقبال احمد صدیقی المعروف اقبال راجہ اردو کے فروغ کے لئے ہمہ وقت سرگرم عمل رہے اور اردو سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ دسمبر 2006 میں سیوہارہ کے مسلم قدرت اللہ انٹر کالج میں ''فروغ اردو کانفرنس'' میں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اقبال راجہ کے جذبے، جوش اور فکر کا اندازہ کانفرنس میں ان کی تقریر کے ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے جو مجھے آج تک یاد ہے۔ ''صرف یہ راگ الاپتے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا کہ اردو گنگا جمنی زبان ہے، اردو قومی یکجہتی کی علامت ہے، اردو چکبست کی زبان ہے، اردو پریم چند اور فراق کی زبان ہے، اردو پورے ملک کی زبان ہے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ سچ تھا، ہے نہیں، اردو کو اس کا جائز حق دلانے کے لئے ہمیں حکمرانوں کے حلق میں ہاتھ ڈالنا ہوگا۔ اردو کو ہمیں سڑک کی زبان بنانا ہوگا۔ اردو کو ہمارے برادرانِ وطن نے جب مسلمانوں سے جوڑ ہی دیا ہے تو اس کی تمام ترقی اور بقاء کی ذمہ داریاں صرف اور صرف مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ زبان ہماری روایات کی امین ہے۔ ہمارا تمام دینی اثاثہ اردو میں محفوظ ہے۔ اردو ہماری تہذیب ہے، تمدّن ہے، ہمارا کلچر ہے اور ہم اپنے کلچر کو بچانے کے لئے ہر طرح کی قربانیاں دینے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔''

''آئینہ حالات'' کے تمام شمارے اقبال راجہ کی حب الوطنی، اردو دوستی اور صالح معاشرہ کے قیام کے لئے کی گئی جدوجہد کے نمونے ہیں۔ آئینہ حالات کے فلمی کالم بھی عریانیت سے پاک اور فلمی اداکاروں کے وہ دلچسپ قصے جو عام لوگوں کی سماعت سے دور ہوتے تھے شائع ہوئے۔ تعلیم کے فروغ کے لئے مستقل مضامین کو آئینہ حالات میں جگہ ملتی تو خواتین واطفال کالم

میں اقبال راجہ آدھی آبادی کے مسائل اور ان کا حل تلاش کر قارئین کی نظر کرتے۔ آئینہ حالات میں اردو شعر و ادب کی تقریباً تمام اصناف کو ہر شمارہ کے کئی صفحات ملتے تھے۔ اقبال راجہ نے سیاست کی برائیوں اور ان کی اصلاح پر کئی مضامین اور اداریہ شائع کئے۔ بین القوامی مسائل پر بھی ان کی نظر رہتی تھی۔ حماس، فلسطین، افغانستان، بیت المقدس، عراق اور امریکہ سے متعلق اکثر مضامین آئینہ حالات کے صفحہ اول اور اداریہ کی زینت بنے۔

اقبال راجہ اور آئینہ حالات کے حالات اور جائزہ پیش کرنے کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ کئی کتابیں مرتب کی جاسکتی ہیں۔ تمام قارئین سے درخواست کرتا ہوں کہ ضلع بجنور میں آئینہ حالات کے بعد کوئی اردو اخبار شائع نہیں ہوا اور نہ ہی ہو رہا ہے اس لئے اردو دوستی کے لئے اپنی تہذیب اور زبان کی بقاء کے لئے ضلع بجنور سے اردو کا اخبار شروع کیا جائے اور یہ ہی مولانا مجید حسن سے لے کر نشتر خانقاہی، اقبال راجہ کو سچا خراج عقیدت ہوگا۔

مدیر، میڈیا پوسٹ
چھنگا والا چوک، نگینہ
9412326875

عناوین

''دبستانِ بجنور'' جلد اوّل

❖❖❖

اظہارِ تشکر

تمام تعریفیں اور بڑائیاں اللہ کے لیے ہیں۔ اللہ توفیق نہ دے تو اس کائنات میں کچھ بھی ممکن نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کی توفیق سے ''دبستانِ بجنور'' کی دوسری جلد بھی آپ کے ہاتھوں میں ہے وجہ تخلیق کائنات، سرورِ دوعالم حضرت محمد ﷺ پر سنکھو (گنتی کا آخری شمار) درودوسلام پیش کرتے ہوئے اس کتاب کو ''دبستانِ بجنور'' کا عنوان دینے والے محمد عرفان رومانی (جن کا جولائی 2016 کو انتقال ہوگیا) کی مغفرت کی دعا کرتا ہوں اور پروفیسر خالد علوی صاحب، ڈاکٹر سید احمد خاں صاحب، ڈاکٹر اسد رضا صاحب، نظام ہاتف صاحب، ڈاکٹر شبانہ نذیر صاحبہ، سالک دھامپوری صاحب، پروفیسر سیما جاوید صاحبہ، رعنا پروین نور صاحبہ، ڈاکٹر نصرت مہدی صاحبہ، شاداں پرویز صاحبہ، معین شاداب صاحب، جاوید دانش صاحب، ڈاکٹر وسیم اقبال صاحب، عالیہ بنت عرفان صاحبہ، ڈاکٹر سیدہ بطین صاحبہ، ڈاکٹر آفتاب نعمانی صاحب، ریاض حنفی صاحب، ڈاکٹر ایم اسلم صدیقی صاحب، ڈاکٹر محمد احسن صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے قلمی تعاون کی بنا پر یہ دوسری جلد مکمل ہوئی۔ شکریہ ادا کرتا ہوں جناب جلیس نجیب آبادی صاحب، ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، ڈاکٹر قاسم انصاری صاحب، ڈاکٹر ابوشہیم خان اور ڈاکٹر عابد حسین حیدی صاحب کا بھی جنھوں نے اپنی قیمتی آرا سے نوازہ۔ شکر گذار ہوں محمد نوشاد قاسمی تاراپوری کا بھی جنھوں نے اس کتاب کی کمپیوزنگ میں تعاون کیا۔ بے حد مشکور ہوں ارشد ندیم کرتپوری صاحب کا جو اپنی مصروف ترین زندگی کے قیمتی لمحات صرف کر کے بذریعہ سیل فون میرے قلم کو توانائی عطا کرتے ہیں اور حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بعد اس کائنات میں میرے لیے سب سے قابلِ احترام میری والدہ محترمہ نسیمہ خاتون صاحبہ کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی دعائیں مجھے مسلسل ترقی کی راہ پر گامزن رہنے میں معاون رہتی ہیں۔ بہت شکر گزار ہوں اپنے ان مخلص دوستوں واحباب کا جو میری حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں اور آپ کا بھی کہ آپ نے اردو سے محبت اور ادب نوازی کی وجہ سے اس کتاب کا مطالعہ فرمایا۔

طالب دعاء

شیخ نگینوی

دبستانِ بجنور کے قلم کار

خالد علوی | سید احمد خان | اسد رضا | جلیس نجیب آبادی | نظام ہاتف | سالک دھامپوری

احمد علی برقی | معین شاداب | عابد حیدری | دانش جاوید | شبانہ نذیر | سیما پرویز

شادان پرویز | نصرت مہدی | رعنا پروین | عالیہ | علینا عترت | سیدہ سبطین

وسیم اقبال | محمد احسن | آفتاب نعمانی | ریاض حنفی | ایم اسلم | شیخ نگینوی

Dabistan-e-Bijnor (ii)

Compiled By : Dr. Shaikh Naginvi

BOOK CORPORATION

81-88912-66-2